اے محبت تیری خاطر
نازیہ کنول نازی

ہجر میں تیرے جو میں نے گزاری ہیں
ان راتوں کا حساب کون دے گا
بانجھ منظروں میں قید تتلیوں کو
رہائی کے گلاب کون دے گا

عزیز دوستو!

آداب وتسلیمات!

میں ان تمام بہنوں کے خلوص اور بے لوث محبت کی تہ دل سے شکر گزار ہوں جو کہ میری ہر تحریر کو دل سے پسند کرتی ہیں اور اپنی نازی کو گھر کے فرد کی طرح اپنی دعاؤں میں یاد رکھتی ہیں۔ اس کے بعد ''اے محبت تیری خاطر'' کے عنوان سے قلمبند کی گئی میری یہ تحریر معاشرے کی ان تمام بہنوں کے لیے تحفے کے طور پر آپ کے سپرد کی جا رہی ہے جو سنہرے خوابوں اور ریشمی جملوں کے سحر میں جکڑ کر اپنے ہاتھوں اپنی خوبصورت زندگی کو عذاب بنا رہی ہیں۔

موجودہ وقت میں انٹرنیٹ اور فحش کتابیں تو پہلے ہی مسلمان نسل کی تباہی کا باعث بن رہی تھیں اب موبائل فون نے منحوس انگریز کی سازشوں کو سو فیصد کامیاب کرتے ہوئے ہمارے اسلامی معاشرے کا چہرہ ہی مسخ کر کے رکھ دیا ہے۔ میں اس موضوع پر پہلے بھی قلم اٹھا چکی ہوں مگر یہ تحریر بہت زیادہ محنت کے بعد صرف اس لیے آپ تک پہنچا رہی ہوں کہ

دوبارہ یہ موضوع پھر کبھی قلمبند نہ کرنا پڑے۔ اس سلسلے میں ان تمام بہنوں کی بے حد مشکور ہوں جنہوں نے نہ صرف بصد اصرار مجھ سے یہ تحریر لکھوائی بلکہ اس کو لفظ بہ لفظ حقیقی شکل میں پیش کرنے کے لیے اپنے اپنے ذاتی تجربات بھی فراہم کیئے۔

اپنی اس تحریر کے ذریعے میں جی بھر کر ان والدین کی مذمت کرنا چاہوں گی جو اپنی جوان اولاد کو غلط راستے پر چلتا دیکھ کر بھی کسی قسم کی روک ٹوک سے کام نہیں لے رہے۔ بعض والدین کو تو بچوں کی حرام موت تک ان کی بربادی کا پتہ نہیں چلتا۔ موجودہ دوقت میں اولاد کی مصروفیات سے اس درجہ بے خبری پر کیا اللہ کے حضور آپ سے کوئی سوال نہیں ہوگا؟ سہیلی کے گھر کا بہانہ کر کے اکیلے گھر سے نکلنے والی بیٹی کا ہر قدم آپ کے لیے سوال ہوگا۔

موجودہ حالات میں اپنے وطن کے اندر ہر علاقے میں واضح دکھائی دینے والی بے راہ روی دیکھ کر یہ بات جھٹلائی نہیں جاسکتی کہ اسلام سے پہلے کے حالات دوبارہ امت محمدیؐ کا نصیب بن گئے ہیں۔ وقتی اور لمحاتی لذت کے لیے دائمی جہنم میں ٹھکانہ بناتے نوجوان لڑکے اور لڑکیوں کا حال دیکھ کر یہ بات بخوبی سمجھ میں آتی ہے کہ پیارے نبیؐ ہمہ وقت اپنی امت کی آخری نسل کے لیے زار و قطار کیوں روتے رہتے تھے۔

مجھے بے حد افسوس ہے کہ موبائل فون کے ہاتھوں تباہ ہونے والی بہت سی بہنیں ڈائجسٹ پڑھنے کا شوق نہیں رکھتیں پھر بھی میری اس تحریر کو پڑھ کر اگر کوئی بہن عقل کے ناخن لیتے ہوئے اپنی عزت اور وقار بچا گئی تو میں سمجھوں گی کہ میں نے اس تحریر کو قلمبند کرنے کا حق ادا کر دیا۔

اللہ رب العزت ان تمام بہنوں پر اپنا رحم اور کرم فرماتے ہوئے انہیں عقل و ہدایت نصیب فرمائے' جو ذاتی ٹھوکر لگنے تک سنبھلنا نہیں چاہتیں۔ صرف ایک بار خود کو ذلت کی زندگی سے بچانے کے لیے اپنا دل مضبوط کر کے اللہ سے مدد کی دعا کیجیے۔ انشاء اللہ وہ پاک ذات ہے جو نا صرف آپ کے محبوب کا اصل چہرہ آپ پر عیاں کر دے گی۔ بلکہ آپ کو صبر بھی عطا کرے گی۔ اپنی نازی کو اپنی دعاؤں میں محبتوں میں ہمیشہ یاد رکھیے گا۔ شکریہ۔

اس کتاب کی بہترین اشاعت کے لیے میں ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی مشکور ہوں۔

نازیہ کنول نازی آپ کی دعاؤں اور محبتوں کی ہمیشہ مقروض رہے گی۔

دعاؤں کی طلب گار
نازیہ کنول نازی

محبت طاق دل پر جلتا ہوا
وہ چراغ آخری شب ہے
کہ جس کی لو اگر مدہم بھی ہو جائے
تو اندر کا اجالا کم نہیں ہوتا

موسم اچانک خراب ہو گیا، آسمان پر گدلے بادلوں کی گڑگڑاہٹ کے ساتھ ہی تیز آندھی نے ہر چیز کو اپنی لپیٹ میں لے کر اچھے خاصے طوفان کو دعوت دے ڈالی۔ وہ آنچل ڈائجسٹ ہاتھ میں لیے ارد گرد سے بے نیاز بیٹھی تھی۔ اب اچانک موسم کے بگڑتے تیور دیکھ کر جلدی سے ڈائجسٹ چارپائی پر پھینکا اور اماں کے صلوٰتیں سنانے سے قبل ہی بھاگ کر سیڑھیاں پھلانگتی چھت پر پہنچ گئی۔ جہاں دن بھر کی کڑی محنت کے بعد تار پر دھلے ہوئے کپڑے شان بے نیازی سے اڑ اڑ کر ساتھ والوں کی چھت پر پہنچ رہے تھے۔

''یا اللہ اس آندھی کو بھی ابھی آنا تھا۔''

وہ چونکہ اپنی فیورٹ کہانی کے کلائمکس پر پہنچی ہوئی تھی۔ لہٰذا موسم کے اچانک خراب ہونے پر بارش سے گلہ کیے بغیر نہیں رہ سکی۔

عین اسی لمحے اسے نیچے سے اماں کی آواز سنائی دی۔

''سبی کہاں مرگئی جا کر، ان چوزوں کو ڈربے میں بند کر دے، ورنہ کہیں نکل جائیں گے آندھی میں۔''

''آئی اماں۔'' ان کی پاٹ دار آواز کے جواب میں حلق پھاڑ کر چلاتے ہوئے اس نے مزید تیزی سے کپڑے سمیٹنے شروع کر دیے۔

''لعنت ہو ایسی زندگی پر، جس میں دو گھڑی کا سکون بھی نصیب نہیں اور ایک یہ فلموں، کہانیوں کی لڑکیاں ہوتی ہیں جنہیں سوائے عشق کے دوسرا کوئی کام نہیں۔ آہ...... پتہ نہیں حقیقت ہی ہمیشہ تلخ کیوں ہوتی ہے؟'' گہری سانس بھر کر تاسف سے کہتی جوں ہی واپسی کے لیے مڑی اپنے ماموں زاد سنان کو برابر والی چھت پر کھڑی لڑکی سے عشق بگھارتے دیکھ کر ٹھٹک گئی۔ سنان بھی اسے دیکھ کر مسکراتے ہوئے پلٹ آیا۔ سبین کا پرپل دوپٹہ اس کی خوبصورت گردن کے گرد لپٹا تھا۔ تبھی وہ بولی۔

''تم یہاں کیا کر رہے ہو......؟''

''اپنی حسرتوں کی ماری معصوم محبوبہ کا دیدار۔''اس نے جس قدر تپ کر پوچھا تھا۔ سنان کا جواب اتنا ہی نرم تھا پھر بھی وہ سلگ اٹھی۔

''بکواس بند کرو اور دوپٹہ دو میرا۔''

''نہیں دیتا، کرلو جو کرنا ہے۔''وہ مسلسل مسکرا کر اس کا دل جلا رہا تھا۔ تبھی وہ بولی۔

''مردو تم، خبردار جواب کبھی میرے منہ لگے تو۔''خفگی سے کہتی وہ فوراً سیڑھیاں اتر گئی تو سنان کھکھلا اٹھا۔

وہ سیڑھیوں سے نیچے آئی تو صحن میں ادھر اُدھر اپنی جان بچانے کو بھاگتے چوزے اسے مزید تپا گئے۔ کپڑے برآمدے میں رکھی چارپائی پر پھینک کر وہ انہیں پکڑنے میں مصروف ہوگئی جو کسی صورت ہاتھ آتے دکھائی نہیں دے رہے تھے جب کہ اماں اس وقت حسبِ معمول سبزی کاٹنے میں مصروف تھیں۔

''کمبخت، منحوس مارے نرا عذاب ہیں میرے لیے، مجال ہے جو میری ماں کوئی ایک چیز بھی ڈھنگ کی رکھ لے اس گھر میں۔''

''آئے ہائے، کیوں معصوم جانوں پر نیت ڈالتی ہے کمبخت! پہلے ہی بلی دو معصوموں کو ہڑپ کر چکی ہے۔''اماں کے تو جیسے کلیجے پر ہاتھ پڑا تھا۔ سبین خفگی سے انہیں گھور کر رہ گئی۔ اگلے کچھ ہی لمحوں میں بارش کی ننھی ننھی بوندیں آندھی کا زور ختم کرکے زمین کی پیاس بجھانے لگیں۔

''شکر اللہ کی پاک ذات کا گرمی کا زور تو ٹوٹا۔''

چارپائیاں اندر برآمدے میں منتقل کرتے ہوئے اس نے اپنی نادر رائے کا اظہار کیا۔ اماں سبزی سائیڈ پر رکھتے ہوئے ایک نظر بارش کی برستی بوندوں پر ڈالتے ہوئے بولیں۔

''ہاں گرمی کا زور تو ٹوٹ گیا، اس موئی مہنگائی کا زور نجانے کب ٹوٹے گا۔ خدا کی مار پڑے ان غاصب حکمرانوں پر، غریب عوام کا جینا دوبھر کرکے رکھ دیا ہے ان ظالموں نے۔''

صبح سے لائٹ آف تھی لہٰذا انہیں حکمرانوں کے خلاف دل کا غبار نکالنے کا موقع مل گیا۔ سبین کے پاؤں پر چارپائی کا پایا لگا تو وہ پاؤں کو ہاتھ میں دباتے ہوئے خفگی سے بولی۔

''عوام بے چارے نہیں ہیں اماں، یہ سارا کیا دھرا عوام کا ہی ہے۔ خود ہی ووٹ دے کر نااہل لوگوں کو اپنا حکمران بناتے ہیں اور پھر چپ چاپ ان کی ہر زیادتی و ظلم سہہ کر انہیں مزید غاصب ہونے کی ترغیب بھی دی جاتی ہے۔ کسی کو شعور نہیں، کسی میں کچھ کرنے کی ہمت نہیں، کسی کا کیا قصور۔ گونگی بہری قوموں کا انجام تو ایسا ہی ہوا کرتا ہے۔''

وطن کے معاملے میں اس کی سوچ بڑی جذباتی سی تھی۔ ہر محبِ وطن پاکستانی کی طرح اس کا دل بھی ہر لمحہ اپنے ملک کی بدحالی پر کڑھتا رہتا تھا۔

اماں ابھی کچھ کہنے ہی لگی تھیں کہ سنان بارش میں بھیگتے ہوئے سبین کا دوپٹہ ہاتھ میں لیے چلا آیا۔

''کیا بات ہے پھوپو، حکومت کی چغلیاں کس خوشی میں ہو رہی ہیں۔''وہ ان کے پاس ہی چارپائی پر جگہ بنا کر ٹک گیا۔

''چغلیاں کیسی بیٹے ان موئے حکمرانوں نے تو سارے ملک کا ستیاناس کرکے رکھ دیا ہے۔ کیسی کیسی قربانیاں نہیں دیں ہم نے اس وطن کے لیے۔ ظالموں نے اب اپنے ہی ملک میں سکون کی سانس لینا محال کر دیا۔''وہ حکمرانوں سے خوب نالاں دکھائی دے رہی تھیں۔ سنان بے ساختہ کھکھلا اٹھا۔

''کوئی بات نہیں پھوپو انشاء اللہ کبھی اچھے دن بھی آئیں گے۔''

''جی ہاں، پچھلے ساٹھ برسوں میں تو اب تک آئے نہیں آگے پتہ نہیں کب آئیں گے؟''سبین نے پھر اپنا غبار نکالا تو وہ اسے دیکھتا ہی رہ گیا۔

''ملکی حالات اب سدھرنے والے نہیں تم کیوں خواہ مخواہ خون جلاتی ہو۔''کچی گاجر اٹھا کر دانتوں سے کترتے ہوئے اس نے اس کی طرف دیکھا۔ جواب میں وہ تڑخ کر رخ پھیرتے ہوئے بولی۔

''کیوں کہ میں ابھی مکمل طور پر بے حس نہیں ہوئی ہوں۔''یہ کہنے کے ساتھ ہی وہ دوبارہ کچن میں گھس گئی تو وہ سر جھٹک کر مسکرا دیا۔

''اب اس کی شادی کردیں پھوپو۔ بات بات پر ٹیمپر لوز کر دیتی ہے کل کو کہیں گلے ہی نہ پڑ جائے۔''کن انکھیوں سے کچن کی طرف دیکھتے ہوئے وہ پھر بولا تو اماں اسٹارٹ ہوتے ہوئے بولیں۔

''میں تو کہتی ہوں بیٹے جتنی جلدی اس کا فرض ادا ہو جائے اتنا اچھا ہے مگر آج کل اچھے رشتے کہاں ملتے ہیں۔ لڑکوں کی تو قلت ہی ہوگئی ہے۔ ذرا جو کوئی اچھا مل جائے تو یہ لمبی لمبی فرمائشیں تیار ہوتی ہیں۔ پتہ نہیں کیسے فریضہ ادا کر پاؤں گی اس کا۔ اپنے پھوپا کو تو تم جانتے ہی ہو، جتنا کماتے ہیں اس سے دوگنا فضول کاموں میں اڑا دیتے ہیں۔ سچ پوچھو تو اب اللہ کا ہی آسرا ہے۔''

''کوئی بات نہیں پھوپو اللہ سب بہتر کرے گا۔ آپ ٹینشن نہ لیا کریں۔''اپنائیت سے ان کے ہاتھ تھام کر کہتا وہ کچن کی طرف چلا آیا۔ جہاں وہ اب رات کے کھانے کی تیاری کر رہی تھی۔

''سبی، تمہاری ''یوفون'' کی سم لے آیا ہوں، فری ہو کر لے لینا مجھ سے۔''

''اوریئلی، تھینک یو سو مچ۔''اس کی تازہ اطلاع پر وہ چولھا جلاتے ہوئے مسرت سے

پلٹی۔ جواب میں وہ ایک محبت بھری نگاہ اس پر ڈالتے ہوئے مسکرا کر واپس پلٹ گیا۔
وہ اسے کبھی بتا نہیں سکا کہ اس کی خوشی اور خوبصورت آنکھوں کی جگمگاہٹ اس کے لیے کتنی اہمیت رکھتی تھی۔

اگلی صبح سبین کالج گئی تو اس کے پاس بھی اپنی دوستوں کی طرح، ذاتی سیل فون تھا۔ جسے اس نے اماں سے چوری، دوستوں سے سبق پوچھنے اور حال احوال کی خبر لینے دینے کا بہانہ کر کے، سنان سے بہت زیادہ اصرار کرنے کے بعد حاصل کیا تھا۔ اصل میں یہ فتور اس کے دماغ میں اس کی دوستوں نے ہی رنگ برنگی باتیں کر کے ڈالا تھا کہ اس کے پاس اپنا ایک ذاتی سیل فون ضرور ہونا چاہیے تا کہ وہ جب چاہے اپنی دوستوں سے رابطہ میں رہے اور کال نہ کر سکے تو میسج سے ہی سستے میں کام چلا لے۔ پہلے پہل وہ اپنی دوستوں کو ضرورت نہیں ہے کہہ کر ٹالتی رہی مگر وقت کے ساتھ ساتھ، جیسے جیسے وہ موبائل فون سے جنم لینے والی کہانیوں سے آشنا ہوئی اس کا دل بھی سیل فون کے لیے چاہنے لگا اور بالآخر وہ سنان کا استعمال شدہ موبائل اس سے حاصل کر کے رہی۔

اب اپنی دوستوں میں اس کی ٹور بھی دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ سنان نے اپنا نیو موبائل خریدنے کے ساتھ ہی اسے علیحدہ سے سم لا دی اور موبائل فون کا استعمال بھی سکھا دیا۔ گھر پر وہ ہر لمحہ اپنا موبائل سائیلنٹ پر رکھتی تا کہ اماں کو پتہ نہ چلے۔ کالج میں بریک ٹائم کے وقت وہ اسے فری کر دیتی اور دوستوں میں بھانت بھانت کے گیت tones اور میسج شیئر کر کے خوب لطف اٹھاتی۔

☆......☆......☆

اس کا تعلق متوسط طبقے سے تھا۔

والدین کی اکلوتی بیٹی ہونے کی حیثیت سے زندگی بے حد خوبصورت گزر رہی تھی۔ والد احمد حسن صاحب مشہور بیوپاری تھے اور نفع ونقصان کے پلڑے میں جھولتے رہتے تھے۔ جس سے سلمیٰ بیگم خاصی نالاں رہتی تھیں۔

سنان کا تعلق گاؤں کے زمیندار گھرانے سے تھا۔ اعلا تعلیم کی خواہش کے ساتھ ساتھ اپنی سگی پھوپوزاد کزن سبین احمد کی محبت اسے گاؤں سے شہر گھسیٹ لائی تھی۔ حال ہی میں ایم بی اے سے فارغ ہونے کے بعد وہ اب مزید تعلیم کے لیے ملک سے باہر جانے کا سوچ رہا تھا مگر وسائل اجازت نہیں دے رہے تھے۔ گاؤں جا کر اپنے بڑے بھائی کے ساتھ کھیتی باڑی میں ہاتھ بٹانے پر اس کی طبیعت مائل نہیں ہوتی تھی۔ لہٰذا آج کل وہ ایک لوکل اخبار کی رپورٹنگ کر رہا تھا۔ سبین اور اس میں جہاں انڈر اسٹینڈنگ تھی وہیں ہمہ وقت جھگڑا بھی چلتا رہتا تھا۔ دونوں ہی ایک دوسرے سے بدلہ لینے میں ماہر تھے۔ سنان نے سبین پر کبھی بھی اپنے دلی جذبات عیاں نہیں کیے تھے۔ اس کی یہی سوچ تھی کہ ہر کام کے لیے ایک وقت مقرر ہوتا ہے۔ لہٰذا انسان کو چاہیے کہ وہ اس مقررہ وقت کا انتظار کرے۔ دوسرے وہ سلمیٰ بیگم کو بے حد عزیز تھا۔ لہٰذا اسے گمان ہی نہیں پختہ یقین بھی تھا کہ وہ اس کے سوا اور کسی کی زندگی کا حصہ نہیں بن سکتی۔ تبھی روز اسے جلانے کو اپنے کسی نہ کسی موبائل فون پر گرل فرینڈز کا تذکرہ چھیڑ کر بیٹھ جاتا اور سبین اس کے لیے دل میں کوئی خاص جذبات نہ رکھنے کے باوجود اس کی حرکتوں پر جل کر رہ جاتی۔

☆......☆......☆

میں اک اجنبی مسافر ہوں
مسافر کی طرح اک دن یہ بستی چھوڑ جاؤں گا
گھنی خاموش راتوں میں
تعلق توڑ جاؤں گا
بکھیرنا ہے مجھے گر تو طوفان کی مانند
محبت کا جو دریا ہے
اسے میں موڑ جاؤں گا
مگر میں سوچتا یہ ہوں
تعلق توڑ بھی جاؤں، یہ بستی چھوڑ بھی جاؤں
''تجھے کیا بھول پاؤں گا۔''

وہ بڑے انہماک سے شاعری کی بک میں غرق تھا جب اچانک فہد دروازہ کھول کر کمرے میں گھس آیا۔

''شادی، شادی، شادی، خدا کی پناہ، آج کل کوئی لڑکی شادی کے جھانسے کے بغیر پھنسنے کو تیار ہی نہیں ہوتی۔'' دھڑ سے بیڈ پر اس کے پہلو میں گرتے ہوئے اس نے اپنے اندر کا غبار نکالا۔ جواب میں کتاب سے نگاہیں ہٹاتے ہوئے رومان باری کے لبوں پر دھیمی سی مسکان بکھر گئی۔

''کیا ہوا، پھر سے کسی لڑکی سے چکر چل گیا کیا؟''

''نہیں یار، ابھی جن سے چل رہا ہے وہی کافی ہیں پھر کسی نئی چوٹی کو سر کریں گے۔''

ریموٹ اٹھا کر ٹی وی آن کرتے ہوئے وہ قدرے بے نیازی سے بولا۔

رومان نے پوچھا۔ ''شادی کے تقاضے کس نے شروع کر دیے؟''

''ہے ایک پاگل، مڈل کلاس گھرانے کی ہے، ذرا سے التفات پر ہاتھ دھو کر پیچھے پڑ گئی میرے۔ قسم سے زہر لگتی ہیں لڑکیاں مجھے فرمائشیں کرتے ہوئے۔''

''کون سی فرمائش؟'' رومان اس کی حالت سے لطف لے رہا تھا۔

''یہی کہ تم اپنے گھر والوں کو کب بھیجو گے۔ بندہ اب پچاس لڑکیوں سے دل بہلائے تو کیا پچاس شادیاں بھی کرے؟''

وہ قدرے اکتایا ہوا لگ رہا تھا۔ رومان اس کے الفاظ پر بے ساختہ ہنس پڑا۔

''پھر......اب کیا ارادے ہیں تمہارے......؟''

''کچھ خاص نہیں، ابو بزنس کے سلسلے میں دو ماہ کے لیے آسٹریلیا بھیج رہے ہیں، واپس آؤں گا تو نئی گرل فرینڈز ہوں گی اور نئی مصروفیات۔'' وہ بے فکری سے مسکرایا۔

''رومی......یار ایک لڑکی ہے سبین۔ سدرہ کی بڑی کلوز فرینڈ ہے۔ کیا غضب کی لڑکی ہے۔ چہرے پر ایسی کشش اور سادگی ہے کہ بندہ دیکھے تو مدہوش ہو جائے۔ میں نے سدرہ کو چکر دے کر اس کا نمبر تو حاصل کر لیا مگر دام میں نہیں آ رہی کمینی۔'' اس نے اگلے چند ہی لمحوں میں رومان کو اپنی تازہ بپتا سنائی تو وہ مسکرا دیا۔

''اچھا......کیا نمبر ہے میڈم ہوشیار کا......؟'' دوسرے ہی پل اس نے پوچھا تو فہد نے اسے سبین کا نمبر نوٹ کروا دیا۔

''چلو، اب دیکھتے ہیں کیسے دام میں نہیں آتی میڈم۔''

نمبر اپنے موبائل فون میں Save کرنے کے بعد اس نے اپنے مخصوص دھیمے لہجے میں کہا تو فہد کھلکھلا کر ہنس پڑا۔

''تو بڑی چیز ہے یار، اس بات کا اعتراف میں کرتا ہوں۔''

☆......☆......☆

رومان باری کا تعلق خاصے امیر گھرانے سے تھا۔

وہ چار بھائی اور تین بہنیں تھیں۔ سب سے بڑی بہن کی شادی ہو چکی تھی۔ باقی ابھی زیر تعلیم تھیں۔ ایک بھائی اس سے بڑا تھا جب کہ باقی دو چھوٹے تھے۔ اس کے والد اور دادا ذرا سخت مزاج کے نیک طبیعت انسان تھے۔ والدہ کی طبیعت میں بھی سختی تھی مگر اس کے باوجود بچپن سے ہی اس کا مزاج عیاشی کی طرف مائل تھا۔ قدرت جب کسی کو جائز، ناجائز کرنے کا اختیار سونپتی ہے تو اسے پوری ڈھیل دیتی ہے۔ رومان باری کا شمار بھی ایسے ہی لوگوں میں کیا جا سکتا تھا۔ اس پر کوئی بھی نیک نصیحت یا بات اثر نہیں کرتی تھی۔

بظاہر شریف والدین کا نیک اور فرماں بردار بیٹا دکھائی دیتا لیکن اندر سے آوارگی اور والدین کی عزت کی مٹی پلید کرنا اس نے اپنا سب سے محبوب مشغلہ بنا رکھا تھا۔ طرح دار سے طرح دار لڑکی کو قابو کرنے کے اسے ایک سو ایک طریقے آتے تھے۔ خوبصورت آواز کا مالک نہ ہونے کے باوجود لڑکیوں کو اپنے دام الفت میں یوں جکڑتا کہ وہ چاہ کر بھی فرار حاصل نہ کر پاتی تھیں۔ کالج کے زمانے میں کتنی ہی لڑکیوں کو اس نے اپنی رفاقت کے سنہری خواب

دکھائے۔ بعدازاں کوئی جان سے گزر گئی تو کسی کو اپنی مکار محبت کا واسطہ دے کر کسی اور کی طرف مائل کر دیا۔

لڑکیوں کو بے وقوف بنا کر اپنے دام میں پھنسائے رکھنے کے لیے اگر اسے خدا رسولؐ اور قرآن کی جھوٹی قسمیں بھی کھانا پڑتیں تو وہ ذرا نہ ہچکچاتا۔ حقیقت میں جن کے ضمیر اور دل مردہ ہو جاتے ہیں انہیں پھر کسی بھی غلط سے غلط عمل کے کر گزرنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

والدہ کی کڑی نگرانی اور انتہا درجے کی سختی کے باوجود اسے اگر ایک نمبر کا لوفر اور فلرٹی کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ گھر میں بہنوں کے ہوتے ہوئے بھی دوسروں کی عزت سے کھیلنا اس کے لیے زندگی کا سب سے پرلطف کھیل تھا۔

اسکول کالج کے زمانے میں وہ گھنٹوں شدید گرمی کے باوجود لڑکیوں کے پیچھے پھرتا۔ بعدازاں موبائل فون کے عام ہونے کے بعد اس مشقت سے اس کی جان چھوٹ گئی۔ اب وہ پہلے دوستوں کی مدد سے لڑکیوں کو اپنی جھوٹی چاہت کے سحر میں اتارتا پھر ان سے ملنے ملانے کا مرحلہ طے کرتا۔ جتنی لڑکیاں بھی اس سے رابطہ میں تھیں، سب کو یہی خوش فہمی تھی کہ وہ صرف ان کا ''محبوب'' ہے۔ اس کے تمام جذبات، الفاظ اور خواب انہی کے لیے ہیں مگر حقیقت میں ایسا کچھ بھی نہیں تھا۔ خاص سے خاص لڑکی، خواہ وہ اس کے لیے کتنی ہی اچھی کیوں نہ ثابت ہوا س کے نزدیک ایک خوبصورت ''کھلونے'' سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی تھی۔ بہت سی سابقہ جاں نثار محبوباؤں کا تو نام بھی اسے یاد نہیں تھا۔ ہر لڑکی کے لیے وہ الگ اور نیو Sim استعمال کرتا تھا تا کہ دوسری طرف والی محبوبہ اس کی تازہ سرگرمیوں سے بے خبر رہے اور وہ پکڑا نہ جائے۔

اس میدان میں رنگ رنگ کی تتلیوں کے نقش مٹھی میں جذب کرنے کے لیے اس نے ایسے ایسے فعل سرانجام دیے تھے کہ اب وہ پکا کھلاڑی بن گیا تھا۔ عورت ذات کی نفسیات کے تفصیلی مطالعے کے بعد تو اسے اپنے کھیل میں اور بھی آسانیاں پیدا ہو گئی تھیں۔ اس نے کبھی ایک لمحے کے لیے بھی ان لڑکیوں کے بارے میں کچھ بھی سوچنے کی زحمت گوارا نہیں کی جنہیں سنہرے خواب دکھا کر ان کے دلکش رنگ اپنی مٹھی میں جذب کرنے کے بعد وہ مرجھائے ہوئے پھول کی مانند پرے پھینک دیتا تھا۔

☆......☆......☆

سبین احمد حسن جو بظاہر بے حد جذباتی اور جھگڑالو ٹائپ لڑکی تھی اندر سے دوسری عام لڑکیوں کی طرح بے حد کمزور اور موم کی گڑیا ثابت ہوئی۔ رومان باری نے اس بار اسے اپنا ٹارگٹ بنایا اور اپنی روایت کے عین مطابق ابتدا میں پورے ایک ہفتے تک دل گداز میسج بھیجتا رہا۔

سبین ایک بالکل انجان نمبر سے لگاتار میسج آتے دیکھ کر پریشان ہوئے بغیر نہیں رہ سکی مگر

سنان سے اس لیے کچھ بھی نہیں کہہ سکتی تھی کہ کہیں اس بات کی وجہ سے وہ اپنا سیل اس سے واپس ہی نہ لے لے۔ اپنی دوستوں کو بھی فی الحال اس نے اس بات سے بے خبر رکھنے کی کوشش کی تھی۔ جہاں تک ممکن ہو سکا وہ اجنبی نمبر سے مستقل آتے میسج کو بھی نظرانداز کرتی رہی مگر کب تک۔ میسج اتنے خوبصورت اور دل گداز تھے کہ ان کے ذریعے بھیجنے والے کے ذوق اور اس کی شخصی خوبصورتی کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا تھا۔

پورے ایک ہفتے تک دامن بچانے کی کڑی کوشش کے باوجود اپنی فطری کمزوری کے ہاتھوں بے بس ہو کر بالآخر دسویں روز وہ اس اجنبی شخصیت کو میسج ری پلے کرنے پر مجبور ہوگئی اور یہیں سے رومان باری کی فتح کا پہلا آغاز ہوا۔

اس روز سنڈے تھا۔

سنان صبح ناشتے کے بعد اپنی بائیک لے کر کسی کام سے گھر سے نکل گیا۔ جبکہ سلمٰی بیگم ابھی تھوڑی دیر قبل محلے میں کسی سے ملنے گئی تھیں۔ حفیظ تو زیادہ تر رات میں بھی گھر سے باہر ہی رہتے تھے۔ وہ صبح کے ضروری کام نبٹا کر اپنی کورس کی کتابوں سے دماغ کھپا رہی تھی۔ جب اچانک گریبان میں احتیاط سے رکھے موبائل فون کی وائبریشن نے اسے چونکا دیا۔ جلدی سے سیل نکال کر دیکھا تو اسی اجنبی نمبر سے کال آرہی تھی جس نے پچھلے ایک ہفتے سے اسے ایس ایم ایس کے ذریعے خاصا ڈسٹرب کر رکھا تھا۔ تب دھڑکتے دل کے ساتھ بمشکل خود پر قابو رکھ کر اس نے ''yes'' کا بٹن پریس کیا۔

''ہیلو۔'' بے حد کمزور آواز حلق سے برآمد ہونے کے باوجود دوسری طرف خاموشی رہی تھی۔ وہ اب اس کھیل میں نہ چاہتے ہوئے بھی اچھی خاصی بے قرار ہوگئی تھی۔ کئی بار اس نے کال ڈس کنکٹ کی اور کئی بار دوسری طرف سے ڈھٹائی سے پھر رابطہ کیا گیا مگر اس کی ہیلو، ہیلو کے جواب میں گہری خاموشی نے ہی اس کا منہ چڑایا۔ وہ اب سنجیدگی سے سنان کو اس نمبر سے مطلع کرنے کا سوچ رہی تھی کہ پھر اس کی کال آگئی اور اس بار دوسری طرف خاموشی نہیں تھی۔ وہ جو کوئی بھی تھا غالباً اسی وقت بے دار ہوا تھا تبھی آواز سے بھاری پن جھلک رہا تھا۔

''کون ہیں آپ اور میرا نمبر کہاں سے ملا آپ کو؟''

اس کے گمبھیر لہجے میں کہے گئے ہیلو کے جواب میں وہ تنک کر پوچھے بغیر نہیں رہ سکی۔

''دوست ہوں آپ کا، فرینڈ شپ کرنا چاہتا ہوں۔''

''میں لعنت بھی نہیں بھیجتی کسی کی فرینڈ شپ پر۔''

وہ چونکہ کسی کے ہاتھوں میں کھلونا نہیں بننا چاہتی تھی۔ تبھی متاثر ہوئے بغیر بولی تو دوسری طرف رومان دھیمے سے مسکرایا۔

''گڈ، لعنت بھیجنی بھی نہیں چاہیے کسی کی دوستی پر، خاصی ذہین لڑکی ہیں آپ۔''

اس کی آواز خوبصورت نہیں تھی مگر لہجہ ضرور متاثر کن تھا۔ وہ خاصی الجھ کر رہ گئی تھی۔

''آپ ہیں کون اور میرا نمبر کہاں سے ملا آپ کو......؟''

وہ عام سوال جو ہر عام لڑکی پہلی بار اجنبی مرد سے رابطہ پر کرتی ہے۔ رومان جانتا تھا اس سے بھی یہ سوال ضرور ہوگا تبھی لہجے کو مزید گمبھیر بناتے ہوئے آرام سے بولا۔

''یوں ہی مل گیا یار۔''

''یونہی کیسے مل گیا، دیواروں پر چسپاں ہے کیا......؟''

جذباتیت اور بہت زیادہ بولنے کا شوق اس کی شخصیت کی سب سے بڑی خامی تھی۔

''ہاں بس یہی سمجھ لو، کسی دوست کو کال کر رہا تھا۔ کوڈ غلط ہوگیا تو لائن آپ سے مل گئی۔ میرا یقین کریں، میں کوئی فلرٹی لڑکا نہیں ہوں، نہ ہی آج تک کبھی کسی لڑکی سے فرینڈ شپ کی ضرورت محسوس کی ہے۔ ذمہ دار بزنس مین ہوں۔ فضول کاموں میں وقت ضائع نہیں کرتا۔ آپ کی آواز بہت معصوم سی لگی تھی اس لیے بات کر لی۔ آپ مائنڈ کر رہی ہیں تو دوبارہ نہیں کروں گا۔''

وہ عورت کی نفسیات سے بہت اچھی طرح واقف تھا۔ اسے معلوم تھا کہ مضبوط سے مضبوط دماغ کی عورت کو ذرا سی اپنائیت اور محبت کے احساس سے کیسے قابو کیا جاسکتا ہے۔

سبین کے لیے بھی یہ لمحہ آسان نہیں تھا تاہم اس نے صبر کیا اور اس کی توقع کے قطعی خلاف خشک لہجے میں بولی۔

''بہت شکریہ، اللہ تعالیٰ آپ کو ہدایت دے دوبارہ مجھے ڈسٹرب کرنے کی زحمت مت کیجیے گا۔''

کہنے کے ساتھ ہی اس نے لائن ڈس کنکٹ کردی تو دوسری طرف موجود رومان باری دھیمے سے مسکرایا۔

''مڈل کلاس گھرانے کی لڑکی ہے ناں یار، دو چار مرتبہ ناز تو اٹھوائے گی پھر اس کے بعد دیکھنا میں ہوں گا اور وہ ہوگی۔ روتی نہ پھری میرے پیچھے تو کہنا۔''

فہد اب بھی اس کے پاس ہی بیٹھا تھا۔ اگلے چند دنوں میں اسے ملک سے باہر جانا تھا اور رومان کی کوشش تھی کہ وہ اس کے جانے سے پہلے ہی بازی جیت کر ایک اور فتح کا تمغہ اپنے سینے پر سجا لے۔

☆......☆......☆

اس دن موسم بہت خوبصورت تھا۔ سنان اپنے کمرے کی کھڑکی میں کھڑا باہر لان کے

سر سبز پودوں پر گرتی ہوئی بارش کی شبنمی بوندوں کو دل چسپ نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ جب وہ بھاپ اڑاتی چائے کا کپ لیے اس کے کمرے میں چلی آئی۔

''لیجیے جناب گرما گرم چائے حاضر ہے۔''

اس کا موڈ بے حد فریش تھا۔ سنان اچٹتی سی نظر اس پر ڈال کر چپ چاپ بیڈ پر آ بیٹھا۔

''کیا بات ہے کل سے دیکھ رہی ہوں، بے حد اداس دکھائی دے رہے ہو۔ کسی سہیلی سے جھگڑا ہوگیا ہے کیا؟'' وہ لڑکیوں کو اس کی سہیلیاں کہہ کر اسے چھیڑا کرتی تھی۔

''نہیں، ویسے ہی دل اداس ہو رہا ہے۔'' سنان نے پہلوتہی برتنا چاہی۔

''جی نہیں، دل کبھی بھی ویسے ہی اداس نہیں ہوتا۔ کوئی نہ کوئی معاملہ ہے ضرور اگر بتانا نہ چاہو تو تمہاری مرضی۔''

وہ جانتی تھی کہ سنان اس سے اپنے دل کی کوئی بھی بات چھپا نہیں سکتا اور ایسا ہی ہوا۔ اس کے اٹھنے سے قبل ہی وہ بول پڑا۔

''ماریہ کی شادی ہوگئی ہے سبی، مجھے اس کی یاد آ رہی ہے۔''

اس کا انداز ایسا تھا کہ وہ بے ساختہ ہنس پڑی۔

''اچھا یہ بات ہے، میں سمجھی پتہ نہیں کیا ہوگیا ہے۔ اس طرح کے ڈرامے تو ہر دوسرے مہینے لگتے رہتے ہیں۔ پچھلے ماہ تم شاید کسی شازیہ نامی لڑکی کی شادی ہو جانے پر بھی یوں ہی افسردہ تھے، ہے ناں مگر ایک ہفتے بعد ہی نئی محبوبہ مل گئی تو تمہیں اس کا دھیان تک نہیں رہا۔ پتہ نہیں کیسی محبت ہوتی ہے تم لڑکوں کی۔ میری تو سمجھ میں نہیں آتی۔''

''تمہاری سمجھ میں آ بھی نہیں سکتی۔ یہ چکر اور طرح کے ہیں۔ گھریلو لڑکیوں کا ان سے کوئی واسطہ نہیں۔''

''کیا مطلب گھریلو لڑکیاں۔ ساری لڑکیاں ایک جیسی ہی ہوتی ہیں، سادا اور معصوم۔''

ہمیشہ کی طرح اس نے اپنی صنف کی حمایت کی۔ جواب میں سنان کھل کر مسکرا دیا۔

''یہی تو بیوقوفی ہے تمہاری۔ تم دنیا کے بارے میں کچھ جانتی ہی کہاں ہو؟ سب لڑکوں کو الزام دیتے ہیں، برا بھلا کہتے ہیں، صنف نازک کے ساتھ ہمدردی جتاتے ہیں مگر حقیقت میں اس وقت ہمارے معاشرے میں جتنی گندگی پھیل رہی ہے اس کی ذمہ دار عورت ہے۔ رات رات بھر، اپنے گھر والوں کی آنکھوں میں دھول جھونک کر اگر لڑکیاں ہم لڑکوں کو لفٹ نہ دیں تو ہماری کیا مجال ہے کہ کسی کے جذبات سے کھیل سکیں۔ سب لڑکیوں کو پتا ہوتا ہے کہ ان کی دوستی اور محبت کا انجام کیا ہونا ہے اس کے باوجود وہ خود ہمیں یہ اختیار بخوشی سونپتی ہیں۔''

''سب بکواس ہے۔''

وہ ابھی عورت کی نفسیات سے جانے کون کون سے پردے اٹھاتا کہ اس نے شدید برہم ہو کر اس کی بات کاٹ دی۔

''عورت صرف محبت کے لالچ میں مرد کی ہوس کا شکار ہوتی ہے، صرف محبت مارتی ہے اسے، خوش نما، حسین خواب پیچھے بھاگنے پر مجبور کرتے ہیں اسے۔ ورنہ یہ صنف نازک اتنی حقیر نہیں ہے جتنا تم نے اسے سمجھ لیا ہے۔''

''میں کب کہہ رہا ہوں کہ عورت حقیر ہے۔ اسلام میں عورت حقیر نہیں مگر آج کل جو افسوس ناک حالات پیش آ رہے ہیں، ان حالات میں، ہمارے معاشرے کی عورت نے خود کو اسلام سے دور کر کے خود اپنے لیے تباہی اور گمراہی کے راستے چن لیے ہیں۔ صرف دو چار کالز کے بعد آپ جب چاہو، جہاں چاہو کسی بھی لڑکی کو ملنے کے لیے بلا سکتے ہو۔ ان کے ذہنوں سے گناہ ثواب، جنت دوزخ، زندگی موت کا تصور مٹ گیا ہے۔ تم کہو تو میں ثابت کر کے دکھا سکتا ہوں۔''

''اچھا بابا معاف کرو، تم سے باتوں میں آج تک کوئی جیت سکا ہے جو میں جیت پاؤں گی۔'' اس کے ہاتھ سے چائے کا خالی کپ لے کر وہ ہار مانتے ہوئے وہاں سے اٹھ آئی تو اندر کمرے میں سنان کتنی ہی دیر تک اس کی سادگی پر جانے کیا کیا سوچتا رہا۔

چند دن سکون سے گزر گئے۔ رومان باری کی جانب سے دوبارہ کال نہیں آئی۔ تاہم میسج کا سلسلہ برقرار تھا۔

سبین اس کے بارے میں مکمل لاتعلقی برتنا چاہتی تھی، کچھ بھی سوچنا نہیں چاہتی تھی مگر جانے یہ کیسا اتفاق تھا کہ وہ اپنی سوچوں پر پہرے نہیں بٹھا سکی۔ رات میں بستر پر لیٹتے ہی نہ چاہنے کے باوجود اس کا ذہن ان سوالوں کی گرفت میں آ جاتا تھا۔

''کون ہو سکتا ہے یہ اور اسے میرا نمبر کیسے ملا؟''

کہیں اس نے مجھے کالج آتے جاتے دیکھ کر رابطہ نہ کیا ہو۔ آخر فلموں کہانیوں میں بھی تو ہیرو یوں ہی اچانک زندگی میں آتے ہیں۔''

اسے مجھ سے کیا غرض ہو سکتی ہے۔ میں کوئی عام لڑکی تو نہیں ہوں کہ اس کی باتوں میں آ جاؤں گی۔''

لگ بھگ ایسے ہی خیالات و الفاظ روز اس کے ذہن میں کھلبلی مچاتے اور چاہ کر بھی سکون سے نہ رہ پاتی۔

اس روز سنان سے اس کی لڑائی ہوگئی تھی۔ وہ اپنی فرینڈ کے گھر جانا چاہ رہی تھی مگر سنان اس کی تیاری کی پروا کیے بغیر اپنی گرل فرینڈ سے ملنے چلا گیا تھا۔ اس کی اس حرکت نے

اسے بے حد ہرٹ کیا۔ حساس طبیعت کی وجہ سے وہ چھوٹی سے چھوٹی بات کو بھی برداشت نہیں کر پاتی تھی۔ شاید یہ اسی جذباتیت کا اثر تھا کہ اس روز وہ رومان باری کے میسج کو جواب دے بیٹھی۔ میسج کا جواب دیتے ہی دوسری جانب سے فوراً اس کی کال آ گئی۔ موسم سرما کے باعث چھت پر پھیلی ہوئی ہلکی ہلکی دھوپ خاصی بھلی لگ رہی تھی۔ وہ ابھی ابھی نمازِ چاشت سے فارغ ہو کر چھت پر آئی تھی اور اب رومان باری کی کال پک کیے بیٹھی تھی۔

''ہیلو۔''

اس کا لہجہ اب بھی خمار آلود تھا۔ وہ اپنی صاف گو طبیعت کے باعث کہے بغیر نہیں رہ سکی۔

''آپ ہر وقت نشے میں رہتے ہیں کیا؟''

اس کے سوال پر دوسری طرف وہ ہنسا۔

''نہیں لیکن جب آپ کی آواز سنتا ہوں تو خوامخواہ مدہوش ہونے کو دل چاہتا ہے۔''

''آپ ہیں کون؟''

''اللہ کا بندہ۔''

''اللہ کے بندے کا کوئی نام بھی ہوگا یا اب تک ایسے ہی گھوم رہا ہے دنیا میں۔''

اس کے الفاظ پر وہ پھر ہنسا۔

''بتایا تو تھا آپ کو، یقین کیوں نہیں کرتیں آپ؟''

''میں جھوٹ اور بکواس باتوں کا یقین نہیں کرتی۔''

وہ تپی تھی۔ پھر بولی۔

مگر میں نے یہ سیل ضرورت کے تحت رکھا ہے، فضولیات کے لیے نہیں۔ اس لیے کبھی بھی ایک عام لڑکی سمجھ کر مجھ سے فلرٹ کرنے کی کوشش نہ کرنا۔ ورنہ اللہ کی گرفت سے بچ نہیں پاؤ گے۔''

''پلیز...... میرے لیے ایسی سوچ نہ رکھیں۔ میں نے کہا تھا۔ میں عام لڑکوں کی طرح ہر لڑکی کے پیچھے بھاگنے والا نہیں ہوں۔ نہ ہی اتنا وقت ہوتا ہے میرے پاس کہ کسی سے فلرٹ

کرنے کے لیے وقت اور پیسہ برباد کروں۔ آپ مجھ پر اعتبار کریں میری ذات کی وجہ سے آپ کو کبھی بھی کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ آپ ضرور مجھے ایک اچھا دوست پائیں گی۔'' اس کا لہجہ بے حد سنجیدہ تھا۔ جس پر یقین کرنا پڑا۔

''اوکے، میں اپنے گھر والوں سے بہت پیار کرتی ہوں، میری وجہ سے ان کو ذرا سی تکلیف اٹھانا پڑے یا ان کا سر جھکے، میں کسی طور گوارا نہیں کر سکتی۔ امید ہے آپ میری ذات سے ہٹ کر میرے بارے میں کچھ بھی جاننے کی ضد نہیں کریں گے۔''

''ٹھیک ہے۔''

اسے راستے پر لانے کے لیے وہ اس کی ہر بات مانتا چلا گیا۔ اگلے آنے والے دنوں میں ہر روز ڈھیروں میسج کے ساتھ دن میں تین چار مرتبہ کال کر کے گھنٹوں اس پر اپنا سحر پھونکنا اس نے اپنی روٹین بنا لی تھی۔ ان دنوں وہ بخار میں مبتلا تھا جب کال کے دوران اس نے سبین کو بتایا۔

''میرے پاس اللہ کا دیا سب کچھ ہے اگر کسی چیز کی کمی ہے تو صرف محبت کی۔ میرے ابو بے حد سخت ہیں بہت نگرانی کرتے ہیں میری، شک بھی بہت کرتے ہیں۔ امی کا تو پوچھو ہی مت۔ ان کا سارا پیار بڑے بھائی ...... کے لیے ہے حالانکہ وہ امی ابو دونوں کو تنگ اور بھرپور عیاشی کرتا ہے پھر بھی دونوں اسی کے پیچھے پیچھے پھرتے ہیں۔ میں کھانا کھاؤں، نہ کھاؤں، کسی کو کوئی فرق نہیں پڑتا۔''

اس کے لہجے میں آزردگی تھی۔ اس کا دل پہلی بار اس کے لیے نرم ہوا تھا۔

''کیوں، ایسا کیوں کرتے ہیں تمہارے گھر والے؟''

''پتہ نہیں، شاید وہ بڑا ہے اس لیے یا پھر خودسر ہے۔ بہرحال تم میرے بارے میں سوچتی ہو، میری فکر کرتی ہوں تو مجھے بہت اچھا لگتا ہے، یوں لگتا ہے بھری دنیا میں کوئی ایسا ہے جو میرا بھی ہے۔''

وہ لفظوں کا کھلاڑی تھا اور ادھر سبین احمد حسن تھی۔ دنیا کے مکروفریب سے قطعی بے خبر۔ سادہ دل سبین۔

''ہاں، میں ہوں ناں تمہاری دوست۔ تمہیں جب بھی کوئی مسئلہ ہو تم بلا جھجک مجھ سے شیئر کر سکتے ہو۔''

''تھینک یو۔ تم واقعی دنیا کی سب سے اچھی لڑکی ہو۔''

اسے یاد ہی نہیں رہا تھا کہ بالکل یہی جملہ وہ پہلے بھی کئی لڑکیوں سے کہہ چکا ہے۔ ہر لڑکی جو اس کے دامِ الفت میں پھنس جاتی، دنیا کی سب سے اچھی لڑکی ہی ہوتی۔

سمجھدار ہو کر بھی اس کے لیے اس وقت یہ سمجھنا مشکل تھا کہ مردہ ضمیر کے گھاگ مردوں

کو ہر نسوانی آواز اچھی لگتی ہے۔ انہیں لڑکی کے اچھا برا ہونے یا عام خاص ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا کیونکہ موبائل فون پر دوست بننے والی لڑکیوں سے وہ اپنا دل یا گھر کبھی آباد نہیں کرتے۔ ان کے پاس مکڑا اور مکھی'' نظم کے مصداق تڑپ کا پتہ یہی ہوتا ہے کہ وہ جھوٹی تعریف کر کے سمجھداری سے عورت کی عقل نکال لیتے ہیں۔

دن جیسے جیسے گزرتے جا رہے تھے۔ سین بھی دوسری عام لڑکیوں کی طرح اپنے اصل سے دور ہوتی، اس کے جال میں پھنستی جا رہی تھی۔ اب وہ بھی اسے خوب ایس ایم ایس کرتی، سارا دن اس کے بارے میں سوچ کر خوب مسرور ہوتی، زندگی میں پہلی بار اسے اپنا آپ افسانوی لگ رہا تھا۔

زندگی میں پہلی بار اپنے لیے کسی مرد کی شدتیں، بے قراری اور پیارے بھرے احساسات اسے اچھے لگ رہے تھے۔ پڑھائی کی طرف سے اس کی توجہ ہٹ گئی۔ کتاب کھولتی تو بھی ——— ۔ رومان باری کے رسیلے جملے اور خواب ناک باتیں اس کے ذہن میں گردش کرتی رہتیں۔ کتاب بند کر کے بستر پر لیٹتی تب بھی اسی کے خیالات ذہن پر قابض رہتے۔ رفتہ رفتہ وہ خود پر سے اپنا اختیار کھوتی چلی جا رہی تھی مگر اسے اس بات کا احساس تک نہیں تھا۔

رومان روزانہ رات دس بجے کے بعد اس سے بات کرنے کے لیے اصرار کرتا۔ اس وقت سنان بھی گھر پر ہوتا اور کبھی کبھی حفیظ صاحب بھی آ جاتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ اکثر وہ اسے ناراض کر دیتی اور بات کرنے سے معذرت کر لیتی۔

رومان باری کو ان دنوں جیسے اس سے بات کرنے کے سوا اور کوئی کام ہی نہیں تھا۔ یہی بات اسے مغرور کرتی تھی۔ اپنے لیے کسی کی اس درجہ محبت اور توجہ پا کر وہ بھی صراط مستقیم سے پیچھے ہٹنے لگی۔ صنف مخالف سے دوستی کا پہلا تجربہ اس درجہ پر لطف اور خوشگوار ہوگا اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔ تاہم اب تک اس نے اپنا بیک گراؤنڈ اور اپنے احساسات اس سے پوشیدہ ہی رکھے تھے۔

مسٹر رومان نے کئی بار اپنی گفتگو کے دوران اسے بتایا تھا کہ وہ اپنے چھوٹے بھائی ''عمر'' سے بہت پیار کرتا ہے اور اس کی زندگی کی یہ سب سے بڑی خواہش ہے کہ وہ اپنی زندگی میں اپنے اس بھائی کے لیے اتنی محنت کرے کہ اسے کبھی خود زندگی میں کوئی کام نہ کرنا پڑے۔ اس کو اپنے گھر والوں سے متعلق اس کے ان خیالات نے بھی بے حد متاثر کیا تھا۔

جانے کیوں آج کل اسے شدت سے اس بات کا احساس ہو رہا تھا کہ جس تصوراتی

آئیڈیل ہیرو کے وہ اب تک محض خواب دیکھتی آئی ہے، وہ ہیرو سچ مچ حقیقی روپ دھار کر اچانک اس کی زندگی میں آ گیا ہے۔ سب سے دلچسپ بات یہ تھی کہ اب تک اس نے اپنے اور رومان باری کے تعلق کے بارے میں کسی کو بھی ہوا نہیں لگنے دی تھی یہاں تک کہ سنان اور سدرہ کو بھی نہیں۔ وہ اپنا اور اس کا تعلق، عام بنانا نہیں چاہتی تھی۔

رفتہ رفتہ ہی سہی مگر رومان باری اپنی ہزاروں جھوٹی قسموں اور دل فریب باتوں کے بعد بالآخر اس سادہ دل لڑکی کا اعتبار جیتنے میں کامیاب ہو گیا۔ وہ اکثر باتوں ہی باتوں میں اسے جتا دیا کرتا تھا کہ لڑکیاں اس سے شادی کے لیے مرتی ہیں تاہم اس وقت وہ کند ذہن کبھی اس جملے کی گہرائی میں نہیں جا سکتی تھی کہ جب وہ کسی کو لفٹ ہی نہیں دیتا تو لڑکیاں اس سے شادی کے لیے کیوں مرتی ہیں؟

اس روز وہ کالج آئی تو سدرہ خاصی بے قراری سے اس کی راہ دیکھ رہی تھی۔ اس پر نگاہ پڑتے ہی وہ تیزی سے لپک کر اس کی طرف آئی۔

''تھینک گاڈ تو آ گئی، میں کب سے تمہارا انتظار کر رہی تھی۔''

''کیوں خیریت......؟'' وہ قدرے چونکی۔

''ہاں خیریت ہی ہے۔ وہ اصل میں آج فہد کالج کے باہر آئے گا اپنے کسی دوست کو دکھانا چاہتا ہے مجھے، بہت منتیں کی ہیں اس نے میری۔ تو میرے ساتھ چلے گی ناں......؟''

''ہرگز نہیں۔ تمہارا تو دماغ خراب ہو گیا ہے۔ تم اس کی محبت ہو یا شو پیس۔ جو یوں سرعام وہ دوستوں کو دکھانا چاہتا ہے۔''

''ایسی بات نہیں ہے یار، وہ بہت کلوز فرینڈ ہے اس کا۔ پلیز میرے ساتھ چلنا۔ پلیز۔''

''بالکل نہیں۔''

''پلیز، تمہیں میری دوستی کا واسطہ۔''

اس وقت سدرہ کی حد درجہ بیقراری اسے بڑی عجیب لگ رہی تھی۔

''پاگل نہ بنو، میں کسی بھی غلط کام میں ہرگز تمہارا ساتھ نہیں دے سکتی۔''

''لو جی، اس میں غلط کیا ہے؟ وہ مجھے دیکھنا چاہتا ہے اور میں بھی، تم ساتھ گھر تک چلو گی تو امی کو اعتراض نہیں ہوگا اور بھائیوں کی ڈانٹ سے بھی بچ جاؤں گی۔ قسم سے، آج بڑی مشکل سے امی کو چکر دے کر آئی ہوں۔ یہ کہہ کر کہ چھٹی کے بعد تم میرے ساتھ ہمارا گھر دیکھنے آؤ گی۔ لہٰذا وہ بھائی کو مجھے لینے کے لیے نہ بھیجیں۔ پلیز مان جا۔ تجھے تیری مما کا واسطہ، پلیز۔''

اس لمحے اس کی صورت پر ایسی بے چارگی تھی کہ اس کو نہ چاہتے ہوئے بھی نرم ہونا پڑا۔
وہ فطرتاً ایسی ہی تھی۔ جلد موم ہو جانے والی، اس سے کسی کی بے بسی دیکھی ہی نہیں جاتی تھی۔

''اوکے، لیکن تم ٹھیک نہیں کر رہی ہو، سدرہ۔ شاید تمہیں معلوم نہیں ہے کہ عورت کی عزت نازک آبگینے جیسی ہوتی ہے جس پر معمولی سی چوٹ لگ جائے تو دراڑ ضرور آ جاتی ہے پھر اس کو مرمت کرنے کی ہزار کوشش کی جائے، یہ دراڑ کبھی ختم نہیں ہوتی۔''

''اچھا بابا، ہمیشہ لیکچر جھاڑنے کے موڈ میں نہ رہا کرو۔ میں کوئی ڈیٹ پر نہیں جا رہی اس کے ساتھ جو عزت پر آنچ آئے گی۔ صرف ایک دوسرے کو دور سے دیکھنے کی بات ہے اور یہ کوئی ایسی انہونی خواہش نہیں کہ تم واعظ سنانے بیٹھ جاؤ۔ ویسے بھی یہ تڑپ صرف وہی سمجھتا ہے جس کے اپنے دل پر چوٹ لگتی ہے۔ جس نے اس راستے پر قدم ہی نہیں رکھا ہو، اسے محبت کی بے بسی و لاچاری کا کیا پتہ۔'' وہ اس وقت اس کی نصیحت سننے کے موڈ میں نہیں تھی۔ لہٰذا اس کو خاموش ہونا پڑا۔ تاہم کلاسز کے دوران اس کی بے چینی و بے قراری پر وہ اسے ٹوکے بغیر نہیں رہ سکی۔

''خدا کا واسطہ ہے سدرہ، یوں بار بار وقت دیکھ کر دوسروں کو اپنے لیے مشکوک نہ کرو، چھٹی اپنے وقت پر ہی ہوگی۔''

کب ہو گی یار، آج تو وقت کاٹے نہیں کٹ رہا۔ گھڑی کی سوئیاں ہی رک رک کر چل رہی ہیں۔'' سبین اس کے الفاظ پر محض اس کی طرف دیکھ کر رہ گئی۔ خدا خدا کر کے چھٹی کا وقت ہوا تو سدرہ کی حرکتیں دیکھنے والی تھیں۔ بیگ میں میک اپ کا پورا سامان موجود تھا۔ لہٰذا اچھی طرح منہ دھونے کے بعد اس نے بڑی مہارت سے لائٹ سا میک اپ کیا پھر بال سنوارے اور سبین کا پارہ ہائی ہونے سے قبل ہی اس کا ہاتھ تھام کر کلاس سے باہر نکل آئی۔

پورا کالج اس وقت تک تقریباً خالی ہو چکا تھا۔

سبین اس وقت عجیب سے احساسات کا شکار تھی۔ اسے سب کچھ غلط لگ رہا تھا مگر وہ سدرہ کو ناراض بھی نہیں کر سکتی تھی۔

کالج سے سدرہ کے ساتھ ہی باہر آتے ہوئے اس کی اپنی ہتھیلیاں پسینے سے بھیگنے لگیں۔ اس سے کی گئی کمٹ منٹ کے عین مطابق اس کا محبوب فہد رضا، چمکتی نیو بائیک لیے، بڑے اسٹائلش انداز میں کالج گیٹ سے قدرے فاصلے پر کھڑا ان دونوں کا منتظر تھا۔ اس کا دوست بھی اس کی بائیک کے قریب ہی کھڑا تھا۔ بلیک شلوار سوٹ میں ملبوس، اس کی نہایت ڈیشنگ پرسنالٹی واقعی اس قابل تھی کہ اسے جی بھر کر دیکھا جائے۔ تاہم اس کے باوجود اس نے سدرہ کے کان میں سرگوشی کی۔

''روڈ پر لوگ آ جا رہے ہیں، اس سے رک کر بات مت کرنا۔''
اس کو اس کی یہ نصیحت پھر بری لگی۔ اس نے منہ بھی بنایا۔ تاہم اسے ناراض نہیں کیا۔

فہد کے قریب پہنچ کر وہ لمحے بھر کو رکی۔ اسے مسکرا کر نظر بھر دیکھتے ہوئے سلام کیا اور پھر اس کا وعلیکم السلام سنتے ہی فوراً آگے بڑھ آئی۔ جب کہ وہ وہیں کھڑا کافی دیر تک مڑ کر انہیں جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔

''دیکھا، کیسی غضب کی پرسنالٹی ہے اس کی اور میں کیا ہوں، بے حد عام سی لڑکی۔ اس کے باوجود وہ مجھ پر مرتا ہے۔ صرف ایک جھلک دیکھنے کے لیے بے قرار رہتا ہے۔ جب کہ ہزاروں خوبصورت لڑکیاں اس پر مرتی ہوں گی مگر وہ ان کی پروا نہیں کرتا کیونکہ وہ کوئی عام سا لڑکا ہے ہی نہیں؟''

سدرہ کا لفظ لفظ سرشاری اور بے خودی میں ڈوبا تھا۔

''بس رہنے دو، تمہیں کیا پتہ وہ تمہارے سوا اور کسی کی پروا کرتا ہے یا نہیں۔ ہو سکتا ہے جو خواب اس نے تمہیں دکھائے ہیں، وہی کئی اور لڑکیوں کو بھی دکھائے ہوں۔ ان مردوں کی کسی بات کا کبھی پتہ نہیں چلتا۔''

''تم ہمیشہ منفی ہی سوچنا۔ پتہ نہیں کیسا دماغ ہے تمہارا۔ یار محبت بھی کوئی چیز ہوتی ہے یوں ہی مجنوں پاگل نہیں ہوا تھا معمولی شکل و صورت کی لیلیٰ پر۔''

سدرہ کو پھر اس کے الفاظ اور تجزیہ ناگوار گزرا۔

''بی بی وہ دور نہیں رہا اب۔ اب تو مصنوعات کا دور ہے۔ محبتیں اور جذبے بھی مصنوعی ہو گئے ہیں۔'' وہ کہاں باز رہنے والی تھی۔

''خدا کا واسطہ ہے، تم پر ابھی تک کسی کی نظرِ التفات نہیں پڑی تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ تم دوسروں کو بھی زندگی کے حقیقی لطف سے محرومی کا درس دیتی رہو۔ زندگی ایک بار ملتی ہے۔ اسے بھی ڈر ڈر کر گئی بندھی روٹین کے ساتھ بسر کر لیا، تو کیا فرق رہ گیا ہم میں اور جانوروں میں۔ محبت کوئی عیب نہیں اور پھر یہ جذبہ اختیاری کہاں ہے۔ مجھے تو پتہ ہی نہیں چلا کہ میں کب، کیسے اور کیوں فہد سے متاثر ہو گئی۔ وہ اتنا خوبصورت اور امیر نہ بھی ہوتا تب بھی میری دھڑکنیں صرف اسی کی امانت رہتیں۔''

سبک روی سے چلتے ہوئے اس نے سبین کا اچھا خاصا ذہن صاف کر ڈالا۔

اگلے پندرہ بیس منٹ میں وہ اس کی والدہ کے مقابل بیٹھی تھی۔

صاف ستھرے کپڑوں میں ملبوس، دوپٹے کو اچھی طرح سر پر لیے۔ وہ شاید ابھی نمازِ ظہر سے فارغ ہوئی تھیں۔ سبین کو ان کا چہرہ بے حد نورانی لگا۔

سدرہ اس کے لیے کولڈ ڈرنک لے آئی۔ جسے گھونٹ گھونٹ حلق میں انڈیلتے ہوئے وہ اس کی مما سے باتیں کرتی رہی، جو اسے بتا رہی تھیں۔

''وقت بڑا ہی نازک ہو گیا ہے بیٹی۔ اپنے اسلامی ملک میں بھی کوئی رنگ اسلامی نہیں رہا۔ ہر طرف بے حیائی کا راج ہو گیا ہے۔ آج کے دور میں سب سے زیادہ مشکل ایک ماں کے لیے اپنی بیٹی کی عزت کی حفاظت ہے۔ گھر کی چار دیواری سے باہر چاروں طرف خونخوار بھیڑیوں کی بہتات ہے۔ یہ بھیڑیے جہاں کہیں کسی عورت کو ذرا سا کمزور پاتے ہیں فوراً پکڑ کر نوچ ڈالتے ہیں۔ سدرہ میری بیٹی ہے اور میں نے اس کی اچھی تربیت میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ تم بھی میرے لیے سدرہ جیسی ہو، اسی لیے سمجھا رہی ہوں کبھی کوئی ایسا کام نہ کرنا، جو تمہارے والدین کا سر جھکا دے۔''

سدرہ کی والدہ نے کبھی اس سے ایسی باتیں نہیں کی تھیں مگر پھر بھی وہ ان سے بے حد ڈرتی تھی جب کہ سدرہ کو دیکھ کر تو لگتا ہی نہیں تھا کہ وہ ان جیسی نیک اور سمجھدار عورت کی بیٹی ہے۔

اس روز گھر واپسی پر اس نے ہزار بار خود پر لعنت بھیجی کہ اس نے ایک غلط کام میں سدرہ کا ساتھ کیوں دیا؟ بار بار اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ اس کی مما کو اس کی ''حالیہ مصروفیات و کرتوتوں'' سے باخبر کر دے۔ شام میں اس نے سنان سے بھی یہ مسئلہ شیئر کیا۔

جس پر سنان نے اسے نصیحت کی کہ وہ اس کی والدہ کو باخبر کرنے کی بجائے سدرہ سے فرینڈ شپ ہی ختم کر دے کیونکہ ایسی آزاد لڑکیوں کی نہ دوستی اچھی اور نہ دشمنی۔

سنان کی ہدایت پر ہی اس نے اس سے بے رخی برتنی شروع کر دی۔ جس پر پہلے پہل وہ بہت ہرٹ اور ناراض بھی ہوئی مگر جب سبین نے صاف صاف اس سے کہا کہ وہ فہد اور اس میں سے کسی ایک کا انتخاب کرے تو اس نے چپ چاپ اس سے کنارہ کشی کر کے دو چار اور لڑکیوں سے دوستی گانٹھ لی۔

سبین کا دل اس کی اس ادا پر دکھا کیونکہ وہ اس کی بہت اچھی دوست تھی مگر قدرت نے جلد ہی اس کے اس نقصان کا ازالہ بھی کر دیا۔

سنان اسے پاگل، بیوقوف اور عقل سے پیدل لڑکی کے القاب دیا کرتا تھا مگر جانتا تھا کہ وہ دل کی بے حد سادہ اور مضبوط کردار کی حامل لڑکی ہے۔ بے حد جذباتی فطرت کی حامل ہونے کی وجہ سے اکثر وہ نقصان اٹھاتی مگر سنان کے ہوتے ہوئے اسے کوئی ٹینشن نہیں تھی۔

بچپن سے ہی سنان اس کی شرارتوں اور بیوقوفیوں پر پردہ ڈالتے ہوئے اسے سلمیٰ بیگم کے عتاب سے بچاتا آیا تھا۔ وہ اس کا کزن کم اور ''سہیلی'' زیادہ تھا۔

اس روز سنڈے تھا۔ وہ مشین لگا کر کپڑے دھو رہی تھی جب اچانک دروازے پر دستک

ہوئی۔ سنان سلمیٰ بیگم سے سر میں تیل لگوا رہا تھا اس نے اٹھ کر دروازہ کھولا تو ایک نہایت حسین لڑکی شائستگی سے مسکراتے ہوئے گھر کے اندر چلی آئی۔

''السلام علیکم، میرا نام ماہ رخ ہے۔ ابھی کل ہی ہم لوگ آپ کے سامنے والے بنگلے میں شفٹ ہوئے ہیں۔'' سبین سے ہاتھ ملانے کے بعد اس نے اپنا تعارف کروایا۔ جواباً وہ بھی مسکرائی۔

''وعلیکم السلام، آیئے، بیٹھیے پلیز۔''

لڑکی کا ظاہری حلیہ اور شکل و صورت واقعی بے حد متاثر کن تھی۔ سلمیٰ بیگم نے بہت پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

''بیٹی، ہم لوگ ذرا کم ہی اردگرد کی خبر رکھتے ہیں اس لیے تم لوگوں کے آنے کی خبر نہ ہو سکی اور کون کون ہے گھر میں؟''

''الحمدللہ سبھی ہیں، میرا مطلب ہے امی، ابو اور بھائی۔ ابو ریٹائرڈ کرنل ہیں۔ آج کل گاؤں میں زمینوں پر ہوتے ہیں۔ بھائی ملک سے باہر ہے۔ امی جاب کرتی ہیں اور میں نے ابھی حال ہی میں ماسٹرز کیا ہے۔''

''ماشاء اللہ، میں آؤں گی تمہاری طرف۔ یہ سبین ہے میری اکلوتی بیٹی کالج میں پڑھتی ہے اور یہ سنان ہے میرا بھتیجا۔ میرے پاس ہی رہتا ہے۔ اس نے بھی سولہ جماعتیں پاس کی ہیں۔ اب کسی اچھی سی ملازمت کی تلاش میں ہے مگر پاکستان میں اچھی نوکریاں بھی کہاں ملتی ہیں آسانی سے۔''

ان کا دل ہر وقت غبار سے بھرا رہتا تھا۔ اب بھی ماہ رخ سے دل کا بوجھ ہلکا کیا تو سبین تپ کر رہ گئی جب کہ سنان مسکراہٹ دباتا گھر سے باہر نکل گیا۔

اگلے چند ہی منٹوں میں وہ واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں کولڈ ڈرنک کی بوتل تھی جو سبین کو تھمانے کے بعد وہ اپنے کمرے میں گھس گیا۔

سبین کو ماہ رخ کافی اچھی لگی مگر اپنی بے تحاشا مصروفیات کی وجہ سے وہ چاہ کر بھی اس کی طرف نہیں جا سکی۔ البتہ ماہ رخ اکثر شام کی چائے پر ان کی طرف آ جاتی تھی۔ جس کی وجہ سے ان دونوں کے بیچ کافی دوستی ہو چکی تھی۔

سنان کو ماہ رخ سے اس کی دوستی پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ لہٰذا اس نے اپنا موبائل نمبر بنا کسی ہچکچاہٹ کے اسے دے دیا۔ یہی وجہ تھی کہ اب وہ گاہے بگاہے اسے ایس ایم ایس اور کال بھی کرتی رہتی۔

اس روز شام میں وہ پھر ماہ رخ سے بات کر رہی تھی جب گفتگو کے دوران اچانک اس

نے پوچھا۔

''سبی ایک بات پوچھوں، سچ سچ جواب دو گی؟''

''ہاں پوچھو۔''

اس کی کھلی آفر پر ماہ رخ ایک لمحے کے لیے خاموش رہ کر بولی۔

''کیا تم اپنے کزن سنی سے پیار کرتی ہو؟''

''نہیں۔'' ایک لمحے کو سوچے بغیر اس نے فوراً جواب دیا۔

''کیوں؟''

''پتہ نہیں یار، میں نے کبھی اس کے بارے میں اسپیشل سوچا نہیں ہے۔ ویسے بھی وہ میرے تصوراتی ہیرو سے میل نہیں کھاتا اور نہ وہ خود مجھے پسند کرتا ہے کیونکہ اس کے نزدیک میں عقل سے پیدل لڑکی ہوں لیکن تم یہ سب کیوں پوچھ رہی ہو؟'' فوراً ہی وہ مشکوک بھی ہوئی۔

''ویسے ہی یار، مجھے کافی سلجھا ہوا لگا سنان۔''

''ہاں، سلجھا ہوا، ایک نمبر کا فلرٹی اور دھوکے باز ہے، بیسیوں لڑکیوں سے چکر چلا رکھے ہیں موصوف نے، اس کا موبائل دیکھنا کبھی، کوئی پچاس نمبر فیڈ ہوں گے لڑکیوں کے۔ کالز بھی ریکارڈ کرتا ہے ان کی پھر اپنی شو بنانے کو مجھے سناتا ہے۔ سچی مانی۔ اب تو لڑکیوں میں بھی حیا ناپید ہو چکی ہے۔''

وہ چونکہ اس کے نمبر پر آنے والی لڑکیوں کی ریکارڈ کالز سنتی رہتی تھی لہٰذا ان کی فضول حرکتوں سے بھی بخوبی آگاہ تھی۔ ماہ رخ نے اس کے الفاظ پر ہلکا سا قہقہہ لگایا۔

''ہاں یار، اب تو ہم بھی بڑے ایڈوانس ہوگئے ہیں، لڑکے تو لڑکے۔ اب لڑکیاں بھی کسی سے پیچھے نہیں رہیں۔ بے حیائی اور بے حسی ہمارے اندر سرایت کر گئی ہے۔ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت مفقود ہو چکی ہے۔ آگ اور پانی کے کھیل نے پاکستان کو تباہی کے دہانے پر لا کھڑا کیا ہے۔''

''سچ کہتی ہو، اب تو نصاب میں بھی شرمناک تبدیلیاں دیکھنے کو مل رہی ہیں۔ فرسٹ ایئر کی بائیو دیکھی ہے تم نے۔''

''نہیں، لیکن سنا ہے کہ کچھ چیپٹر واقعی اخلاقی اقدار سے باہر ہیں۔ نظام تعلیم کا تو بیڑا ہی غرق کر دیا ہے اس حکومت نے۔''

دونوں کے بیچ روزانہ ایسے ہی موضوعات پر گھنٹوں گفتگو ہوتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اب سبین کو سدرہ سے دوستی ختم ہونے کا پہلا سا دکھ نہیں رہا تھا۔

سنان آج کل شدت سے یہ بات نوٹ کر رہا تھا کہ سبین کا اس کے ساتھ بھی برتاؤ پہلے جیسا

نہیں رہا۔ پہلے کی طرح ان کی نوک جھوک بھی نہیں ہوتی اور اب وہ اکثر اس کے چھوٹے موٹے کام سرانجام دینے میں بھی لاپروائی کا مظاہرہ کر رہی تھی۔ پچھلے دنوں سلمٰی بیگم اس کے پاس موبائل دیکھ کر بہت غصہ ہوئی تھیں مگر اس نے پروا نہیں کی۔ اس روز سنان نے انہیں کہتے سنا۔

''اللہ کی مار پڑے اس لڑکی پر، پہلے موئے رسالوں سے چمٹی رہتی تھی اب یہ منحوس موبائل فون آ گیا ہے۔ مجال ہے جو ایک منٹ بھی جان چھوڑتی ہو اس کی۔ ناس مارے میں پتہ نہیں کیا ہے جو اس لڑکی کا دل ہی نہیں بھرتا۔''

وہ سنان سے نہیں کہہ رہی تھیں مگر پھر بھی ان کی اطلاع پر وہ بہت دیر تک سبین کے بارے میں سوچتا رہا۔ اسے خود سے بڑھ کر سبین کی ذات اور اس کے کردار پر یقین تھا۔ وہ کسی صورت میں کچھ غلط نہیں کر سکتی تھی مگر موجودہ حالات و واقعات کو مدِنظر رکھتے ہوئے وہ کچھ متفکر ضرور ہو گیا تھا۔

موبائل فون سے پھیلتی معاشرتی تباہ کاریوں سے وہ کسی طور بے خبر نہیں تھا۔ اسی لیے اسے ڈر تھا کہ کہیں سبین اپنی سادگی اور معصومیت کے ہاتھوں کوئی نقصان ہی نہ اٹھالے۔ یہ سبین ہی تھی جس کے لیے اس نے گاؤں کو خیر باد کہا تھا۔ اپنے ماں باپ بہن بھائی سب کو چھوڑ کر شہر میں معقول جاب کی تلاش کر رہا تھا۔ مستقبل میں بھی اس کا ارادہ یہیں اسی شہر میں چھوٹا سا گھر بنانے کا تھا۔ لہٰذا کسی معقول ملازمت کے ملنے تک وہ فی الحال چھوٹے موٹے اداروں میں ہی کام کر رہا تھا۔

وہ مرد تھا اور معاشرے میں تیزی سے جڑیں پھیلاتی برائیوں کی خبر اسے زیادہ تھی۔ قدرے بیوقوف اور سادہ لڑکیوں کی زندگی میں جو تباہ کاریاں ''موبائل فون'' کی وجہ سے پھیل رہی تھیں وہ ان سے لاعلم نہیں تھا۔

اللہ اور اس کے رسولؐ کے نام پر قائم ہونے والے اسلامی ملک میں، سی ڈی اور کیبل کا عام ہونا ہی ہر باشعور پاکستانی کے لیے لمحہ فکریہ تھا کہ ''موبائل فون'' کے نہایت سستے پیمانے پر عام ہونے نے مزید الجھن بڑھا دی۔

نہایت کامیابی سے پاکستان کی نئی نسل کی گمراہی، ذہنی پراگندگی اور دین سے دور کرنے کی دشمن کی گھٹیا اور گھناؤنی کوششیں تیزی سے اپنے مقاصد حاصل کرتی دکھائی دے رہی تھیں۔ نئی نسل کی رگوں میں بے حیائی کا اترتا یہ میٹھا زہر، شریف والدین کی نیندیں اڑا رہا تھا۔ ماؤں کے لیے اپنی جوان بیٹیوں کے ایمان اور عزت کی حفاظت ایک المیہ بنتی جا رہی تھی۔ آئے دن روز نت نئے واقعات ہو رہے تھے۔

اس کے ایک دوست کی بہن کو پچھلے دنوں موبائل فون کی وجہ سے طلاق ہو گئی تھی کیونکہ

محترمہ شوہر کے اعتراض کرنے کے باوجود کسی صورت موبائل فون سے دستبردار ہونے پر راضی نہیں تھیں نتیجتاً دونوں میں اختلافات ہوئے اور اس کا اختتام طلاق پر ہوا۔لڑکی جیسے ہی فارغ ہو کر باپ کے گھر واپس آئی وہ اتنا بڑا صدمہ برداشت نہ کرتے ہوئے زندگی کی بازی ہار گئے اور یوں ان کا ہنستا کھیلتا شیرازہ بکھر کر رہ گیا۔

پچھلے دنوں اسے گھر میں ایمرجنسی کال کرنی تھی مگر اس کے موبائل میں گفتگو کے دوران ہی بیلنس ختم ہو گیا۔تبھی اس نے اپنے ایک دوست سے موبائل مستعار لے لیا۔گھر بات کرنے کے بعد یوں ہی فراغت میں دل بہلانے کے لیے اس نے Video اور Sound کے فولڈر چیک کیے تو ویڈیو میں محفوظ پہلے ہی گیت نے اس کے ہوش اڑا دیے۔

انتہائی شرمناک مناظر دیکھ کر مرد ہونے کے باوجود اس کا دماغ سنسنا اٹھا۔

Nexst Folder میں پوری انگلش موومی محفوظ کی ہوئی تھی جس کا ایک ایک سین غلاظت سے بھرپور تھا۔ویڈیو دیکھنے کے بعد اس کی **Sound** میں جانے کی ہمت ہی نہیں ہوئی۔گو وہ خود بھی زیادہ شریف لڑکا نہیں تھا۔بیک وقت کئی لڑکیوں سے اس کا افیئر چل رہا تھا مگر اس حد تک اخلاق سوز ذہنی تفریح تک ابھی اس کا دماغ نہیں گیا تھا۔نہ ہی اسے اس کی ضرورت محسوس ہوتی تھی۔مرد ہو کر بھی وہ موبائل فون کی ایسی بہت سی ''دل چسپ تفریحات'' سے باز رہا تھا جس میں اس کے دیگر کئی دوست بری طرح انوالو تھے۔

ابھی کل ہی وہ دوستوں میں بیٹھا تھا جب اس کا دوست فائز بڑے فخریہ انداز میں اسے بتاتے ہوئے بولا۔

''موجودہ حکومت کا کوئی اور اقدام اچھا ہو یا نہ ہو مگر یہ کام تو تعریف کے قابل ہے کہ اس نے نئی نوجوان نسل کو سستی تفریح فراہم کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔پہلے جاتے تھے سینما، یا چوری کر کے گھر میں ''فلمیں'' لا کر دیکھا کرتے تھے اور گھر والوں سے جوتیاں پڑتی تھیں مگر اب تو کسی کو پتہ ہی نہیں چلتا اور موج ہو جاتی ہے۔''

عجیب خباثت تھی اس کے چہرے پر سنان بس ایک نظر اسے دیکھ کر رہ گیا۔

''اچھا سن، کل لاہور چل رہا ہے میرے ساتھ؟''

سکندر اور وقار ابھی تھوڑی دیر پہلے اٹھ کر گئے تھے۔تبھی اس نے اسے آفر کی تھی۔

کیوں، تمہارا کیا کام نکل آیا لاہور میں؟''

کام تو کچھ خاص نہیں، سعدیہ نے اسپیشل بلایا ہے۔سعدیہ کو تو جانتا ہے ناں تو، آج کل اپنی جان بنی ہوئی ہے۔وہاں کسی ہوٹل میں اسپیشل کمرہ بک کروایا ہے اس نے بہت اصرار کر

رہی ہے۔میں تو بہت ایکسائیٹڈ ہو رہا ہوں یار۔''

''تیرے لیے ہوگی، میں ایسی نیچ لڑکیوں پر لعنت بھیجتا ہوں۔''

سنان کو اس کا اس طرح سے پر جوش ہونا قطعی زہر لگا تھا جب کہ وہ اس کے الفاظ پر کھلکھلایا۔

''تو ہے ہی گھامڑ، تجھے کیا پتہ، زندگی کا اصل سرور اسی مزے میں ہے۔خیر مولا دے اور بندہ لے۔لڑکیاں جب خود مجبور کر کے ایسی آفر دیں تو ہم انکار کر کے کفرانِ نعمت کیوں کریں۔''

''کفرانِ نعمت کے بچے، مرو گے تو سب کچھ پتہ چل جائے گا۔''

وہ چلایا، تو فائز لاپروائی سے ہنستے ہوئے بولا۔

''جب مریں گے تب دیکھا جائے گا، فی الحال تو عیش کرنے کی عمر ہے۔''

سنان کو اس کی ہنسی زہر لگ رہی تھی۔وہ اٹھنا ہی چاہ رہا تھا جب فائز نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے دوبارہ بٹھا لیا۔پھر پینٹ کی پاکٹ سے موبائل نکال کر کوئی نمبر پریس کیا اور سنان کو آنکھ مارتے ہوئے موبائل اسپیکر آن کر دیا۔

قدرے باریک نسوانی آواز، کچھ ہی لمحوں میں اسپیکر سے گونجی۔فائز بولا۔

''کیسی ہو جانو۔زندہ ہو کہ مر گئیں؟''

''تمہیں اس سے کیا۔تم اپنی نئی گرل فرینڈز کے ساتھ مزے کرو۔میں جیوں یا مروں، تمہاری بلا سے۔'' سنان سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ فائز اسے یہ کال کیوں سنا رہا تھا۔تب بھی وہ خاموش بیٹھا رہا۔

فائز بے ساختہ ہنسا۔

''اوہو، اتنا غصہ، اچھا چھوڑو، یہ بتاؤ، کیا کر رہی ہو

''کچھ نہیں فارغ ہوں، ٹی وی دیکھ رہی ہوں۔''

''اچھا۔ملنے آ سکتی ہو اس وقت؟'' اپنا مطالبہ پیش کرنے میں اس نے ایک لمحہ بھی نہیں لگایا۔

''کیوں؟''

''کیوں کو چھوڑو، ہاں یا ناں کا جواب دو۔''

لڑکی شاید اس کا اشارہ سمجھ گئی تھی۔تبھی کنفیوز ہوتے ہوئے بولی۔

''اتنا رعب کیوں ڈال رہے ہو......؟''

''یار رعب کہاں ڈال رہا ہوں، پیار سے کہہ رہا ہوں، ملنے آ سکتی ہو اس وقت۔''

''کہاں ملنا ہے؟'' اس بار لڑکی کا لہجہ مزید دھیما ہو گیا تھا۔جب وہ زیر لب مسکرا کر

سنان کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

''جہاں تم کہو۔''

''مجھے نہیں پتہ، جہاں بھی ملنا ہے مجھے بتا دو، میں آ جاؤں گی۔''

''چلو ٹھیک ہے، آذر کی شاپ پر آ جاؤ، وہ بیٹھا ہوگا۔ وہاں پہنچ کر مجھے رنگ کر دینا، میں آ جاؤں گا۔''

''لو جی، میں وہاں پہنچ کر رنگ کر دوں، تمہارے پاؤں میں مہندی لگی ہے۔'' لڑکی معمولی سی خفا ہوئی، جبکہ فائز ایک مرتبہ پھر ہنسا۔

''نہیں یار، میری بائیک پنکچر ہے، ابھی فوری نہیں آ سکتا۔''

وہ تو ہمیشہ پنکچر ہی رہتی ہے، کبھی ٹھیک بھی ہوتی ہے۔''

اس بار فائز نے کھل کر ہنستے ہوئے اسے نہایت بے ہودہ جواب دیا۔ دوسری طرف موجود لڑکی بھی پزل ہوگئی تھی۔

''فضول بکواس کرنی بہت آتی ہے تمہیں،''

لڑکی کے لہجے میں پھر معمولی سی خفگی جھلکی تھی۔ جواب میں فائز مزید کھکھلا اٹھا۔

سنان جیسے جیسے سن رہا تھا اس کا دل سکڑتا جا رہا تھا۔ کیا وہ کسی گھر کی بیٹی نہیں تھی، کیا اسے اپنے بابل کی عزت کا خیال نہیں تھا؟

'اچھا، چلو ساتھ میں اپنی اس دوست کو بھی لے آنا، جو تمہاری بیسٹ فرینڈ ہے، ذرا اس سے بھی ہیلو ہائے ہو جائے گی۔''

''نہیں، تمہاری ہیلو ہائے صرف مجھ سے ہی ہونی چاہیے۔ سدرہ تحریم سے نہیں سمجھے۔''

ذلالت کے اندھے کنویں میں بخوشی گرنے کے باوجود وہ لڑکی فائز سے دلی وابستگی کا اظہار کر رہی تھی جو اس سے قطعی لوفرانہ انداز میں بات ختم کرنے کے بعد اب سنان سے کہہ رہا تھا۔

''دیکھا، لڑکیاں خود بیتاب ہیں ہمارے ہاتھوں تباہ و برباد ہونے کے لیے اور تم مجھے شرافت کا سبق پڑھا رہے ہو۔ کہو تو ایسی ہی دو، چار اور کالز سناؤں۔'' وہ جو اپنے کارناموں پر مسرور ہو رہا تھا۔ نہ صرف خود جہنمی ہو گیا تھا بلکہ اپنے ساتھ کئی اور لڑکیوں کو بھی جہنم کا ایندھن بنا رہا تھا۔ سنان اس روز پوری رات سکون سے سو نہیں سکا۔

☆......☆......☆

رومان باری اس کی زندگی میں کیا آیا اس کی زندگی کے ڈھنگ ہی بدل گئے۔ اب تک وہ اس سے نہ ملی تھی، نہ اسے دیکھا تھا۔ صرف اس کی آواز تھی یا الفاظ، جن کے سحر میں

جانے کیسے وہ جکڑ کر رہ گئی تھی۔ اس روز دل کے ہاتھوں مجبور جانے کیسے، وہ سنان کو کھانا دینے کے بعد اس سے پوچھ بیٹھی۔

سنان تمہارے دوست کے کالج میں ایک لڑکا پڑھتا ہے رومان

''ہاں، ایک نمبر کا لوفر اور گھمنڈی شخص ہے، اپنی حیثیت اور اسٹیٹس پر اترانے والا۔ عام لوگوں سے تو سلام لینا بھی پسند نہیں کرتا، لیکن تم اس کے بارے میں کیوں پوچھ رہی ہو؟''

اس کے لہجے میں تشویش تھی، سبین کا دل جیسے خون میں ڈوب کر رہ گیا۔ تاہم فوراً اس نے بہانہ بنایا۔

''بس ویسے ہی، میری دوست کا چکر چل رہا ہے اس کے ساتھ، اسی لیے پوچھ رہی تھی۔''

''فضول چکروں میں اپنا ذہن نہ لگایا کرو اور اپنی دوست کو کہو عقل کے ناخن لے وہ اچھا لڑکا نہیں ہے۔''

حقیقت سے مکمل بے خبر وہ اس کی دوست کے لیے اسے ہدایت کر رہا تھا۔ مارکیٹ میں اٹھنے بیٹھنے کے باعث اس سے تو کوئی بات پوشیدہ نہیں تھی مگر سبین کے اعتبار کو بہت بڑا جھٹکا لگا تھا۔ اسے اپنی بیوقوفی پر غصے کے ساتھ ساتھ رونا بھی آ رہا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اگلے دو روز تک اس نے اپنا سیل آف رکھا، مگر ایسا کرنے سے بھی وہ سکون میں نہیں رہ سکی۔ تیسرے روز سیل آن کرتے ہی رومان باری کے ایک ساتھ کئی میسج دھڑ دھڑ آ گئے۔ ہر ہر میسج میں وہ اس کے سیل آف کرنے پر بے قرار دکھائی دیا تھا۔ ابھی وہ میسج پڑھ رہی تھی کہ فوراً اس کی کال بھی آ گئی۔ جسے نہ چاہتے ہوئے بھی اس نے پک کر لیا۔ اس نے حسب عادت ہیلو کہا مگر دوسری طرف خاموشی چھائی رہی۔

''ہیلو۔''

''کیسی ہو؟'' اس بار اس کی ہیلو کے جواب میں اس کی خاصی مدہم آواز سننے کو ملی مگر اس نے پروا نہیں کی۔

''تمہیں کیا جیسی بھی ہوں، تمہاری اصلیت کھل گئی ہے مجھ پر، میرا کزن تمہیں بہت اچھی طرح سے جانتا ہے۔ تم ایک نمبر کے لوفر اور دغا باز انسان ہو، خبردار جو آج کے بعد کبھی مجھ سے رابطہ کرنے کی کوشش کی تو۔''

اپنی سادہ اور صاف گو طبیعت کے باعث اس نے علم میں آئی بات چھپائی نہیں، تاہم رومان باری اس کے اس جارحانہ انداز پر ضرور گڑبڑا گیا۔

''سین پلیز! پہلے میری بات سن لو پھر تمہارا جو دل چاہے، وہ کرنا۔''

دونوں کے بیچ آپ جناب کا تکلف ختم ہو چکا تھا ـــــ وہ اس کے رنگ مٹھی میں جذب کرنے کے لیے ایک مرتبہ پھر ذلیل ہونے میں قطعی کوئی شرم محسوس نہیں کر رہا تھا۔ تبھی بے قرار لہجے میں بولا۔

''میں تمہیں غلط نہیں کہتا لیکن تمہارا کزن جس مانی کو جانتا ہے وہ میں نہیں ہوں، میرا کزن ہے۔ خدا کا واسطہ ہے تمہیں، میرا یقین کرو، میں غلط لڑکا نہیں ہوں اگر غلط ہوتا تو اب تک کئی بار تم سے ملنے کی فرمائش کر چکا ہوتا مگر میں نے تو ابھی تمہیں دیکھا بھی نہیں میں کیوں جھوٹ بول کر فلرٹ کروں گا تم سے۔ جانتا ہی کیا ہوں میں تمہارے بارے میں صرف تھوڑا سا پیار چاہیے ناں تم سے اور تو کچھ نہیں مانگتا۔''

اسے خود پر جو غرور تھا وہ ایسے ہی نہیں تھا۔ وہ اس کی وضاحت سن کر چپ کی چپ رہ گئی تھی۔

''دیکھو کوئی ایسا ویسا تعلق ہوتا ہے ناں تو ٹوٹنے کا دکھ نہیں ہوتا مگر میرا اور تمہارا تعلق تو ایسا ویسا ہے ہی نہیں پھر میں کیسے اسے ٹوٹنے دے سکتا ہوں؟'' وہ کہہ رہا تھا اور قطعی عام لڑکیوں کی طرح سین احمد حسن کا دل پھر پگھل کر موم ہو گیا۔

''سوری، مگر پلیز...... مجھ سے کبھی بے وفائی مت کرنا مانی، میں نے آج تک کبھی کسی کو اپنے جذبات سے کھیلنے کی اجازت نہیں دی، تمہیں عام لڑکوں سے مختلف پا کر ہی قدم تمہاری طرف بڑھائے ہیں، پلیز میرے اعتبار کو ٹھیس مت پہنچانا۔''

''کبھی سوچنا بھی نہیں، مانی خود مر جائے گا مگر تمہاری آنکھوں میں آنسو کبھی نہیں آنے دے گا۔''

اس نے دعوا کیا تھا مگر اس وقت سین احمد حسن نہیں جانتی تھی کہ ریت کے گھروندوں پر دھرے دعوؤں کے محل جب گرتے ہیں تو ان دعوؤں پر اپنا جیون ٹکا دینے والی لڑکیوں کی ذات، محفل میں جلتی شمع کی مانند ہو جاتی ہے، لحہ لحہ جل کر آنسو ٹپکاتی شمع۔

اگلے چند دنوں تک وہ اسے اپنی سنہری باتوں کے جال میں پھنسا کر بڑے ہی سادہ انداز میں اسے دیکھنے اور اس کا پتہ ٹھکانہ جاننے کی فرمائشیں کرتا رہا مگر وہ اسے ٹالتی رہی۔

اب وہ پہلے سے زیادہ اسے کال کرتا، بچوں کی طرح اس کا خیال رکھتا۔ معمولی باتوں پر وہ خفا ہو جاتی تو بے قرار ہو کر، ہزار منتیں کر کے اسے مناتا ــ کالج جانے سے قبل اس کی آواز سن کر ناشتہ کرتا۔ صبح اٹھتے ہی اسے صبح بخیر کا میسج کرتا اور رات میں دیر تک اسی سے

باتیں کرتے کرتے سو جاتا۔

وہ اگر سنان کی ہدایت پر یقین کرنا بھی چاہتی تو مسٹر ردمان کے معمولات دیکھ کر نہیں کر پاتی تھی۔ بہت دنوں سے وہ کچھ کہنا چاہ رہا تھا مگر کہہ نہیں پا رہا تھا۔ اس روز وہ مزید صبر کا مظاہرہ نہ کر سکی اور اس سے ضد کر بیٹھی۔

'' مانی پلیز بتاؤ ناں، تم مجھ سے کیا کہنا چاہتے ہو؟''

اندر کہیں وہ خود بھی اس سے کچھ سننے کو بے قرار تھی، جانے کیوں آج کل ٹی وی دیکھتے، رسالہ پڑھتے، گھر کا کام کاج کرتے یہاں تک کہ نماز قرآن پڑھتے ہوئے بھی اس کے دھیان میں ردمان بادی اور اس کی باتیں ہی ہوتی تھیں۔ احمد صاحب تو شروع سے ہی گھر سے بے نیاز تھے، سلمٰی بیگم اور سنان سے ڈرنا اب اس نے چھوڑ دیا تھا یہی وجہ تھی کہ ٹھیک دس بجے کے بعد جیسے ہی مسٹر ردمان کی کال آتی وہ ہر چیز سے غافل ہو جاتی۔

رات ساڑھے بارہ بجے کے قریب اچانک پیاس لگنے پر سنان کی آنکھ کھلی، تو سین کے کمبل کے اندر سے آتی اس کی مدہم آواز اسے چونکا گئی۔ موبائل فون کے دوسری طرف ردمان بادی مخمور لہجے میں اس سے کہہ رہا تھا۔

''سی، پلیز مائینڈ مت کرنا، مجھے رئیلی تم سے پیار ہو گیا ہے، کب کیسے اور کیوں میں نہیں جانتا۔ مجھے صرف اتنا پتہ ہے کہ میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا۔ پلیز مجھ سے کورٹ میرج کر لو، میرے پاس آ جاؤ، پلیز۔''

وہ کال ریکارڈ کر رہا تھا مگر وہ اس بات سے آشنا نہیں تھی۔ وہ تو اس کی آواز کے نشے میں ہی مدہوش ہو رہی تھی۔

''نہیں...... میں تم سے کورٹ میرج نہیں کر سکتی۔''

اس کے اعترافِ محبت پر خوشی سے سرشار ہوتے ہوئے بمشکل وہ کہہ پائی۔ جب وہ آواز کو مزید بھاری کرتے ہوئے بولا۔

''پلیز...... میری سمجھ میں نہیں آ رہا میں کیا کروں۔ کتنے دنوں سے کچھ خواب ہیں جو تم سے شیئر کرنے کی ہمت نہیں کر پا رہا صرف اسی ڈر سے کہ تم خفا ہو کر تعلق ختم نہ کر دو۔ آج برداشت نہیں ہو رہا، کہہ دوں......؟''

''ہاں۔'' اس کی آواز کانپ رہی تھی۔

''تھینک یو، تصور میں ہی میرے پاس آ جاؤ ناں، قسم سے کچھ نہیں کہوں گا۔''

وہ لہجے کو خواب ناک بنا کر اس پر جادو کر رہا تھا اور وہ واقعی اس کے جادو کی گرفت میں آتی جا رہی تھی۔

''او کے۔''

سلمیٰ بیگم کی چارپائی قریب ہونے کی وجہ سے کھل کر بول نہیں رہی تھی۔ جس سے مسٹر رومان کو اور مزا آرہا تھا۔

تمہیں سردی لگے تو کمبل ہے میرے پاس اور قسم ہے تمہیں جب تک میں بات مکمل نہ کر لوں کال ڈس کنکٹ مت کرنا۔ 1500 روپے کا بیلنس لوڈ کیا ہے ابھی ختم ہوگیا تو اور لوڈ کر لوں گا، لائن نمبر بھی پاس ہے۔'' وہ اس سے کس قسم کی گفتگو کرنے جارہا تھا۔ اس کو اندازہ نہیں تھا۔ تاہم اگلے دو گھنٹوں کے بعد اس کی سانس سے سانس نہیں مل رہی تھی۔

رات میں موبائل فون پر لڑکے لڑکی کے بیچ ہونے والی گفتگو کا اندازہ پہلی بار اسے ہوا تھا اور کتنی عجیب بات تھی کہ اسے برا بھی نہیں لگا تھا۔ رات عشا کی نماز پڑھتے ہی نیند کی بانہوں میں جھول جانے والی وہ سادہ سی لڑکی اس رات پہلی بار کسی کے ساتھ جاگی تھی اور بے حد خوش تھی۔

''اب سو جاؤ گندے بچے، آدھی رات ہوگئی ہے، صبح اٹھنا بھی ہے۔''

دو گھنٹے کی اخلاق سوز گفتگو کے بعد اس نے اپنے محبوب سے کہا۔

''تمہیں کچھ نہیں ہوتا، اتنی باتیں سننے کے بعد بھی تمہارے ہوش سلامت ہیں۔''

''لیں۔ میں نے کہا تھا ناں میں پتھر ہوں۔''

''بہت گندی ہو تم۔ کل رات پھر بات کرو گی ناں؟''

''کیوں؟''

اس کی سانس اتھل پتھل ہو رہی تھی۔ اس نے چپکے سے لائن کاٹ دی۔

محبت اور خواب ہر عورت کی کمزوری ہوتے ہیں اور مرد ہمیشہ عورت کی اسی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر اس کی ذات کو تماشا بناتا ہے۔ رومان بادی بھی فقط چھ ماہ میں سبین احمد حسن کو اس مقام تک لے آیا تھا جہاں سے وہ تنکا تنکا ہوئے بغیر واپس نہیں پلٹ سکتی تھی۔

اگلی صبح وہ خود اپنے آپ سے شرماتے ہوئے، انتہائی خوشگوار موڈ میں سنان کو ناشتہ دینے آئی تو جانے کیا سوچتے ہوئے اس نے آواز دے کر اسے روک لیا۔ وہ قدرے چونک کر پلٹی۔

''رات بہت دیر تک کس سے بات کر رہی تھیں تم؟''

بنا کسی تمہید کے سنجیدہ لہجے میں جوں ہی اس نے پوچھا تو اس کے چہرے کا رنگ ایک دم سے فق ہوگیا۔

''سدرہ کے ساتھ، اسے نیند نہیں آرہی تھی۔''

ہمیشہ صاف گوئی سے کام لینے والی لڑکی کو اس وقت اپنے دل کی خوشی اور سرور کے لیے جھوٹ کا سہارا لینا پڑ گیا۔

''تم نے جھوٹ کب سے بولنا سیکھ لیا؟''

اس کی آنکھیں جل رہی تھیں۔ اس کو اس تفتیش پر بلاوجہ بے تحاشہ غصہ آ گیا۔

''مجھے کوئی ضرورت نہیں ہے تم سے جھوٹ بولنے کی، براہ مہربانی میری جاسوسی کرنا چھوڑ دو۔''

''یہ سب ٹھیک نہیں ہے......''

اس کے تیز لہجے کے جواب میں بھی اس نے نرم رویہ اختیار کیا مگر وہ اپنا گناہ چھپانے کے لیے پھر چلائی۔

''کیا ٹھیک نہیں ہے۔ تمہیں تو اپنے سوا ہر کوئی غلط ہی نظر آتا ہے۔ خود تم نے جو پچاس پچاس افیئرز چلا رکھے ہیں، وہ کچھ نہیں......؟''

سنان کے اندر اس لمحے کوئی چیز ٹوٹی، تاہم پھر بھی وہ اسے سمجھاتے ہوئے بولا۔

''خود کو میرے ساتھ کمپیئر مت کرو۔ معاشرے میں تمہارا اور میرا مقام الگ الگ ہے۔ میں داغدار ہو کر بھی سر آنکھوں پر رہوں گا مگر خدانا خواستہ تمہارے دامن پر بدکرداری کا ہلکا سا داغ بھی لگ گیا تو اسی معاشرے کے لوگ تمہارا جینا دوبھر کر دیں گے، کیوں نہیں سمجھتی ہو تم۔''

''میں سب سمجھتی ہوں، تم فضول میں شک مت کرو مجھ پر۔''

''ہوسکتا ہے ایسا ہی ہو مگر ایک بات یاد رکھنا ہمارے ملک میں جب سے موبائل فون عام ہوا ہے محبت کا جذبہ بری طرح سے پٹ کر رہ گیا۔ سب ٹائم پاس کے چکر میں اپنا آپ تباہ کر رہے ہیں۔ ذرا سی لمحاتی خوشیوں اور سرور کے لیے خود کو جہنم کا ایندھن بنا رہے ہیں۔ ایسے لوگوں کی دنیا بھی برباد ہے اور آخرت بھی۔ اسی لیے تنبیہ کر رہا ہوں۔ یہ موبائل فون کی محبت سراب کے سوا اور کچھ نہیں۔ تم لڑکیاں کیسے جان سکتی ہو کہ لڑکا، کس فطرت و کردار کا مالک ہے؟ وہ تم سے جو کہتا ہے اس میں کتنا سچ اور کتنا جھوٹ ہے۔ سارے دن اس کی مصروفیات کیا ہیں؟ جو باتیں وہ تم سے کرتا ہے، وہی باتیں اور جانے کس کس سے کہتا ہے۔ یقین کرنا تمہاری مجبوری ہے سبی۔ کوئی لڑکا بھی تمہیں اپنے بارے میں کوئی کہانی سنائے تو تمہارے پاس یقین کرنے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں کیونکہ تم کسی کی تحقیق نہیں کر سکتیں۔ تم میں سے ہر لڑکی کو یہی لگتا ہے کہ اس کا بوائے فرینڈ دوسرے عام فلرٹی لڑکوں جیسا نہیں ہے۔ وہ اس سے مخلص ہے مگر...... حقیقت میں ایسا نہیں ہے۔ کوئی بھی تعلق، خواہ وہ کسی نوعیت کا ہو اگر ناجائز ہے تو غلط ہے۔ کبھی بھی نقصان کا باعث بن سکتا ہے اور تم اپنی معصومیت کی وجہ سے کوئی

نقصان اٹھاؤ یہ میں برداشت نہیں کرسکتا۔''

سیانے بزرگ کہتے ہیں کہ عورت کی عقل ہمیشہ اس کے ٹخنوں میں ہوتی ہے اور وہ بالکل سچ کہتے ہیں۔ بعض اوقات عورت جذبات کے ہاتھوں اتنی اندھی ہو جاتی ہے کہ وہ دیکھ ہی نہیں پاتی کہ کن آنکھوں میں اس کے لیے پیار ہے اور کن میں صرف تحقیر۔

بے شک وہ ہمیشہ سے اس کا سب سے بڑا مددگار اور رہنما ثابت ہوا تھا۔ وہ جانتی تھی سنان کے لفظوں میں کچھ بھی غلط نہیں ہے مگر سب سے بڑا مسئلہ تو یہ تھا کہ وہ ردمان باری کو عام لڑکا سمجھتی ہی نہیں تھی۔ اس پر اسے اندھا اعتبار تھا اور اندھا اعتبار کرنے والے لوگ جب ٹھوکر کھا کر گرتے ہیں تو ریزہ ریزہ ہو کر بکھرتے ضرور ہیں۔ وہ بھی عام لڑکیوں کی طرح اس مرحلے پر آ گئی تھی جہاں کسی کی نصیحت اثر نہیں کرتی۔

''اب جاؤ مگر یاد رکھنا مرد لفظوں کا کھلاڑی ہوتا ہے اور آج کل محبت بہت سستی ہوتی ہے لڑکوں کو قیمتی تحائف دے کر یا پیسوں کا سہارا لے کر لڑکیوں کو پھانسنے کی ضرورت نہیں ہے۔ لڑکیاں جذبات کے معاملے میں ہمیشہ کمزور ثابت ہوتی ہیں مگر میں اپنی سبین کو کمزور دیکھنا نہیں چاہتا۔ اس لیے آج کے بعد نہ تو تم سدرہ سے کوئی تعلق رکھو گی، نہ ہی عشا کے بعد سیل اپنے پاس رکھ کر سوؤ گی، اوکے۔''

وہ اس کا دل کچلنا چاہتا تھا۔

سبین کو اس سے جان چھڑانا مشکل ہو گیا۔

''اوکے، اب کبھی تمہیں میرا سیل رات میں بزی نہیں ملے گا مگر میں پھر کہہ رہی ہوں، مجھے عام لڑکیوں کی طرح کبھی غلط مت سمجھنا۔''

الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے کے مصداق وہ خاصی برہمی سے کہتے ہوئے اس کے کمرے سے باہر نکل آئی۔

اگلے روز کالج سے واپسی پر اس نے سدرہ کو ساتھ لے جا کر نیو Sim خرید لی۔ حالاں کہ وہ اس سے دوستی ختم کر چکی تھی مگر ضرورت کے وقت گدھے کو باپ بنانے کی مثال پر پورا اترتے ہوئے اس نے اپنا مطلب نکال لیا۔ اس کے پوچھنے پر، اس نے یہی بتایا کہ کچھ رانگ کالز اسے تنگ کر رہی تھیں اس لیے Sim بدل لی۔

سردی دھیرے دھیرے بڑھ رہی تھی، لہٰذا اب سلمیٰ بیگم اوپر چھت کی بجائے نیچے کمرے میں سونے لگیں۔ سبین کی چارپائی بھی ان ہی کے کمرے میں ہوتی تھی جب کہ سنان شروع سے علیحدہ کمرے میں سوتا تھا۔ سبین کے لیے قدرت نے بڑی آسانی پیدا کر دی تھی۔ رات میں سب کاموں سے فارغ ہو کر جب وہ اپنے بستر پر آتی تو آرام سے Sim چینج کر لیتی اور

سنان یہ سمجھتا کہ وہ سچ مچ سیل آف کر کے سوتی ہے۔ اب سردیوں کی طویل راتیں ہوتیں اور وہ دونوں ہوتے۔

ردمان باری نے اس کے دماغ میں یہ بات ڈال دی تھی کہ ان کا فرضی نکاح ہو چکا ہے لہٰذا اب وہ ایک دوسرے سے کچھ بھی کہیں گناہ نہیں ہے۔ آج جن باتوں سے وہ اسے آگاہ کر رہا تھا۔ وہ باتیں اور معلومات اس جیسی سیدھی لڑکی کے لیے قطعی نئی اور قدرے دلچسپ تھیں۔ اوپر سے مسٹر اعوان کا انداز، پکا کھلاڑی ہونے کے باعث اسے موقع کی مناسبت سے اپنا لہجہ، آواز اور انداز سب بدلنا آتے تھے۔ اس روز سنان کے لیکچر کی وجہ سے وہ رات میں اس کے شروع ہونے سے پہلے ہی اس سے پوچھ بیٹھی۔

'' مانی، تمہیں، تمہاری مما کی قسم، سچ بتانا، تم مجھ سے فلرٹ تو نہیں کر رہے ناں؟''

وہ کس قدر سادہ تھی۔ ردمان باری دل ہی دل میں اس کی بیوقوفی پر خوب ہنسا۔ جیسے وہ اسے بتا ہی تو دیتا کہ ہاں میں تم سے فلرٹ کر رہا ہوں۔

''اوہ گاڈ، لگتا ہے تم سچ مچ مجھے پاگل کر دو گی، آخر کیسے یقین دلاؤں تمہیں کہ تم میرے لیے میری جان سے بڑھ کر ہو۔ کیا غرض ہے مجھے تم سے جو ہزاروں قسمیں کھا کر تمہیں اپنے ساتھ رابطہ رکھنے پر مجبور کرتا رہتا ہوں۔ اس شہر میں لڑکیوں کی کمی ہے کیا؟ کیا سمجھتی ہو تم مجھے، خدا کا واسطہ ہے مجھ پر شک نہ کیا کرو، ورنہ کسی دن تمہارا یہ شک میری جان لے لے گا۔'' اس کے لہجے میں کچھ ایسا تھا کہ وہ مچل اٹھی۔

''شٹ اپ، فضول بولنے کے لیے نہیں کہا میں نے۔ اپنی مما کی قسم کھا کر کہو کہ تم مجھ سے فلرٹ نہیں کر رہے۔''

''مما کی قسم میں تم سے فلرٹ نہیں کر رہا، یار بیسیوں لڑکیاں مرتی ہیں مجھ پر، کئی تو شادی کے لیے آخری حد تک جانے کو بے قرار ہیں مگر میرا تعلق تو صرف تم سے ہے۔ اسی لیے کبھی اپنے دوستوں سے بھی تمہارا ذکر نہیں کیا قسم سے۔ میں تمہاری ویسی ہی عزت کرتا ہوں، جیسی اپنے گھر میں اپنی ماں یا بہنوں کی کرتا ہوں۔ تمہاری خوشی اور محبت سے بڑھ کر میرے لیے کچھ بھی نہیں ہے۔''

اسپیکر آن کر کے وہ فہد کے سامنے بیٹھا زیر لب مسکرا رہا تھا۔ وہ اپنی سوچ پر ایک مرتبہ پھر شرمندہ ہو گئی۔

''سوری، اصل میں آج کل حالات ہی ایسے چل رہے ہیں کہ خوامخواہ شک کے ناگ ذہن کو گھیر لیتے ہیں۔''

''کوئی بات نہیں، یہ بتاؤ آج پکایا کیا ہے؟''

''آلو مٹر۔''

''مجھے مٹر بہت پسند ہیں، تم روٹیاں بناؤ، میں ابھی آتا ہوں۔''

''اوکے آ جاؤ۔''

دل کتنا ہلکا پھلکا ہو گیا تھا۔ وہ اپنی قسمت اور محبوب پر جتنا فخر کرتی کم تھا۔

''تھینک یو، اپنا بہت سارا خیال رکھنا اور پلیز میرے بارے میں کبھی بھی الٹا سیدھا سوچ کر اپنے آپ کو ہرٹ نہ کرنا۔ میں گندا ہوں، گندی نالی کا کیڑا ہوں مگر تم بہت اچھی ہو۔ اس لیے یہ مانی صرف تمہارا ہے اور زندگی کی آخری سانس تک تمہارا ہی رہے گا۔ اوکے، خدا حافظ۔''

اپنے مخصوص انداز میں بات ختم کرتے ہوئے اس نے کال ڈس کنکٹ کر دی تو اس نے موبائل سینے سے لگا کر دھیرے سے پلکیں موند لیں۔

''میں کسی فلم یا افسانے کی ہیروئن نہیں ہوں مگر پھر بھی تم میری زندگی کا سب سے خوب صورت احساس ہو مانی، میرے جیون کا سب سے خوبصورت باب ہو تم۔''

لڑکیاں سب ایک ہی کلاس سے ہوتی ہیں، ان میں کوئی خاص یا عام نہیں ہوتی۔ وہ خود کو خاص سمجھتی تھی مگر حقیقت میں خود بھی ایک عام سی لڑکی ہی ثابت ہوئی۔

☆......☆......☆

کالج میں آج کل سدرہ بے حد خوش دکھائی دے رہی تھی۔

روزانہ دوستوں کو اپنی اور فہد کی اخلاق سوز گھٹیا باتیں سناتے ہوئے اسے قطعی احساس نہیں ہوتا تھا کہ خود گڑھے میں گرنے کے ساتھ ساتھ وہ اپنی چٹخارے دار باتوں سے دوسروں کے ذہن بھی خراب کر رہی ہے۔ اس روز وہ گولڈ کا نازک سا بریسلٹ پہن کر آئی تو بطورِ خاص اسے دکھاتے ہوئے بولی۔

''سی، یہ بریسلٹ دیکھو، کیسا ہے، فہد نے میری برتھ ڈے پر گفٹ کیا ہے۔''

''اچھا ہے مگر میرے خیال سے تمہیں اتنا قیمتی گفٹ نہیں لینا چاہیے تھا۔''

ہم عورتوں کے ساتھ سب سے بڑی ٹریجڈی یہی ہے کہ ہم کسی دوسرے کو کچھ بھی با آسانی کہہ یا سمجھا سکتے ہیں مگر اپنے آپ کو سمجھانا بہت مشکل ہوتا ہے۔ اپنے دل سے لڑنا بہت دشوار ہوتا ہے۔ جن خدشات سے میں سدرہ کو منع کرتی تھی۔ ان سے خود باز نہیں آ رہی تھی۔ اپنا آپ سب کو صحیح لگتا ہے۔ اس نے اس کی نصیحت پر پھر منہ بنایا۔

''کیوں نہیں لینا چاہیے تھا۔ وہ میرا دوست ہے اور ماشاء اللہ ویل آف فیملی سے تعلق رکھتا ہے پھر میں کیوں دل توڑتی اس کا......؟''

وہ جواب میں کچھ نہیں کہہ سکی۔ تاہم اس کا اپنا دل ایسی نوازشات کے لیے قطعی رضامند نہیں تھا۔ کل رات کال کے دوران ـــــ ردمان نے اس سے کہا۔

''سی! اگر ہمارے گھر والے ہماری شادی کے لیے نہ مانے تو ہم کورٹ میرج کر لیں گے۔ تم دیکھنا، جب تم میری دلہن بنو گی ناں تو اپنے نصیب پر رشک کرو گی۔ میں تمہیں اتنا پیار کروں گا کہ آج تک کبھی کسی لڑکے نے کسی لڑکی سے نہ کیا ہو گا۔''

''اچھا پھر......؟'' دل سے ہنستے ہوئے اس نے پوچھا۔

''پھر بعد میں بتاؤں گا ایک بار ملو تو سہی سچی تمہیں دیکھنے کو بڑا دل کرتا ہے۔''

وہ اس سے اس کے گھر کا پتہ اور اس کے گھر والوں کی تفصیل پہلے ہی معلوم کر چکا تھا اب اگلا مرحلہ اس کو ملنے کے لیے تیار کرنے کا تھا جس میں اپنی کامیابی سے وہ ایک فیصد بھی مایوس نہیں تھا۔ تاہم وہ پھر ہچکچائی۔

''نہیں مانی۔ میرے لیے اکیلے گھر سے نکلنا بہت مشکل ہے۔''

''میں کچھ نہیں جانتا، میں تمہیں دیکھنا چاہتا ہوں بس۔''

کیوں دیکھنا چاہتے ہو اگر میں خوبصورت نہ ہوئی تو کیا تم مجھے چھوڑ دو گے؟''

''نہیں......میرے نزدیک ظاہری رنگ روپ کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔''

کتنی سنجیدگی کے ساتھ اس نے کہا تھا۔ وہ پھر اس پر نثار ہو گئی۔

''پلیز! ملو ناں، میں اب تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا۔ میں دیکھنا چاہتا ہوں اتنی پیاری پیاری باتیں کرنے والی لڑکی حقیقت میں کیسی دکھائی دیتی ہے۔ صرف ایک بار جانو، دوبارہ ضد نہیں کروں گا پلیز۔''

وہ منتوں پر اتر آیا۔ سبین کو اس کے لیے کچھ سوچنا پڑا کیونکہ اب اس کا اپنا دل بھی اسے دیکھنے کی چاہ کرنے لگا تھا۔

''اچھا......کل میں کزن کے ساتھ اپنی دوست کے گھر جاؤں گی۔ وہاں کزن مجھے چھوڑ آئے گا، پھر تم دیکھ لینا۔''

وہ معاملہ جو دوسری لڑکیوں کا سوچتے ہوئے اسے بے حد مشکل لگتا تھا، وہی معاملہ اب اپنے دل کی باری آئی تو اس کے لیے ایک منٹ میں آسان ہو گیا۔ اب وہ بھی دوسری عام لڑکیوں کی طرح صرف اپنے دل کی خوشی کے لیے اپنی والدہ کے اعتبار و اعتماد کا خون کرنے میں کوئی جھجک محسوس نہیں کر رہی تھی۔

ردمان یاری نے اسے سدرہ کے ساتھ دیکھ لیا تھا۔ سادہ سے کپڑوں میں ملبوس۔ اپنا چہرہ مکمل طور پر اسکارف میں چھپائے وہ مڈل کلاس گھرانے کی دوشیزہ اسے خاص متاثر نہیں کر

سکی تھی۔ معاملہ محض جیت کا نہ ہوتا تو شاید وہ اس پر اپنا مزید وقت برباد کیے بغیر اسے چھوڑ دیتا مگر مکمل جیت تک بازی اپنی گرفت میں رکھنے کے لیے اس نے سین کے حسن کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملا دیے۔

رات میں اپنے دوستوں کے بیچ بیٹھے ہوئے وہ اسپیکر آن کر کے خاصے مخمور لہجے میں اس سے کہہ رہا تھا۔

"تم بہت خوبصورت ہو۔ قسم سے تمہارے مقابلے میں تو پری بھی آسمان سے اتر آئے تو میں تم سے نگاہ نہ ہٹاؤں۔ چھوٹی سی موئی گڑیا لگی تھیں تم مجھے۔ میرا دوست ساتھ نہ ہوتا تو اسی وقت بانہوں میں اٹھا کر گھر لے آتا۔"

وہ اور بھی جانے کیا کیا کہہ رہا تھا۔ وہ اس کے لفظوں کی خوشبو میں مدہوش ہوتی اس رات بھی دیر تک اس کے ہاتھوں اپنا وقار لٹاتی رہی۔

☆......☆......☆

سنان کا ویزہ لگ گیا تھا اور آج کل وہ ملک سے باہر جانے کی تیاریوں میں مصروف اس کی حرکات پر ذرا کم ہی نظر رکھ رہا تھا۔ جانے سے قبل ہی سرسری طور پر اس نے سلمیٰ بیگم کے کانوں میں یہ بات ڈال دی تھی کہ وہ اب سین کے لیے پریشان رہنا چھوڑ دیں کیونکہ وہ اسے اپنانے کی خواہش رکھتا ہے۔ تاہم سین اس کی خواہش اور سلمیٰ بیگم کی خوشی سے قطعی بے خبر رومان باری ________ کی رفاقت کے خواب دیکھ رہی تھی۔ ابھی کل اس سے شام میں بات کرتے ہوئے وہ کہہ رہا تھا۔

"سبی، میری تم سے شادی ہو گئی ناں تو دیکھنا میں تمہیں بہت زیادہ خوش رکھوں گا۔ تمہیں کوئی کام نہیں کرنے دوں گا۔ خود برتن دھوؤں گا، بچے سنبھالوں گا۔ تمہارے ساتھ مل کر کھانا بھی بناؤں گا اور صفائی کرنے میں بھی مدد کیا کروں گا۔"

عام لڑکے بھلا ایسی باتیں کرتے تھے۔ وہ اپنی خوش بختی پر جتنا فخر کرتی کم تھا۔

"اچھا......اور جو سب سے مشکل کام کپڑے دھونے کا ہے وہ کون کرے گا۔"

"وہ ہم لانڈری سے دھلوا لیا کریں گے، کوئی پرابلم نہیں۔ تم بس بج سنور کر میرے سامنے بیٹھی رہا کرنا۔ میں شام میں تھک ہار کر گھر آؤں تو تمہیں دیکھ کر فریش ہو جایا کروں۔"

کتنے خوبصورت خواب سپرد کر رہا تھا وہ اس کے۔ وہ پاگل نہ ہوتی تو اور کیا کرتی۔

"اچھا......اگر تم یہ سب کام کرو گے تو پھر کاروبار کون سنبھالے گا؟"

"وہ بھی میں سنبھالوں گا یار، تمہیں خوشیاں دینے کے لیے تو کچھ بھی کروں گا۔"

اس لمحے وہ کہنا چاہتا تھا کہ تمہیں پھانسنے کے لیے تو جو کرنا پڑا کروں گا مگر...... کہہ نہیں

سکتا تھا۔ وہ اتنے ڈیشنگ شخص کی ایسی والہانہ محبت پر سو سو بار قربان ہونے کو تیار تھی۔

☆......☆......☆

"اگر تم سمجھتی ہو کہ میں تمہاری موجودہ سرگرمیوں سے بے خبر ہوں تو تم بہت بڑی غلطی پر ہو۔ یاد رکھو تم اپنی عاقبت نااندیشی کے باعث تباہی کے جس گڑھے کی طرف بڑھنا چاہتی ہو، وہ تم سے پہلے نجانے کتنی لڑکیوں کو ہڑپ کر چکا ہے۔ سنہرے خواب صرف سوچنے میں اچھے لگتے ہیں، حقیقت میں نہیں۔ تم چاہے جتنا بھی ہرٹ کرو مجھے، میں تمہیں اس غلط راستے کی طرف کسی صورت میں بھٹکنے نہیں دوں گا۔"

"میں کسی غلط راستے کی طرف نہیں بڑھ رہی۔ بس میرا انتخاب تم نہیں ہو۔"

"اوکے......اگر تم میرے ساتھ خوش نہیں رہ سکتیں تو میں ہرگز تمہارے ساتھ زبردستی نہیں کروں گا مگر......یاد رکھنا، اب میں پلٹ کر اسی وقت واپس آؤں گا جب تمہیں میری ضرورت ہوگی، سمجھیں۔ اب جاؤ یہاں سے۔"

وہ بے حد دل برداشتہ ہو گیا مگر سین نے پروا نہیں کی۔ الٹا اسے اپنے راستے سے ایک کانٹا نکل جانے پر عجیب سی خوشی محسوس ہو رہی تھی۔

"اور سنو......"

وہ ابھی دہلیز تک پہنچی تھی، جب اس نے پھر سے پکار لیا۔

"اگر واقعی تم اس لڑکے کے لیے سیریس ہو تو اسے کہو فوراً اپنے والدین کو یہاں بھیجے۔ میں اپنا جانا ملتوی کر کے خود اپنی موجودگی میں تمہیں اس کے ساتھ رخصت کروں گا۔"

اس کی آنکھوں میں ضبط کی سرخی تھی۔ ٹراؤزر کی پاکٹس میں ہاتھ پھنسائے جانے کس دل سے اس نے کہا تھا۔ جب وہ سر جھکا کر دھیمے لہجے میں بولی۔

"ابھی وہ ایسا نہیں کر سکتا۔"

"کیوں......؟" سنان کو اپنا خدشہ فوری طور پر درست ثابت ہونے پر شدید دھچکا لگا۔

"کیوں کہ ابھی وہ مجبور ہے۔"

"ہاں، مرد اور مجبور...... مائینڈ یو میم، مرد محبت کے معاملے میں کبھی مجبور نہیں ہوتا۔ وہ جسے پانا چاہتا ہے اسے ہر صورت پا کر رہتا ہے۔ خواہ اس کے لیے اسے کیسا ہی راستہ کیوں نہ اختیار کرنا پڑے۔ البتہ جس سے صرف دل بہلانا مقصود ہوتا ہے اسے وہ ہزار فرضی کہانیاں سنا کر جان چھڑا سکتا ہے۔"

"تم کہہ سکتے ہو مگر وہ ایسا نہیں ہے۔ وہ صرف مجھ سے محبت کرتا ہے۔"

"بس......یہی خوش فہمی تو مار دیتی ہے تم عورتوں کو، تمہیں کیا پتہ۔ فل ڈے۔ فل

نائیٹ۔ وہ تمہیں الو بنانے کے علاوہ اور کیا کیا کرتا ہوگا۔ جو باتیں وہ تم سے کرتا ہے۔ وہی باتیں رات بھر جانے اور کس کس لڑکی سے کرتا ہوگا۔"

"تم غلط سوچ رہے ہو۔ مانی ایسا نہیں ہے۔ وہ بہت ڈرتا ہے اپنے گھر والوں سے، اپنی عزت اور کردار بہت عزیز ہے اسے۔"

کسی دوسرے شخص کے لیے اس کا اس درجہ فریفتہ انداز دیکھ کر سنان کے اندر تک گہرے درد کی ٹیس سرائیت کرگئی۔ تاہم اس نے اس کے سامنے اپنے درد کا ڈھنڈورا نہیں پیٹا۔

"بہت خوب، وہ مرد ہوکر اپنے گھر والوں سے ڈرتا ہے۔ اپنی عزت اور کردار کا پرچم بلند رکھتا ہے اور تم عورت ہوکر بھی اپنی رسوائی خود کر رہی ہو۔ اس شخص کے لیے جس سے کھل کر تم سے محبت کا اعتراف کر لینے کی جرأت بھی نہیں ہے۔ ہاؤ امیزنگ دس۔"

"ایسی بات نہیں ہے، اصل میں اس کے اور ہمارے گھر کے ماحول میں بہت فرق ہے۔ وہ اپنے والدین کو اپنی وجہ سے کوئی تکلیف دینا نہیں چاہتا۔ اس کے والد پہلے ہی شک کرتے ہیں اس پر۔ اکثر رات میں اور صبح کو جب وہ سویا ہوا ہوتا ہے تو اس کا سیل چیک کرتے ہیں۔ اس کا بڑا بھائی رات گئے اس کے سیل پر بیل دے کر چیک کرتا رہتا ہے کہ کہیں اس کا نمبر مصروف تو نہیں جا رہا۔ اسی لیے اس نے آج کل رات میں اپنا سیل آف رکھنا شروع کر دیا ہے۔"

اس کا خیال تھا کہ جو باتیں وہ جانتی ہے وہ باتیں سنان نہیں جانتا۔ اسی لیے رومان بادی کے بارے میں غلط سوچ رہا ہے مگر وہ اس کے منہ سے تمام وضاحتیں سن کر بھی اس کی بیوقوفی پر محض کڑھ رہا تھا۔

"کتنی عجیب بات ہے ناں۔ جس لڑکے کے کردار پر اس کے جنم دینے والے والدین مطمئن نہیں ہیں اس کی اندھی محبت نے تمہیں بنا دیکھے، بنا سمجھے اعتبار میں جکڑ لیا ہے۔ کتنی بیوقوف ہو تم۔ دنیا کو محض اپنی نگاہ سے دیکھتی ہو۔ اب دنیا ایسے اعتبار کے قابل نہیں رہی ہے۔ اسے جب تک تمہاری ضرورت ہے وہ تم سے دل بہلا رہا ہے۔ جب تم سے دل بیزار ہو جائے گا تو Sim بدل لے گا اور پھر اس بدلے ہوئے دوسرے نمبر سے وہ جس کو جتنی دیر چاہے کال کرے۔ ایسے لڑکوں کے پاس موبائل فون Sim اور گرل فرینڈز کی کمی نہیں ہوتی مگر تم یہ بات ابھی نہیں سمجھوگی۔ یہ عورت کی ذات کے ساتھ بہت بڑا المیہ ہے۔ وہ جب تک ذاتی طور پر ٹھوکر نہیں کھاتی، نہیں سنبھلتی۔" وہ زچ ہو کر رخ پھیر گیا تھا۔ سین الجھے اعصاب کے ساتھ اس سے مزید الجھے بغیر چپ چاپ کمرے سے باہر نکل آئی۔ اس روز رات میں اس

نے سچ مچ اپنا سیل آف رکھا تھا۔

اگلے روز رخصتی سے قبل سنان نے صرف چند لمحوں کے لیے کچن میں اس کے پاس رک کر گہری نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا پھر قدرے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔

"میری بات یاد رکھنا سی۔ اب میرے قدم پاکستان کی زمین کو اسی روز چھوئیں گے جب تم مجھے آواز دو گی۔ بصورت دیگر میں اپنی لاش کو بھی وہیں دفن کرنے کی وصیت کر کے مروں گا۔" اپنی بات مکمل کر کے وہ وہاں نہیں ٹھہرا۔

☆......☆......☆

وہ چلا گیا مگر سین کو نہ اس کے ہونے سے کوئی فرق پڑتا تھا، نہ ہی اس کے جانے پر وہ ملول ہوئی۔ کوئی شخص خواہ وہ کتنا ہی اچھا، ہمارے لیے کتنا ہی ضروری کیوں نہ ہو اگر ہمارے دل میں اس کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے تو پھر ہمیں اپنی زندگی میں اس کے ہونے نہ ہونے سے بھی کوئی خاص فرق نہیں پڑتا۔ اس کی تمام سوچوں اور خوابوں کا مرکز اب بھی رومان بادی کی ذات تھی۔ اس نے طے کر لیا تھا کہ اگر وہ رومان بادی کی ہمسفر نہ بن سکی تو زندگی میں کسی اور کا ہاتھ بھی کبھی نہیں تھامے گی۔ مگر مسئلہ یہ تھا کہ اس موضوع پر خود اعوان سے بات کرتے ہوئے اس کی نسوانیت اور خودداری کا خون ہوتا تھا۔ اب تک اس نے مسٹر رومان سے اپنے لیے ایک روپے کا بیلنس بھی نہیں لیا تھا۔ تاہم اس کے لیے اس کا بس نہ چلتا تھا کہ اپنی ہستی وار کر اس کے قدموں میں ڈال دے۔

اب تک وہ اسے قیمتی کتابیں، پرفیوم، یہاں تک کہ موبائل بھی تحفتاً اس کے دیے گئے پتے پر ارسال کر چکی تھی مگر وہ ایسا بے ضمیر تھا کہ جواب میں محبت سے شکریہ تک کہنے کی ضرورت بھی محسوس نہ کرتا۔ وہ محسوس کر رہی تھی کہ پچھلے چند دنوں سے اس کا معمول خاصا بدل گیا تھا۔

ہر روز رات میں دیر تک اس سے بات کر کے سونے والا رومان بادی اب شام ڈھلے ہی اپنا سیل آف کر دیتا یا اگر سیل آن ہوتا تو کال ہی پک نہ کرتا۔ دن میں اس کی مصروفیات بھی بڑھ گئی تھیں۔ اس نے اندر ہی اندر کڑھتے ہوئے شدید ہرٹ ہو کر اس سے گلہ کیا تو اس نے بڑی سنجیدگی سے عذر تراش دیا۔

"سی...... بڑا بھائی ناراض ہو کر گھر سے چلا گیا ہے، اس نے اپنی مرضی کی لڑکی سے شادی کر لی ہے۔ امی ابو بہت دکھی اور پریشان ہیں۔ دادی اماں کی وفات کے بعد دادا جی کے پاس رہنے والا بھی کوئی نہیں۔ دن بھر کام میں مصروف رہتا ہوں۔ شام میں امی ابو کے پاس کچھ وقت گزار کر بابا کے پاس چلا جاتا ہوں۔ وہ رات بھر نہیں سوتے۔ اس لیے تم سے بات نہیں کر سکتا، پلیز شک نہ کرنا۔"

"نہیں کرتی شک لیکن تم سونے سے پہلے میسج تو کر سکتے ہو۔"

مکمل وضاحت سن کر بھی اس کے دل نے اپنے محبوب کی مجبوریوں سے سمجھوتہ نہیں کیا۔

جانے کیوں پچھلے کئی روز سے ایک وہم اسے اندر سے پریشان کیے ہوئے تھا کہ اس کے اور ردمان بادی کے درمیان کہیں پر کچھ غلط ضرور ہے۔ اسے یاد آ رہا تھا۔ ابھی پچھلے دنوں وہ اس کے فون کو یکسر اگنور کرنے پر اس سے خفا ہوئی تھی تو اس نے اپنے ریگولر نمبر سے اسے کئی کئی کالز کی تھیں مگر اس نے پک نہیں کیں۔ تب اس نے اپنے کسی دوست کے نمبر سے کالز کرنے کے بعد رخسانہ نام سے میسج چھوڑ دیا۔ سین نے عصر کی نماز سے فارغ ہو کر سیل دیکھا تو رخسانہ نام سے میسج دیکھنے کو ملا۔ وہ سمجھی کہ میسج اس کی کالج فرینڈ رخسانہ کا ہے۔ لہذا فوراً کال بیک کر دی مگر دوسرے طرف فون کسی لڑکے نے اٹھایا اور اس سے رخسانہ سے متعلق پوچھنے پر اسے بتایا کہ ابھی تھوڑی دیر قبل اس کے نمبر سے اس کا دوست سے کال کرنے کی کوشش کرتا رہا ہے۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ وہ اس کا تذکرہ ہر شام اپنے دوستوں کی محفل میں بڑے دلچسپ انداز میں کرتا ہے۔ سین کے لیے یہ بات کسی طور قابل برداشت نہیں تھی۔ لہذا وہ ردمان کو کال کر کے اس سے الجھ پڑی مگر دوسری طرف دھوکہ دہی کی دنیا کا بادشاہ وہ شخص اسے پھر یہ کہہ کر چکر دے گیا کہ اس کا دوست بکواس کرتا ہے۔ مزید یہ بھی کہ اس نے فضول گوئی پر اپنے دوست کی بہت انسلٹ بھی کی ہے اور اس سے رابطہ بھی منقطع کر دیا ہے مگر حقیقت میں اس نے ایسا کچھ بھی نہیں کیا تھا۔

اس وقت بھی وہ اس سے کہہ رہا تھا۔

"آج کل کام کی زیادتی کی وجہ سے میں بہت تھک جاتا ہوں۔ اسی لیے رات میں جلدی سو جاتا ہوں۔ تم چھوٹی چھوٹی باتوں کو محسوس کر کے دل پر نہ لیا کرو۔"

"ٹھیک ہے۔"

اسے ہر بات کی وضاحت کرنی آتی تھی۔ سین کا الجھا دماغ اس کے لیے پھر صاف ہو گیا۔ یہ ٹھیک تھا کہ وہ ردمان بادی کے بارے میں اب تک خود سے کچھ بھی نہیں جانتی تھی جو کچھ اور جتنا کچھ اب تک اس نے بتایا تھا اسے وہی معلوم تھا۔ وہ جھوٹ بھی بول سکتا تھا۔ وہ جانتی تھی مگر اس کے باوجود اس نے اپنی محبت پر اندھا اعتماد کیا کہ اس کے نزدیک اس کی محبت بے لوث اور بے غرض تھی۔ اسے ردمان بادی سے سوائے سچی محبت کے اور کچھ بھی نہیں چاہیے تھا پھر وہ اسے دکھ دینے کا کیسے سوچ سکتا تھا۔ یہ اس کی سوچ تھی مگر وہ بے وقوف نہیں جانتی تھی کہ انٹرنیٹ اور موبائل کے موجودہ دور میں محبت کا معیار بھی بدل گیا ہے اب لوگ دلی خلوص اور روحانی سادگی کی جگہ بلند اسٹیٹس اور ظاہری رنگ و روپ کو زیادہ اہمیت دیتے

ہیں۔ اسے اپنے حصے کی ٹھوکر ابھی کھانی تھی۔

اس روز موسم بہت خوبصورت ہو رہا تھا۔

اس نے ردمان بادی کو بتایا کہ اسے بارش اور دھند بہت پسند ہے۔ یہ موسم اس کی اندر کی دنیا میں ہلچل مچاتا ہے اور آج کل بارشوں نے جیسے زمین کا راستہ دیکھ لیا تھا۔

شام ہوتے ہی زمین کی پیاس بجھاتی تیز بارش کی سرد بوندوں کو ٹپ ٹپ برستے دیکھ کر شدت سے اس کا دل چاہتا کہ ردمان بادی اسے کال کرے۔ پہلے کی طرح گھنٹوں سارے عالم سے بے نیاز ہو کر اس سے باتیں کرے۔ اس سے اپنے مسائل شیئر کرے مگر...... اسے آج اس سے بات کرنے کی فرصت ہی کہاں تھی۔

دن بھر اس کے لیے بے قرار رہنے والا شخص اب دن میں ایک دو بار میسج بھی مشکل سے کر پاتا۔ سین کے لیے اس کی یہ تبدیلی بہت زیادہ اذیت کا سبب بنتی تھی مگر...... زبردستی کسی کی زندگی میں اپنا مقام بنانا اسے اپنی خودداری کی موت کے مترادف لگتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ بنا اس سے کوئی گلہ کیے موم بتی کی مانند چپ چاپ جلنا شروع ہو گئی۔

اس روز بہت دنوں کے بعد شاید خود سے بھی اکتا کر وہ ماہ رخ کی طرف چلی گئی۔ کالج میں آج کل پڑھائی نہ ہونے کے برابر ہو رہی تھی۔ لہذا پچھلے ایک ہفتے سے وہ چھٹی پر تھی جس کی وجہ سے ردمان بادی کی بے نیازی اور بھی زیادہ محسوس ہونا شروع ہو گئی تھی۔

ماہ رخ کے گھر کا خوبصورت لان عبور کرنے کے بعد وہ لاؤنج میں آئی تو پتہ چلا کہ اس کی مما گھر پر نہیں ہیں۔ تب ملازمہ سے ماہ رخ کا پوچھ کر وہ دبے پاؤں اسے سرپرائز دینے کے چکر میں اس کے کمرے کی طرف چلی آئی۔

کمرے کا دروازہ لاک نہیں تھا جب کہ اندر سے اس کی کسی سے فون پر بات کرنے کی خاصی صاف آواز بھی باہر آ رہی تھی۔ وہ جوں ہی ادھ کھلے دروازے کے قریب آئی اندر کمرے میں نگاہوں کے بالکل سامنے چلتے سین نے اسے دہلیز پر ہی ساکت کر دیا۔

اس وقت نگاہوں کے سامنے پہلی بار جو منظر اسے دیکھنے کو مل رہا تھا۔ وہ اس کے ہوش و حواس اڑا دینے کے لیے کافی تھا۔

☆......☆......☆

کچھ اندھیرا بھی ضروری ہے غم یار کے ساتھ
اب دیا کوئی نہ رکھ' میری دیوار کے ساتھ
میں جو ایک عمر مسافت میں رہا، تو جانا
وہ بھی چلتی رہی ہے، میری رفاقت کے ساتھ

ساکت نگاہوں کے ساتھ وہ ماہ رخ کے کمرے کی دہلیز پر بت بنی کھڑی تھی۔ سامنے کمپیوٹر کی اسکرین پر جو منظر چل رہا تھا اسے دیکھ کر وہ گویا اپنے ہلنے جلنے کی صلاحیت بھی کھو چکی تھی۔ ماہ اس حد تک ''آزاد'' ہوگی۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ اس کی ٹانگیں غیر محسوس طریقے سے کپکپا رہی تھیں۔ وہ واقعی اس کی سوچ سے زیادہ ایڈوانس تھی۔ جب کہ سبین کو ایسی چیزوں کا پتہ ہی نہیں تھا۔ اس روز وہ اس سے ملے بغیر واپس آگئی۔ رات میں مسٹر باری کی کال آئی تو اس نے اسے بھی ماہ رخ کی اس تازہ حرکت کے بارے میں بتایا۔ جواب میں وہ اپنے اسٹائل سے ہنستے ہوئے اس کا مذاق اڑاتے ہوئے بولا۔

''آج کل یہ سب عام ہے، ایک تم ہی بابا آدم کے زمانے کی روح ہو۔ کیا کیا جائے تمہارا؟''

''کیا تم بھی ایسی موویز دیکھتے ہو؟'' اسے جواب دینے کی بجائے وہ الٹا اسی سے پوچھ بیٹھی۔ جواب میں وہ ہنس پڑا۔

''نہیں۔ میں نہیں دیکھتا۔''

''بکواس کرتے ہو تم، رات میں جو تم اتنی گھٹیا گفتگو کرتے ہو، وہ ایسے ہی تو نہیں پتہ......'' اس کے تپ جانے پر وہ پھر کھل کر ہنسا۔

''کیا گھٹیا گفتگو کرتا ہوں......؟'' اب وہ اس کی شرم کا لطف لے رہا تھا۔ وہ خود سے نظریں چرا کر رہ گئی۔

''مجھے نہیں پتہ۔ خبردار جو آج کے بعد کبھی لیٹ نائٹ کال کی تو۔''

''جو چاہو قسم لے لو میں تمہارے سوا کسی لڑکی سے بات نہیں کرتا، نہ میری زندگی میں تمہاری جگہ کوئی دوسری لڑکی لے سکتی ہے۔''

''بس رہنے دو، اسی قسم کے ڈائیلاگ بول کر سیدھی سادی لڑکیوں کو بے وقوف بناتے ہو......''

''نہیں سبی اگر میری زندگی میں تمہارے سوا کوئی دوسری لڑکی ہو تو خدا کرے مجھے ابھی موت آجائے۔ میرے پاس تو دوسرا سیل بھی نہیں ہے۔'' وہ جذباتیت سے بولا۔ وہ احساس تفاخر سے مسکراتے ہوئے بول اٹھی۔

''اچھا ٹھیک ہے، کتنی بار کہا ہے فضول مت بولا کرو۔ یاد رکھنا جس دن تمہاری زندگی میں کوئی دوسری لڑکی آئی اس دن میں خود اپنے ہاتھوں سے تمہاری جان لے لوں گی۔''

''ٹھیک ہے لے لینا جان، دل تو پہلے ہی تمہارا ہے، جان بھی لے لینا۔''

اس کا انداز ہمیشہ فدا ہونے والا ہوتا تھا۔ اس نے حسب عادت اسے تڑپاتے ہوئے

اگلے ہی پل خدا حافظ کہہ کر کال کاٹ دی۔ اگلے روز یوں ہی فارغ بیٹھے مسٹر باری کا پیار آزمانے کے لیے اس کے دماغ میں ایک ترکیب آئی اور اس نے اپنی سوچ پر خود ہی ہنستے ہوئے اپنا موبائل آف کر دیا۔ پورے دن اس نے اپنا موبائل آف ہی رکھا۔ شام میں جیسے ہی آن کیا۔ حسب توقع مسٹر باری کے کئی میسج ایک ساتھ آگئے۔ ہر میسج میں فکرمندی اور بے تابی تھی۔ ابھی وہ اس کے میسج پڑھ رہی تھی کہ اس کی کال آنا شروع ہوگئی مگر اس نے جان بوجھ کر پک نہیں کی۔ پوری رات وہ منٹ منٹ بعد کال کرتا رہا اور سبین اس کی بے قراری کا لطف لیتے ہوئے سکون سے سوتی رہی۔ اگلی صبح سلمیٰ بیگم اور حفیظ صاحب کو ناشتہ دینے کے بعد وہ اپنا ناشتہ لے کر ابھی کمرے میں آئی تھی کہ پھر اس کی کال آگئی۔ اس بار وہ مزید ضبط کا مظاہرہ نہ کر سکی لہٰذا مسکراتے ہوئے کال پک کر لی۔ دوسری طرف وہ بے حد پریشان تھا۔

''تم رات سے میری کال پک کیوں نہیں کر رہیں؟''

''کل بہت سارے مہمان گھر میں آئے ہوئے تھے اس لیے پک نہیں کر سکی۔''

''مہمان کیوں آئے تھے؟'' اس کے لہجے میں مزید اضطراب تھا۔ جواباً وہ پھر دل ہی دل میں مسکرا دی۔

''میری شادی کی ڈیٹ فکس ہوگئی ہے باری۔ آج کے بعد میں اپنے سارے نمبر آف کر رہی ہوں۔ پلیز تم مجھ سے وعدہ کرو اپنا بہت خیال رکھو گے۔ کبھی اداس نہیں ہوگے۔''

''آج......آج ہی......؟'' دوسری طرف اس کے اعصاب کو یقیناً دھچکا لگا۔ اس کو بے حد لطف آیا۔

''ہاں۔''

''کیا ڈیٹ فکس ہوئی ہے......؟''

''پتہ نہیں، میں نے نہیں پوچھا۔''

''تم جھوٹ بول رہی ہو، صرف مجھے تنگ کرنے کے لیے کہہ رہی ہو۔ مجھ سے جان چھڑانا چاہتی ہو۔''

وہ اس کی شرارت پر یقین نہیں کر رہا تھا۔ اس کی آنکھیں اس کی محبت اور جدائی کے محض تصور سے بھر آئیں۔

''نہیں، میں جھوٹ نہیں بول رہی۔''

''او کے، میں تھوڑی دیر بعد کہیں بیٹھ کے کال کرتا ہوں، پلیز نمبر بند نہیں کرنا۔'' اس کا لہجہ بے حد غمگین ہوگیا تھا۔ اس کو اس پر ترس کے ساتھ ساتھ بے حد پیار آیا۔ وہ کتنی آسانی سے اس کے ہاتھوں بے وقوف بن گیا تھا۔ دوپہر کے قریب اس کا میسج آیا۔

''سی میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا۔ میرا سر درد سے پھٹ رہا ہے۔ سارے کام غلط ہو رہے ہیں، کسی چیز میں دل نہیں لگ رہا، میں تمہیں کسی کے ساتھ شیئر نہیں کر سکتا، آئی لو یو۔''

اس کا لکھا ہوا ایک ایک لفظ سین کے لیے آکسیجن کا کام دے رہا تھا۔ لہٰذا میسج پڑھ کر وہ موبائل سینے سے لگائے ہوئے مسکرادی۔ رات میں معمول کے عین مطابق بہت لیٹ اس کی کال آئی۔ اس نے رضائی میں منہ چھپا کر کال پک کی۔

''ہیلو......''

مسٹر باری کی طرف سے خاموشی تھی۔ گاڑیوں کا شور تھا۔ لہٰذا اسے خود ہی گفتگو کا آغاز کرنا پڑا مگر وہ پھر بھی نہ بولا۔ اس نے کافی اصرار کیا تب کہیں جا کر اس کی آواز سنائی دی۔

''ہاں بولو۔'' بجھی بجھی بے حد بوجھل آواز اس کا دل پگھلنے لگا۔

''کیا ہوا تم بات کیوں نہیں کر رہے اور اس وقت ہو کہاں......؟''

''روڈ پر بیٹھا ہوں گھر جانے کو دل نہیں چاہ رہا۔''

''کیوں دل نہیں چاہ رہا، ہوا کیا ہے......؟''

''پتہ نہیں کیا ہو گیا ہے......'' کتنا اچھا لگ رہا تھا اسے اپنے لیے ملول ہوتے۔ اس کا دل پسیج گیا۔

''باری سوری، میں نے صبح تم سے جھوٹ بولا تھا۔ میری کہیں شادی نہیں ہو رہی، نہ ہی تمہارے سوا کسی اور کے ساتھ ہو سکے گی۔ پلیز مجھے معاف کر دو۔ میں تمہیں اداس نہیں دیکھ سکتی۔''

یہ حقیقت بھی تھی۔ وہ محبت میں اس مقام تک آ گئی تھی جہاں محبوب کے کانٹا چبھنا بھی گوارا نہیں ہوتا۔ احسان باری نے اس کی بات کا یقین نہیں کیا۔ اس کے اپنے گھر میں بڑی بہن کی شادی کی تاریخ مقرر کی جا رہی تھی اور اس سلسلے میں مہمان آئے تھے مگر اسے ان کی پروا نہیں تھی۔ اس وقت مجنوں بنا وہ صرف اپنے غم سے لڑ رہا تھا۔

''باری! تمہارے گھر مہمان کیوں آئے ہیں......؟''

اس کی خاموشی پر اسے مزید تنگ کرتے ہوئے اس نے پوچھا تو وہ اس پر دل کا غبار نکالے بغیر نہ رہ سکا۔

''مجھے کیا پتہ کیوں آئے ہیں، پوچھ کر آتا ہوں ان سے کیوں آئے ہیں پھر کہوں گا جاؤ اپنے گھروں کو۔ ہمارے گھر نہ آنا۔''

وہ اس کے تپ جانے پر ہنس پڑی۔

''میرا غصہ بے چارے مہمانوں پر کیوں نکالو گے؟ ویسے تم غصے میں بہت پیارے لگتے ہو۔''

''فضول بکواس سننے کا موڈ نہیں ہے میرا۔'' وہ واقعی بہت اپ سیٹ لگ رہا تھا۔ وہ اس کی محبت سے ہار گئی۔

''پلیز معاف کر دو باری، دوبارہ ایسا مذاق نہیں کروں گی۔ میں تو صرف تمہاری محبت کی سچائی کا امتحان لے رہی تھی۔ پلیز گھر چلے جاؤ اور کھانا کھا لو، پلیز۔'' وہ جانتی تھی اگر اس نے اب بھی اسے سچ نہ بتایا تو وہ ساری رات نہیں سو پائے گا اور اس کی بے آرامی وہ کیسے گوارا کر سکتی تھی۔ سو اپنی محبت کے امتحان کا جلد ڈراپ سین کر دیا اگر ایسا نہ کرتی تو شاید بڑے نقصان سے بچ جاتی۔

اس روز بہت دنوں کے بعد پھر ماہ رخ آفندی کی طرف آئی تھی۔ وہ لان میں بیٹھی موسم سرما کی دھوپ کھاتے ہوئے چائے پی رہی تھی۔ جب سین بھی چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی اسی کی طرف بڑھ آئی۔

''السلام علیکم۔''

''وعلیکم السلام۔ بہت دنوں کے بعد شکل دکھائی ہے خیریت تو تھی ناں۔؟''

وہ اسے دیکھ کر کھل اٹھی تھی۔ سین چپ چاپ اس کے سامنے کین کی چیئر گھسیٹتے ہوئے بیٹھ گئی۔

''چند روز پہلے بھی آئی تھی میں مگر تم مصروف تھیں، انتہائی شرمناک مووی دیکھنے میں۔ اسی لیے واپس پلٹ گئی تھی۔'' ماہ رخ اس کی اطلاع پر کھسیانے سے انداز میں مسکرائی۔

''پلٹ کیوں گئیں، تم بھی ساتھ بیٹھ کر انجوائے کرتیں۔''

''میں لعنت بھیجتی ہوں ایسی انجوائمنٹ پر۔'' اسے برا لگا۔ ماہ رخ کھل کر ہنس پڑی۔

''تم بہت مختلف ہو یار، موجودہ دور کی پیداوار تو لگتی ہی نہیں ہو۔ بھئی انجوائے کیا کرو، چار دن کی زندگی ہے۔''

''چار دن کی زندگی خدا نے اس لیے تو نہیں دی کہ آخرت کی دائمی زندگی کو خود اپنے ہاتھوں برباد کر لیا جائے۔''

''نہیں برباد ہوتی آخرت کی زندگی۔ اللہ بڑا مہربان، معاف کرنے والا ہے۔'' اس کے انداز میں حد درجہ بے نیازی تھی۔ وہ خاموشی سے اس کا چہرہ دیکھتی رہ گئی۔

''ایک سوال پوچھوں، سچ سچ جواب دو گی؟'' چند لمحوں کی خاموشی کے بعد اسے چائے کا کپ تھماتے ہوئے وہ پھر بولی۔ اس نے آہستہ سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''تمہارا کوئی بوائے فرینڈ ہے؟'' کیسا غیر متوقع سوال پوچھا تھا اس نے۔ سین کے حلق میں چائے کا گھونٹ اٹک گیا۔

"نہیں میں لڑکوں کی دوستی کی قائل نہیں ہوں البتہ محبت الگ چیز ہے۔"

"تو تم محبت کرتی ہو کسی سے، ہے ناں؟"

"ہاں۔" پتہ نہیں وہ اس سے کیا جاننا چاہ رہی تھی۔ وہ اس لمحے جانے کیوں اس سے سچ چھپا نہ سکی۔ شاید اس لیے کہ جھوٹ بولنا اس کی فطرت میں نہیں تھا۔

"ویل......کون ہے وہ......؟"

"پتہ نہیں، موبائل فون پر دوستی ہوئی تھی۔ جو بڑھتے بڑھتے کب محبت میں بدل گئی پتہ ہی نہیں چلا۔ تم مردوں کے خلاف اپنے دل میں جتنا زہر رکھتی ہو، کبھی میں اس سے بڑھ کر بدگمانی کا شکار تھی لیکن......رومان باری نے میری زندگی بدل دی ہے ماہ۔ اس میں آج کل کے عام لڑکوں جیسی کوئی بات ہی نہیں۔ وہ اتنا سادہ اور معصوم ہے کہ حد نہیں۔ میرے ذہن میں پسندیدہ ہمسفر کا جو خاکہ تھا وہ اس خاکے پر پورا اترتا ہے۔" رومان باری کے بارے میں بات کرتے ہوئے اس کی خوبصورت آنکھوں میں جیسے جگنو اتر آئے تھے۔ ماہ رخ نے اس لمحے بڑے غور سے اس کا چہرہ دیکھا تھا۔

"پتہ ہے ماہ شروع میں جب اس نے مجھ سے رابطہ کیا تو میں اس کی بڑی انسلٹ کیا کرتی تھی مگر اس پر اثر نہیں ہوتا تھا۔ اس کی جگہ کوئی اور لڑکا ہوتا تو کیوں اتنی انسلٹ کروا کر بھی رابطے پر مصر رہتا۔ آج کل کوئی لڑکیوں کی کمی ہے؟ خود اسے دن بھر ہزاروں لڑکیاں تنگ کرتی ہیں مگر وہ کسی کو گھاس نہیں ڈالتا۔ اسے سوتے جاگتے بس میں ہی یاد رہتی ہوں۔ بزنس کے کاموں میں وہ بہت مصروف ہوتا ہے مگر پھر بھی میرے لیے کسی نہ کسی طرح ٹائم نکال لیتا ہے۔ ذمہ دار اتنا ہے کہ مثال نہیں۔ اب بھی جب مجھ سے بات کرتا ہے تو دومنٹ کے لیے ادھر اُدھر نہیں ہونے دیتا۔" وہ اسے یقین دلا دینا چاہتی تھی کہ محبت کے معاملے میں اس کی قسمت نے اس پر خاص مہربانی کی ہے۔ وہ اگر دوسری عام لڑکیوں جیسی نہیں تو اس کا محبوب بھی عام لڑکوں جیسا نہیں مگر ماہ رخ انسپائر نہیں ہوئی۔ وہ اب بھی خالی خالی نگاہیں اس کے شفاف چہرے پر جمائے جانے وہاں کیا کھوج رہی تھی۔

مجھ کو معصوم سی لڑکی پر ترس آتا ہے
اس کو دیکھو تو محبت میں مگن کیسی ہے

عجیب یاسیت بھرے انداز میں مسکراتے ہوئے اس نے شعر پڑھا تھا۔ سبین اسے دیکھ کر رہ گئی۔

"ماہی......کیا تمہارے ساتھ کوئی ٹریجڈی ہوئی ہے......؟" قطعی نادانستگی میں اس نے ماہ آفندی سے پوچھا۔ جب وہ زہرخند مسکراہٹ لبوں پر پھیلاتے ہوئے بولی۔

"صرف میرے ساتھ ہی کیا یار، یہاں ہر لڑکی کے ساتھ پتہ نہیں کیا کیا ہو رہا ہے۔ کھلونا بن کر ٹوٹ پھوٹ رہی ہیں ہم لڑکیاں ان مردوں کے ہاتھوں میں۔ شاید اسی لیے ان کی سوچ عورت کی ذات اور اس کے کردار کے بارے میں بہت رف ہوگئی ہے۔ لڑکی خواہ کتنی ہی اچھی کیوں نہ ہو یہ صرف اپنا دل بہلانے کو اس کے جذبات کی پرواہ کیے بغیر اسے کاغذ کی محبت کے سنہری خواب دکھا کر محبت کے آسمان پر بٹھا دیتے ہیں اور پھر جب ان کا دل بھر جاتا ہے، موسم بدل جاتے ہیں، تب اس سنگدلی سے تعلق کی سیڑھی کھینچتے ہیں کہ بندے کی روح تک چور چور ہو جاتی ہے پھر کیسا دین، کہاں کی دنیا......" اس کے لہجے میں افسردگی ٹپک رہی تھی۔ سبین اس بار خاموش نہ رہ سکی۔

"محبت میں ہر کسی کا اپنا اپنا نصیب ہے ماہ، اپنا اپنا تجربہ ہے مگر حقیقت یہی ہے کہ اب بھی حقیقی محبت کا وجود قائم ہے۔ وہ شخص جو میرے بارے میں زیادہ جانتا نہیں، جس نے مجھے قریب سے دیکھا نہیں، تم اس کی محبت، اس کی دیوانگی کا سوچ بھی نہیں سکتیں۔ ایک دن میں اس سے بات نہ کروں تو اسے بخار چڑھ جاتا ہے۔ کھانا پینا چھوڑ دیتا ہے۔ اس نے اپنے کسی دوست سے آج تک میرا ذکر نہیں کیا۔ اتنی عزت کرتا ہے۔ کیا مجھے ایسی محبت کی قدر نہیں کرنی چاہیے؟"

"پتہ نہیں یار، جو خود خارزار راستوں سے گزرا ہو وہ اپنے پیچھے آنے والوں کو چوکنا تو کرتا ہی ہے۔ ہوسکتا ہے تمہارا ہیرو واقعی بہت اچھا ہو مگر آج کل محبت نقاب در نقاب ہے۔ جب تک اس کا اصل چہرہ سامنے آتا ہے۔ انسان کی دسترس میں پچھتاوؤں کے سوا کچھ بھی نہیں رہتا۔"

"نہ رہے، جس کے بغیر جینا ممکن ہی نہیں وہ پھر برا ہو یا بھلا کیا فرق پڑتا ہے۔" اس نے بات ہی ختم کر دی تھی۔ ماہ رخ آفندی اس بار خاموش رہی۔ کہنے والے سچ کہتے ہیں۔ کسی بھی انسان کو اس وقت تک صحیح غلط کا پتہ نہیں چلتا جب تک اللہ کی ذات اسے ہدایت عطا نہیں کرتی۔ سبین احمد حسن کو بھی ابھی اللہ کی طرف سے ہدایت نصیب نہیں ہوئی تھی لہٰذا وہ اپنی محبت کے طلسم میں مدہوش تھی۔

☆......☆......☆

وہ گہری نیند سو رہا تھا جب فہد نے آ کر اسے جگا دیا۔

"کیا مصیبت ہے یار، اتنا اچھا خواب دیکھ رہا تھا۔" ادھ کھلی سرخ آنکھوں سے فہد کا چہرہ دیکھتے ہوئے وہ بڑبڑایا تو فہد بیڈ پر اس کے برابر میں بیٹھتے ہوئے ڈھٹائی سے مسکرا دیا۔

"خواب صنف نازک دیکھتی ہیں مرد نہیں۔ شرافت سے اٹھو اور مجھے اس مصباح بی بی

کا احوال سنا۔''

''کون مصباح بی بی یار......؟'' اب کے پوری آنکھیں کھول کر وہ تکیے کے سہارے اٹھ بیٹھا۔

''زیادہ فنکار بننے کی ضرورت نہیں، اسی مصباح بی بی کی بات کر رہا ہوں جسے تو گڑیا کہتا ہے اور آج کل پچاس پچاس چکر لگا رہا ہے اس کے پیچھے۔''

وہ کل ہی دبئی سے آیا تھا اور آتے ہی بلال ـــــ نے جو مسٹر باری کا قریبی دوست تھا اسے اس کے تازہ عشق کی سرگرمیوں کے بارے میں آگاہ کر دیا۔ تبھی وہ ڈھٹائی سے مسکرایا۔

''پورے خبیث ہو تم لوگ کسی معاملے کو پوشیدہ نہیں رہنے دیتے۔''

''مانتے ہو ناں بیٹا، ہم تیرے والد صاحب نہیں ہیں جن کو تم چکر دے کر کچھ بھی کرتے پھرو اور ان کو بھنک تک نہ پڑے۔ ہم تو یار ہیں تیرے چل بتا، کیوں پاگل ہو رہا ہے اس نئی محترمہ کے لیے تو......؟''

''یار پہلی دفعہ تو پاگل نہیں ہو رہا......'' تکیہ بانہوں میں دبا کر پہلو تہی برتتے ہوئے وہ دھیمے سے مسکرایا تو فہد بھی ہنستے ہوئے بولا۔

''ہاں معلوم ہے مجھے لیکن ابھی پچھلی محبوبہ سے تیرا افیئر ختم نہیں ہوا ہے اسے پتہ چل گیا تو......''

''اسے نہیں پتہ چلتا یار۔ وہ بڑی سادہ مزاج ہے اور پھر میں پتہ لگنے دوں گا تو ہی پتہ چلے گا ناں......''

''میں تو کہتا ہوں اب اس قصے کو ختم ہی کر دو۔ اوقات تو دیکھ ہی لی ہے اس کی۔ بڑی چیز سمجھتی تھی اپنے آپ کو۔''

''نہیں یار، وہ واقعی اچھی لڑکی ہے، جیسے میں اسے لائن پر لایا ہوں، وہ میں ہی جانتا ہوں۔ اتنی لڑکیوں سے تعلق رہا ہے، اچھی بری لڑکی کی پہچان تو ہو ہی جاتی ہے۔''

''وہ تو ٹھیک ہے لیکن یہ نئی والی محترمہ سنا ہے خوبصورت ہونے کے ساتھ ساتھ بڑی مالدار بھی ہے۔''

''ہاں یار، تو جانتا تو ہے، تیرا یار عام چیزوں پر اپنا وقت اور پیسہ ضائع نہیں کرتا۔''

''لیکن ہے کون اور تیرا کیسے رابطہ ہوا......؟''

''بس ہو گیا رابطہ، خالد انکل کے قریبی دوست کی بیٹی ہے۔ کالج میں گڑیا کے ساتھ پڑھتی ہے۔ وہیں دیکھا تھا۔ احمد سے نمبر ٹریس کروایا۔ ٹیلی فون ڈائریکٹری سے گھر کا نمبر حاصل کیا اور کہانی چلا دی۔ پہلے پہل اس کی بہن نے خاصا بے عزت کیا لیکن تو جانتا ہے میں ایسے معاملات میں پیچھے ہٹنے والوں میں سے نہیں ہوں لہٰذا کئی دن کی کوششوں کے بعد

بالآخر حسینہ لائن پر آ گئی۔ اچھی لڑکی ہے، قدرے بے وقوف بھی۔ بچوں جیسی حرکتیں اور باتیں کرتی رہتی ہے۔ میرا ٹائم اب زیادہ اچھا پاس ہونے لگا ہے۔''

''پہلی والی چیک نہیں کرتی......؟''

''کرتی ہے آج کل تھوڑا شک کرنے لگی ہے۔ رات میں بیل دیتی رہتی ہے مگر میں پک ہی نہیں کرتا۔ صبح اٹھ کر کہہ دیتا ہوں سیل سائلنٹ پر تھا اور میں سو رہا تھا۔''

''واہ فلرٹی ہو تو تیرے جیسا، یقیناً اسے مطمئن کرنے کے لیے جھوٹی قسمیں بھی کھا لیتے ہو گے۔''

''جھوٹی قسموں سے کیا ہوتا ہے، ابھی کون سا مرنے لگے ہیں، جب مریں گے تب دیکھا جائے گا۔'' مکمل بے فکری سے مسکراتا ہوا وہ فہد کو قابل رشک لگا۔ اس کا اپنا دل اب سدرہ سے بھرنے لگا تھا۔ دومان باری کے نقش قدم پر چلتے ہوئے اب وہ بھی کسی نئی تتلی کی تلاش میں اپنا وقت برباد کرنے لگا تھا۔ اس روز سدرہ سے رات میں کال کر کے اسے بتایا تھا کہ اس کے والدین تعلیم سے فراغت کے فوراً بعد اس کی شادی کا سوچ رہے ہیں۔ کال کے دوران وہ رو بھی رہی تھی۔ لہٰذا نہ چاہتے ہوئے بھی اس کی اطلاع پر اسے فکرمند و پریشان ہونے کا ڈرامہ کرنا پڑا جب کہ دل ہی دل میں وہ اس سے جان چھوٹ جانے پر شکر کا کلمہ پڑھ رہا تھا۔

''فہد......اگر میری شادی تم سے نہ ہوئی تو میں اپنی جان دے دوں گی۔'' اس کی آواز بھرا رہی تھی۔ وہ بظاہر پریشانی سے اسے ڈپٹتے ہوئے بولا۔

''پلیز رونا تو بند کرو، تم کیا سمجھتی ہو، کیا میں تمہارے بغیر زندہ رہ سکتا ہوں۔''

''نہیں، میں جانتی ہوں تم مجھے، مجھ سے بڑھ کر پیار کرتے ہو اگر میں تمہیں نہ ملی تو تم مر جاؤ گے۔ لیکن میں سچ کہتی ہوں فہد اگر تمہیں کچھ ہوا تو میں بھی زندہ نہیں رہوں گی۔''

لڑکیوں کے ساتھ سب سے بڑا المیہ یہی ہے کہ ہر بات کو جذبات کے کفن میں لپیٹ لیتی ہیں۔ بعد میں یہی چیز ان کے لیے نقصان کا باعث بنتی ہے۔ فہد اس کی بات پر زیر لب مسکراتے ہوئے بظاہر رنجیدہ لہجے میں بولا۔

''سدرہ......تم میرے جیتے جی کسی اور کی نہیں ہو سکتیں، تمہیں میرے سوا کوئی چھوئے مجھ سے برداشت نہیں ہو گا۔'' اس کی رنجیدگی پر سدرہ بی بی کے جذبات میں اور طغیانی آ گئی۔

''نہیں، ایسا کبھی نہیں ہو گا۔ پلیز تم اپنے گھر والوں سے بات کرو، میں مر تو سکتی ہوں مگر تمہارے سوا کسی دوسرے لڑکے سے شادی نہیں کر سکتی۔'' بھل بھل گرتے آنسوؤں کی پروا کیے بغیر اس نے التجا کی تو وہ مزید معصوم بنتے ہوئے بولا۔

''تم کیا سمجھتی ہو، میں نے اپنے گھر والوں سے پہلے بات نہیں کی۔ ابھی کل ڈیڈی سے جھگڑا ہوا ہے میرا۔ چھوڑ آیا ہوں میں ان کا گھر۔ ممی کی طبیعت بے حد خراب ہے۔ وہ اسپتال میں ایڈمٹ ہیں مگر میں دیکھنے نہیں گیا۔ جس گھر میں میری محبت کے لیے کوئی جگہ نہیں وہ گھر میرے کس کام کا۔ میں تمہارے لیے سب کچھ چھوڑ سکتا ہوں جان، بتاؤ اور کیا کروں......؟''

ایسی محبت پر وہ نہال نہ ہوتی تو کیا کرتی، تبھی وہ آنسو پونچھتے ہوئے بولی۔

''کچھ نہیں، اب جو کرنا ہے مجھے کرنا ہے اگر تم میرے لیے اپنا گھر بار، ماں باپ سب چھوڑ سکتے ہو تو میں بھی تمہارے لیے سب کچھ چھوڑ سکتی ہوں۔ مشکل کے اس وقت میں، میں تمہیں اکیلا نہیں چھوڑوں گی۔ میں دنیا کو دکھاؤں گی کہ آج بھی سچے پیار کرنے والوں کا وجود قائم ہے۔ آج بھی محبت زندہ ہے۔''

اور واقعی اس نے دنیا کو دکھا دیا۔ اس رات کی صبح میں سورج کے طلوع ہونے سے قبل وہ اپنی عزت، زیور اور کپڑے لتوں کی گٹھری مرمریں بازوؤں میں دبائے اپنے باپ کے گھر کی دہلیز پار کرتے ہوئے گویا اپنی پاک روح کا جنازہ پھلانگ آئی تھی۔

فہد اسے ساتھ لے کر سیدھا اس ہوٹل میں پہنچا جو کل رات اس سے بات کرنے کے بعد اس نے آج کے لیے بک کروایا تھا۔ سدرہ روتے ہوئے فوری نکاح پر زور دے رہی تھی۔ جب وہ پریشانی سے بالوں میں انگلیاں پھنسائے ہوئے بولا۔

''تھوڑا صبر کرو یار، ابھی میں ہوٹل سے باہر نہیں نکل سکتا۔ میرے بھائی مجھے تلاش کرتے پھر رہے ہیں اتنا بڑا قدم اٹھا ہی لیا ہے تو پلیز مجھ پر اعتبار کرو۔ میں آل ریڈی پریشان ہوں، پلیز......'' اس کا خوبصورت چہرہ واقعی پریشانی کی جیتی جاگتی تصویر لگ رہا تھا۔

لہٰذا سدرہ نے اپنے آنسو پونچھ لیے۔ محبت کتنے مشکل دوراہے پر لے آئی تھی۔ ایک طرف اگر جان سے پیارا محبوب تھا تو دوسری طرف ماں باپ کی عزت۔ کل رات کا ایک ایک پل آنکھوں میں کاٹتے ہوئے وہ یہی سوچتی رہی تھی کہ اسے زندگی کے اس موڑ پر اپنے دل کی قربانی دینی چاہیے یا اپنے والدین کی عزت کی؟ اور کل پوری رات سوچنے کے بعد وہ اسی نتیجے پر پہنچی تھی کہ اسے اپنی محبت کو قربان نہیں کرنا چاہیے کیونکہ ایک بار اگر اس نے فہد کو کھو دیا تو ساری عمر اسے بھلا کر خوش نہیں رہ سکے گی جب کہ والدین کا کیا ہے؟ وہ تو اولاد کی بڑی سے بڑی خطا کو بھی ایک دن معاف کر کے اسے سینے سے لگا لیتے ہیں۔ اسے یقین تھا کہ اپنی محبت کا ہاتھ تھامنے کے بعد وہ بھی اپنے والدین کو منا لے گی۔ جبکہ فہد اپنے مقصد میں کامیاب ہوگیا تھا۔ ایسے بہت سے کھیل وہ پہلے بھی جانے کتنی بار کھیل چکا تھا۔ محبت اور شادی کا لالچ دے کر اسی ہوٹل کے مختلف کمروں میں بنا اپنا نام دیے کتنی ہی عزتوں کو پامال کر چکا تھا۔ اس

وقت بھی اسے سکون کی ضرورت تھی اور اسے سکون فراہم کرنے کے لیے پھر جذبات کی ماری ایک عورت نے اپنا آپ اس پر وار دیا تھا۔ اپنا مقصد حاصل کرنے کے بعد وہ اس کے سامنے سر جھکائے شرمندہ بیٹھا تھا۔

''سدرہ...... یار میں تم سے بہت شرمندہ ہوں، یہ سب ایسے نہیں ہونا چاہیے تھا۔'' وہ نظریں چرا رہا تھا۔ سدرہ کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس وقت اس سے کیا کہے۔

''فہد...... میں نے اپنا سب کچھ تمہاری محبت پر قربان کر دیا ہے۔ تم کہو گے تو میں تمہارے لیے ہنس کر جان بھی دے دوں گی، پلیز مجھے خود سے جدا مت کرنا، پلیز......''

لڑکیاں واقعی بہت بے وقوف ہوتی ہیں اسے اصل نقصان کا اندازہ ہی نہیں تھا۔ کاغذی محبت کے حصول کے لالچ میں، صرف چند لمحوں نے اس پر جنت حرام کر دی تھی۔

''تم بہت عظیم لڑکی ہو سدرہ، میں تمہاری محبت پر جتنا بھی فخر کروں کم ہے۔ تم اندازہ نہیں کر سکتی کہ میں کتنا شرمندہ ہوں...... میں تم سے چوری سے شادی نہیں کروں گا۔ کوئی تمہیں گھر سے بھاگی ہوئی کہہ کر حقارت سے دیکھے، تم سے نفرت کرے میں برداشت نہیں کر سکتا۔ میں ممی کو منا کر لاؤں گا، پوری عزت سے تمہاری ڈولی میرے گھر اترے گی۔ ابھی وقت ہے، میں تمہیں گھر چھوڑ آتا ہوں، ابھی کسی کو شک نہیں ہوگا۔ اپنے فہد پر اعتبار کرتی ہو ناں......'' اپنے مضبوط ہاتھوں میں اس کا ہاتھ لیے اب وہ داؤ بدل رہا تھا۔ جب وہ نم لہجے میں بولی۔

''ہاں، اعتبار نہ کرتی تو گھر کی دہلیز کیسے پھلانگتی۔ تم بہت اچھے ہو فہد۔ مجھے بہت فخر ہے تم پر......'' اپنی روح کے قاتل کے ہاتھوں مسمار ہو کر بھی وہ اسی کی محبت کی تسبیح پڑھ رہی تھی۔ فہد دل ہی دل میں پھر اس کی بے وقوفی پر مسکرا دیا۔

وہ گھر واپس لوٹ آئی۔ صد شکر کہ ناسازئ طبع کی بنا پر اس کی والدہ کل رات سے اپنے کمرے میں ہی بے حال پڑی تھیں اور والد صاحب پچھلے دو روز سے شہر سے باہر تھے ورنہ اب تک اس کی محبت کا اچھا خاصا تماشا لگ چکا ہوتا۔

کاغذی محبت کے ہاتھوں میں اپنا آپ سونپ دینے کے بعد ایک عجیب سی بے سکونی نے اس کی ذات کا گھیراؤ کر لیا تھا۔ فہد اسے تسلی دے رہا تھا کہ وہ جلد اپنے والدین کو اس کے گھر بھیج رہا ہے۔ بس اس کی مما اسپتال سے گھر واپس آ جائیں جب کہ حقیقت میں اس کی ماڈرن ماں پارٹیز اٹینڈ کرتی پھر رہی تھیں۔ ان کے تو فرشتوں کو بھی علم نہیں تھا کہ ان کا بیٹا انہیں اسپتال پہنچائے ہوئے ہے۔

پورا ہفتہ وہ اس سے یہی اصرار کرتی رہی کہ وہ اپنے والدین کو جلد بھیجے۔ اور وہ اسے

ٹرخاتا رہا پھر ایک ہفتے کے بعد شام میں اسے خود کال کرتے ہوئے اس نے نیا مسئلہ کھڑا کر دیا۔

''سدرہ...... ڈیڈ مجھے بزنس کے سلسلے میں ایمرجنسی U.K بھیج رہے ہیں، صرف ایک ماہ کی بات ہے، پلیز مجھے غلط مت سمجھنا۔ ابھی ان کو منانے کے لیے ان کی فرماں برداری ضروری ہے، تم سمجھ رہی ہو ناں میری بات۔''

وہ اگر سمجھ نہ بھی رہی ہوتی تب بھی کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ اب اس کے ہاتھ میں رہا بھی کیا تھا؟ پچھلے پورے ایک ہفتے میں وہ اس سے دو منٹ کی بات کرنے کے لیے خوار ہوتی رہی تھی۔ تھوڑے دن پہلے تک دن میں پچاس پچاس کالز کرنے والا وہ شخص زیادہ وقت اپنا موبائل آف رکھتا تھا۔ سدرہ اس زیادتی پر احتجاج کر کر کے تھک گئی تھی مگر وہ بہانے بنا بنا کر ٹھکنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔

خدا خدا کر کے ایک ماہ بھی گزر گیا۔ فہد سے اس کا تعلق اس ایک ماہ میں جیسے نہ ہونے کے برابر رہ گیا تھا۔ اس شخص کے نا صرف معمولات بدل گئے تھے بلکہ لہجہ بھی بے حد اجنبی ہو گیا تھا۔ دو منٹ بھی مشکل سے بات کرتا جب کہ اس کی حالت دن بہ دن غیر ہوتی جا رہی تھی۔ اس روز صبح اس کی آنکھ کھلی تو اس نے اپنی ماں کو پلکیں موندے جائے نماز پر بیٹھے زار و قطار روتے ہوئے دیکھا۔ اپنے معبود حقیقی کے سامنے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے وہ کتنی عاجزی سے کہہ رہی تھیں۔

''مالک، تیرا وعدہ سچا ہے۔ بے شک دنیا تباہی کے دہانے پر آ پہنچی ہے، یہود و نصاریٰ کی گھناؤنی سازشوں نے ہمارے بچوں کو راہ راست سے بھٹکا دیا ہے۔ جہنم کا ایندھن بنا دیا۔ جگہ جگہ تباہی کے گڑھے کھدے ہوئے ہیں۔ سوچنے سمجھنے صلاحیت مفلوج ہو گئی ہے۔ مالک، ہمارے حال پر رحم فرما۔ ہمیں قوت دے کہ ہم اپنے بچوں کو حرام راستے پر چلنے سے روک سکیں۔ انہیں غلط اور صحیح کی پہچان کروا سکیں۔ جس امت کے واسطے تیرے پیارے حبیب محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے ساری زندگی آنسو بہائے۔ اس امت کو دوزخ کا ایندھن بننے سے بچا لے مولا۔ تیری رحمت کا دامن وسیع ہے۔ اس ملک پر اپنی رحمت کے بادل برسا۔ میرے مالک اس ملک کو مزید تباہی سے بچا لے۔ تو بخشنے والا مہربان ہے۔ تیرے خزانے بھرے ہیں۔ مولا ہم سب پر اپنا رحم فرما...... ہمیں بخش دے۔''

آنسو قطار در قطار ان کی پلکوں سے ٹوٹتے ہوئے چہرے کو بھگو رہے تھے۔ سدرہ کے اندر جیسے آگ سی جل اٹھی۔ اسے اب اپنے نقصان کا اندازہ ہو رہا تھا۔ پورے ڈھائی ماہ ہو گئے تھے اس نے فہد رضا کی شکل نہیں دیکھی تھی۔ وہ شخص اب اس کے ہاتھ آ بھی نہیں رہا تھا۔ وہ عجیب سی وحشت اور اذیت کے حصار میں جکڑ کر رہ گئی تھی۔ کسی صورت بھی سکون

نصیب نہیں ہو رہا تھا۔

ایک دن صبح سے شام کی خواری کے بعد بڑی مشکل سے فہد نے اس کی کال ریسیو کی تھی۔

''ہاں بولو، کیا مسئلہ ہے؟'' اس کے لہجے میں اکتاہٹ تھی۔ سدرہ کو بے حد سبکی محسوس ہوئی۔

''تم مسئلے سے بے خبر نہیں ہو، میں بے حد پریشان ہوں اور تمہیں کوئی پروا نہیں، یہی محبت تھی تمہاری۔'' وہ رو پڑی۔ فہد مزید چڑ گیا۔

''میری مما کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے، آل ریڈی ان کی وجہ سے پریشان ہوں۔ تم مزید پریشان مت کرو۔ میں نے کوئی محبت وحبت نہیں کی تم سے، جان چھوڑو میری، پلیز۔'' درشت لہجے میں کہہ کر اس نے کال کاٹ دی۔

سدرہ کو لگا اس لمحے وہ سچ مچ زمین بوس ہو گئی ہو۔ کاغذی محبت کا محل گر چکا تھا۔ اس کے اعصاب شدید شاک کی زد میں آ گئے۔ وہ اس کے ساتھ اس درجہ بے وفائی کر سکتا ہے اسے گمان تک نہیں تھا۔ جس شخص کی رفاقت کے حصول کے لیے اس نے ہر غلط راستے کی حد پار کر لی تھی۔ اس شخص کا اصل چہرہ کیا تھا؟ غم و غصے سے اس کا برا حال ہو رہا تھا۔ تبھی کپکپاتی انگلیوں سے اس نے پھر فہد رضا کے گھر کے نمبر پر کال کی۔ موبائل نمبر تو اس نے اپنا بدل ہی لیا تھا۔ کال پھر فہد رضا نے ہی ریسیو کی تھی۔

''اب کیا تکلیف ہے؟'' وہی اس کا کاٹ کھانے والا انداز۔ سدرہ اس بار کمزور نہ بنی۔

''تم میرے ساتھ اتنا بڑا فریب نہیں کر سکتے فہد رضا! اگر میری زندگی برباد ہوئی تو میں تمہیں بھی سکون سے جینے نہیں دوں گی۔ سیدھی تمہارے باپ کے دفتر میں پہنچ کر تمہارے کرتوتوں کی فائل کھولوں گی، مجھے تر نوالہ سمجھ کر نگلنے کی کوشش مت کرنا۔''

''ٹھیک ہے، آ جاؤ آفس۔ میں ثابت کر دوں گا کہ تم ایک آوارہ کال گرل لڑکی ہو جس کا پیشہ ہی شریف لڑکوں پر الزام لگا کر پیسے ہتھیانا ہے پھر دیکھوں گا تم اور تمہارے گھر والے کس کو منہ دکھاتے ہیں۔''

محبت کا کوئی رخ اتنا بھیانک بھی ہو سکتا ہے آج سے پہلے اسے اندازہ نہیں تھا۔

وہ واقعی بھول گئی تھی کہ وہ ایک عورت ہے۔ جس کے پاس عزت سے بڑھ کر قیمتی سرمایہ اور کچھ نہیں ہوتا۔ لڑکیاں بے وقوف ہی نہیں جذباتی بھی ہوتی ہیں۔ وہ بھی جذبات کے بہاؤ میں آ کر بھٹک گئی تھی۔ گزرے ہوئے خوشگوار لمحوں میں اسے کبھی گمان تک نہیں گزرا تھا کہ محبت کے نام پر کھیلا جانے والا کھیل اسے یوں رسوائی نے ہمکنار کر کے بے موت مار

ڈالے گا۔ فہد رضا نے اسے فوری شادی کا لالچ دے کر حاصل کیا تھا مگر اب وہ بڑی آسانی سے اپنے ہر قول و قرار سے پھر چکا تھا اور وہ چاہتے ہوئے بھی اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی تھی۔ جو کچھ بھی اس نے خود اپنے ساتھ کیا تھا وہ اس پر شرمندہ تھی مگر اب اس کی شرمندگی کا احساس اسے کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتا تھا۔ اس روز وہ بہت روئی۔ خدا کے حضور گڑگڑا کر بہت دیر تک معافی بھی مانگتی رہی مگر پھر بھی اسے سکون نہیں ملا۔ زندگی میں اب جینے کا جیسے کوئی مقصد ہی باقی نہیں رہ گیا تھا۔ تبھی اس روز دسمبر کی خنک شام میں تیز بخار کے باوجود چائے بناتے ہوئے اس نے جان بوجھ کر اپنا بھاری آنچل آگ کے نارنجی شعلوں کی نذر کر دیا۔ صرف چند لمحوں میں اس کا پورا وجود آگ کی لپیٹ میں آ گیا۔ نفیسہ بیگم ابھی مغرب کی نماز سے فارغ ہوئی تھیں۔ بیٹی کی دل خراش چیخیں سن کر وہ گھٹنوں کی شدید تکلیف کے باوجود بھاگتے ہوئے کچن کی طرف گئیں مگر تب تک بہت دیر ہو چکی تھی۔ آگ کے بے رحم شعلوں نے ان کی اکلوتی لخت جگر کو دیکھنے کے لائق بھی نہیں چھوڑا تھا۔ پورے بیس دن اسپتال میں ایڈمٹ رہنے کے بعد اکیسویں دن کی ڈھلتی شام کے ساتھ ہی سدرہ حسن کی زندگی کی شام کا سورج بھی ہمیشہ کے لیے ڈوب گیا۔ سب یہی سمجھ رہے تھے کہ وہ لاپروائی میں آگ کے شعلوں کی نذر ہو کر بے رحم موت کی بھینٹ چڑھ گئی ہے۔ تاہم یہ راز وہ اپنے ساتھ ہی لے گئی تھی کہ اس نے غلط راہ پر بھٹک کر، غلط شخص سے اپنی امیدیں اور خواب منسوب کرنے کا تاوان بھرا ہے۔

☆......☆......☆

موسم تبدیل ہو رہا تھا۔

ہواؤں میں خنکی کی جگہ اب ہلکی ہلکی سی تپش محسوس ہونے لگی تھی۔ اس روز رومان باری کے بہت زیادہ اصرار پر وہ پھر اپنی پڑوسن کے ساتھ مارکیٹ آئی تھی۔ شاپنگ کچھ خاص نہیں کرنی تھی۔ مقصد صرف محبوب کا دیدار تھا۔ لہٰذا جب وہ بائیک پر اس کے آس پاس کئی چکر لگانے کے بعد واپس چلا گیا تو اس نے بھی خوشی خوشی گھر واپسی کا ارادہ کیا لیکن ابھی وہ ایک شاپ سے باہر نکلی تھی کہ سامنے سے آتی اس کی کالج فیلو انیلا کرن نے اسے دیکھ کر روک لیا۔ رسمی سلام دعا کے بعد اچانک اس نے دھماکہ کیا۔

”سبین...... تمہیں اپنی دوست سدرہ کے بارے میں کچھ پتہ چلا......؟“

”نہیں، پچھلے ایک ماہ سے موبائل آف ہے اس کا۔ اب تو کالج سے بھی تعلق نہیں رہا۔ خیریت تو ہے ناں؟“

انیلا حیرت کا اظہار کرتے ہوئے بولی۔

”یار کیسی بے خبر دوست ہو تم۔ اس کی تو پچھلے ہفتے ڈیتھ ہو چکی ہے۔“

”واٹ......؟“

اس کے منہ سے بے ساختہ چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔

”ہاں یار کسی فہد نام کے لڑکے کے ساتھ چکر چل رہا تھا اس کا، اسی کی وجہ سے سوسائیڈ کر لی۔ میری ایک دوست کا کزن ہے وہ لڑکا۔ اسی سے ساری بات پتہ چلی۔ ماں باپ کو تو آخر تک اس کے جلنے کی وجہ پتہ نہیں چلی۔ اب بات باہر نکلی ہے تو ہزاروں افسانے بن رہے ہیں۔ تو نمبر دے اپنا رات میں ساری بات تفصیل سے بتاؤں گی۔“

وہ پٹر پٹر بول رہی تھی مگر سبین کو لگا جیسے اس کی سماعتیں کام نہیں کر رہی ہیں۔

گم صم وہ گھر کیسے واپس آئی اسے خبر نہ ہو سکی۔

شام ڈھل رہی تھی۔ سلمٰی بیگم نے اس کے گھر میں داخل ہوتے ہی خوب لتے لیے تھے۔

”آ گیا تجھے گھر یاد، نا ہنجار اولاد ایسی کون سی ضرورتیں ہیں تیری جو دن بہ دن بڑھتی جا رہی ہیں......؟“ کوئی اور موقع ہوتا تو وہ بھی تپ کر انہیں کوئی جلا کٹا سا جواب دیتی مگر اس وقت تو اس کا دماغ سن ہو رہا تھا۔ لہٰذا بنا کوئی جواب دیے چپ چاپ اندر کمرے میں چلی آئی۔ تھوڑی ہی دیر میں سلمٰی بیگم بھی اس کے پیچھے چلی آئیں۔

”کیا ہوا ہے تجھے، طبیعت تو ٹھیک ہے؟“ اس کی آنکھوں میں نمی دیکھ کر وہ پریشان ہو گئیں۔ سبین مزید ضبط نہیں رکھ سکی اور پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔

”ماں...... سدرہ کی ڈیتھ ہو گئی۔“

سدرہ کے ساتھ کبھی اس کا بہت اچھا وقت گزرا تھا۔ سلمٰی بیگم اور سنان دونوں ہی اسے جانتے تھے۔ لہٰذا انہیں بھی دکھ ہوا۔

”انا للہ و انا الیہ راجعون۔“ افسردگی سے کہتے ہوئے وہ اس کے قریب ہی بیٹھ گئی تھیں۔ ”کیا ہوا تھا پتر؟ وہ تو بڑی اچھی جوان لڑکی تھی۔؟“

فوری طور پر سبین کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ انہیں کیا جواب دے تاہم کچھ لمحوں کے بعد وہ بولی۔

”آگ لگ گئی تھی ماں، کچن میں چائے بناتے ہوئے لاپروائی سے آگ کے شعلوں کی نذر ہو گئی۔“ کس قدر درد سے اس نے اپنی بات مکمل کی تھی۔ سلمٰی بیگم افسوس سے ہاتھ ملتے ہوئے بولیں۔

”اللہ بچی کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔ آج کی لڑکیاں کوئی بھی کام دھیان سے کرتی ہی نہیں۔ ذہن کہیں ہوتا ہے، کام کہیں کر رہی ہوتی ہیں۔ ہائے تھی بھی اکلوتی۔ پتہ نہیں ماں کے دل پر کیا قیامت گزری ہوگی۔ سبو تو آج کے بعد کچن کا کام نہ کرنا۔ تو بھی تو لاپروا ہے۔

خدانا خواستہ تجھے کچھ ہوگیا تو میں زندہ رہ کر کیا کروں گی۔'' ابھی تھوڑی دیر پہلے اسے ڈپٹنے والی ماں اس وقت سراپا محبت بنی اس پر اپنے پیار کی برسات کر رہی تھی۔ سبین کا دل اچانک بھر آیا۔ کاغذی محبت کی جن کشتیوں میں سوار نوخیز کلیاں جذبات کے گہرے پانی میں اترتی ہیں، وہ پانی پھر انہیں مضبوط رشتوں کے ساحل پر پہنچنے نہیں دیتا بھنور کے درمیان ڈبو کر مار دیتا ہے۔ وہ بھی روتی رہی تھی۔ اپنی دوست کی جنون خیز محبت کے المیہ انجام پر آنسو بہاتی رہی تھی۔

سلمٰی بیگم نے اس روز اس سے گھر کا کوئی کام نہیں کروایا تھا۔ اس نے اپنا موبائل بھی آف کر کے رکھ دیا تھا۔ فی الحال اس کا کسی سے بھی بات کرنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ رات میں اس نے انیلا کو کال کرنے کے لیے سیل آن کیا تو ردمان باری کی طرف سے ایک میسج بھی نہیں آیا تھا۔ اس کے دل کو جیسے کچھ ہوا۔ وہ تو سوچے بیٹھی تھی کہ جیسے ہی سیل آن کرے گی تو اس کی طرف سے دھڑا دھڑ میسج آنا شروع ہو جائیں گے جیسے پہلے ہوتا رہا تھا مگر انسان جیسا سوچتا ہے ویسا ہی تو نہیں ہوتا۔ جلتے دل کے ساتھ اس وقت اس نے انیلا کو کال کر دی۔ جس نے اگلے تین گھنٹوں میں فہد اور سدرہ کی محبت کے ایسے ایسے راز اس پر کھولے کہ وہ دنگ رہ گئی۔

سدرہ کے لیے ایک مرتبہ پھر رونے کے بعد اس نے گریبان میں جھانکا تو مطمئن ہوگئی۔ اس کا ردمان باری سے تعلق فہد اور سدرہ جیسا نہیں تھا۔ رومان باری ہمیشہ اپنی اور اس کی محبت کی انفرادیت پر نا صرف فخر کرتا تھا بلکہ اس کی بے حد تعریف بھی کرتا تھا۔ اسی سوچ نے اسے مطمئن کیا تھا۔ لہٰذا اپنے آپ کو بالکل صحیح سمجھتے ہوئے اس نے مسٹر باری سے فوری ترکِ تعلق کا فیصلہ پھر کنویں میں ڈال دیا۔ کسی کے غلط اقدام اور انجام سے خوف زدہ ہو کر وہ اپنے دل کو بے قصور سولی پر چڑھانے کا حوصلہ نہیں رکھتی تھی۔ لہٰذا سیل سائیڈ پر رکھ کر چپ چاپ پلکیں موند لیں۔

اگلے روز صبح مسٹر باری کا گڈ مارننگ کا میسج آیا ہوا تھا اور اس نے رات میں سیل بند ہونے کی وجہ بھی پوچھی تھی مگر اس نے خفگی میں اس کا میسج نظر انداز کر دیا۔ مسٹر باری کی طرف سے بھی دوبارہ میسج نہیں آیا جس نے اسے مزید جلا دیا اور اس نے پھر اپنے دماغ کو سکون پہنچانے کے لیے سیل آف کر کے رکھ دیا مگر احسان باری کو اس کے سیل آف کرنے سے فرق نہیں پڑا تھا۔ اس کی توقع کے مطابق وہ نہ تو پریشان ہوا تھا نہ ہی اسے کوئی جلیسی ہوئی تھی۔ وہ ایک دم فریش تھا۔ اس نے پہلے کی مانند اسے دیکھنے کے بعد فوری کال کر کے اپنی خوشی کا اظہار کرنا بھی ضروری نہیں سمجھا اور یہیں سے ان دونوں کے درمیان فاصلے پیدا ہونے شروع ہوگئے تھے۔

وہ دھیرے دھیرے بدل رہا تھا، لاپروا ہو رہا تھا، ہر لمحہ اس کے لیے بے تاب رہنے

والا اس کا محبوب اب دن میں دو چار بار میسج کرنے کا روادار بھی نہیں رہا تھا۔ اس نے شدید ہرٹ ہو کر گلہ کیا تو اس نے بڑی سہولت سے مصروفیت کا بہانہ کر دیا۔ کوئی جب بے وفائی کرنے کی ٹھان لے تو آپ لاکھ کوششوں سے بھی اسے صرف اپنی ذات تک محدود نہیں رکھ سکتے۔ سبین احمد حسن کے ساتھ بھی ایسا ہی معاملہ ہوا تھا۔

رومان باری کی روٹین اب بدل گئی تھی۔ وہ جذبات و احساسات جو اب تک وہ سبین احمد حسن کو سونپتا آیا تھا اب مصباح آصف بھی بلاشرکت غیرے اس کی حصہ دار بن گئی تھی۔ اس کے معمولات اور مصروفیات اب بھی پہلے والی تھیں مگر اب دلچسپی کا محور بدل گیا تھا۔ سبین احمد حسن کی سادہ سی پرخلوص ذات اور بے لوث محبت سے زیادہ اب اسے مصباح آصف کی ذات کی کھوج زیادہ دلچسپ محسوس ہو رہی تھی۔ مرد دریافت کا پرندہ کہلاتا ہے اور وہ بھی ایک مرد تھا۔ جس کی فطرت میں عیاشی کوٹ کوٹ کر بھری تھی پھر اللہ نے دولت و اختیار جیسی نعمت سے بھی نوازا تھا۔ لہٰذا جو وقت اور پیسہ وہ اس سے گفتگو میں اڑاتا اب اسی وقت اور پیسے پر مصباح آصف کا راج ہوگیا تھا۔

سبین اس کے بدلتے معمولات اور حرکتوں سے مشکوک تو ہوگئی تھی مگر جب وہ کہتا ''مجھے میری مما کی قسم سبی، میری زندگی میں تمہارے سوا کوئی لڑکی نہیں۔ تمہارا شک فضول ہے اگر میں تم سے بے وفائی کروں تو ابھی موت آ جائے۔'' تب وہ خود کو تسلی دے لیتی تھی کہ شاید اس کا ذہن ہی خراب ہوگیا ہے مگر دل کے اندر کہیں کوئی وہم جڑ پکڑ کر بیٹھ گیا تھا جو اس کی قسموں کے باوجود اسے شک میں مبتلا رکھتا تھا۔ وہ اس سے ہمیشہ ایک جیسے تعلق کی خواہاں تھی۔ وہی پہلے سی بے قراری، وہی دیوانگی، وہی اس کی باتیں، حرکتیں مگر وہ بے وقوف جانتی نہیں تھی کہ جب دلچسپی کے محور بدل جائیں تو حالات و واقعات بھی بدل جاتے ہیں۔ رومان باری سے اس کی شکایتیں اور جھگڑے بڑھ گئے تھے۔ جس کی وجہ سے وہ گزرتے دن کے ساتھ اس سے دور ہوتا جا رہا تھا اور وہ اس غیر متوقع صورتحال پر اندر سے ٹوٹتی جا رہی تھی۔

وہ شخص اپنا قصور تسلیم بھی نہیں کر رہا تھا اور اسے کسی بھی صورت چھوڑنے پر آمادہ نہیں تھا۔ گویا لمحہ بہ لمحہ اذیت کی سولی پر لٹکا کر رکھنا چاہتا تھا اور وہ نہ چاہتے ہوئے بھی لٹکنے پر مجبور تھی۔

آج کل اس کے سیل فون پر دو تین اجنبی نمبرز سے بھی کالیں اور میسج آنا شروع ہوگئے تھے۔ پہلے بھی اس نے دو تین بار سم تبدیل کی تھی۔ تاہم اب اس کا ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ جنوں خیز محبت کی اچانک کروٹ نے اسے ذہنی اور دلی طور پر پریشان کر کے رکھ دیا تھا۔

رومان باری جسے وہ کسی صورت دوسرے عام لڑکوں کے ساتھ کمپیئر کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔ اس کی روٹین ضرور بدل گئی تھی مگر لہجہ اب بھی وہی تھا۔ اس پر نثار ہونے والا

پھر وہ کیسے اسے چھوڑ دیتی؟ ایک دو بار چھوڑنے کی دھمکی دی تو اس نے اپنا حال برا کر لیا۔ ادھر وہ قطع تعلق کرتی ادھر وہ شہر چھوڑنے پر تیار ہو جاتا۔ سبین کی نفسیات سے اچھی طرح باخبر ہونے کے باعث اسے جذباتی بلیک میل کرنا اس کے لیے قطعی مشکل نہیں تھا۔ جانے اس کی ذات میں ایسی کیا بات تھی کہ وہ اسے یکسر چھوڑنے پر آمادہ نہیں تھا۔ وہ واقعی اسے دوسری عام لڑکیوں سے مختلف لگی تھی مگر مصباح آصف کی اس کی زندگی میں آمد بہار کے تازہ جھونکے سے کم نہیں تھی۔ سبین کے شک اور جنون خیز محبت کی وارفتگی کی وجہ سے وہ اب کبھی کبھی اس سے بیزار ہو جاتا تھا۔ اسی بیزاری کو ختم کرنے کے لیے اس نے مصباح آصف کا سہارا لیا تھا جو خوبصورت ہونے کے ساتھ ساتھ بے حد مالدار بھی تھی۔ اب وہ ایک وقت میں دونوں کے جذبات سے کھیلتا۔ دونوں کے ساتھ ایک جیسی باتیں کرتا۔ دونوں کو قسمیں اٹھا کر یقین دلاتا اس کی زندگی میں اس کے سوا دوسری کسی لڑکی کا وجود نہیں۔

سبین حسن نے اب تک اس سے والہانہ محبت کے باوجود خود کو بہت سمیٹ کر رکھا تھا مگر مصباح آصف ایسی نہیں تھی۔ اس نے مسٹر باری سے دوستی کے آغاز میں ہی یہ ڈیمانڈ رکھ دی تھی کہ اگر وہ اس سے شادی کرے گا تو وہ تعلق بنائے گی ورنہ نہیں۔ لہٰذا اس سے تعلق بنانے کے لیے اس نے پہلے سے انگیج ہونے کے باوجود اس سے شادی کرنے کی حامی بھر لی۔

پچھلے دنوں اس نے سبین پر واضح کر دیا تھا کہ اس کے والدین نے اس کی بہن کے بہتر مستقبل کے لیے ''وٹے سٹے'' کے رشتے میں زبردستی اس کی قربانی دے دی ہے۔ جب کہ حقیقت میں سبین کو اپنے سنہرے خوابوں سے نکالنے کے لیے اس نے خود یہ قدم اٹھایا تھا۔ دل سے اس کی اچھائی اور بہترین کردار کا قائل ہونے کے باوجود وہ کسی ''موبائل فون'' والی سے شادی کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا تھا۔

سبین احمد حسن نے کھلے دل سے اس کے انگیج ہونے کو قبول تو کر لیا تھا مگر اندر کہیں کچھ ٹوٹ گیا تھا۔ سنان نے کہا تھا مرد محبت کے معاملے میں کبھی مجبور نہیں ہوتا اگر وہ کسی کو حاصل کرنے کا ارادہ رکھتا تو دودھ کی نہر بھی نکال سکتا ہے مگر وہ تو شاید ان خوابوں کا راہی ہی نہیں جو خواب اس کی رفاقت کے حوالے سے سبین نے اپنی آنکھوں میں سجا لیے تھے۔ اب نہ راتیں اس کی رہی تھیں، نہ دن۔ پہلے جو اس کی کالز اور میسج سے وہ عاجز رہتی تھی۔ اب بار بار موبائل اٹھا کر دیکھتی مگر اس کی طرف سے کال یا میسج تک نہیں آئی ہوتی۔

رت بدل گئی تھی۔ مسٹر باری کے حواس پر اب ہر وقت مصباح آصف کا نشہ سوار تھا۔ فطری طور پر تنوع پسند ہونے کے باعث وہ زیادہ لمبے عرصے تک صرف ایک ہی لڑکی پر گزارا کر بھی نہیں سکتا تھا مگر سبین اس کے اس ارادے سے بے خبر تھی۔ لہٰذا اس سے شکوے گلے

کر کے کچھ حاصل نہ ہونے کے بعد اب اس نے اندر ہی اندر کڑھنا شروع کر دیا تھا۔

اس روز بہت دنوں کے بعد وہ دل کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے ماہ رخ کی طرف گئی تھی۔ جو حسب معمول نیٹ پر مصروف تھی۔ اتفاق سے آج بھی اس کی والدہ گھر پر نہیں تھیں۔ تاہم آج اسے کمپنی دینے کے لیے ماہ رخ نے فوراً اپنا کمپیوٹر آف کر دیا۔

''کیا حال ہے یار، آج کل تو نظر آنا ہی بند ہو گئی ہو؟'' صوفے پر اس کے مقابل بیٹھتے ہوئے وہ بولی۔ جواب میں سبین نے مختصر الفاظ میں اسے اپنے ذہنی ڈپریشن سے آگاہ کر دیا۔ درمیان میں سدرہ والے واقعے کی نقاب کشائی بھی ہو گئی تھی۔ تبھی وہ بولی۔

''وری سیڈ یار، دین سے دوری نے ہم لوگوں کو واقعی کہیں کا نہیں چھوڑا۔ پتہ نہیں اندھے جذبات کا یہ کیسا طوفان ہے جو ہم سب کو بربادی کی طرف بہائے لیے جا رہا ہے مگر پھر بھی ہم خود کو بچا نہیں پا رہے۔''

''دوسروں کو کچھ کہنا بہت آسان ہوتا ہے ماہ مگر اپنے دل کو سمجھانا بہت مشکل ہوتا ہے۔ کوئی بھی انسان اپنے لیے اس وقت تک کچھ نہیں کر سکتا جب تک اللہ اسے ہدایت نہ دے۔ تم جانتی ہو، تمہاری جو مصروفیات ہیں وہ کتنی غلط ہیں، پھر بھی تم اللہ سے توبہ نہیں کرتیں، کیوں......؟'' دھیمے لہجے میں کہتے ہوئے اس نے گویا ماہ رخ کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا۔ وہ زبردستی مسکرائی تو پلکوں میں نمی چھلک آئی۔

''سچ کہتی ہو تم۔ میں تو خود سر سے پاؤں تک گناہ کی دلدل میں دھنسی ہوئی ہوں۔ کیا کریں یار ایک بار اس آگ میں کودنے کے بعد خود کو جلنے سے بچانا ممکن ہی نہیں رہتا۔''

''کیا تم مجھے بتاؤ گی کہ تمہارے ساتھ کیا ہوا ہے ماہ۔'' وہ اس سے اپنی الجھن شیئر کرنے آئی تھی مگر اس کی آنکھوں میں نمی دیکھ کر اس کا غم شیئر کرنے پر مجبور ہو گئی۔

''صرف میرے ساتھ کیا سبی، یہاں ہر لڑکی کے ساتھ پتہ نہیں کیا کیا ہو رہا ہے۔ محبت کے نام پر کیسے کیسے تماشوں کی بھینٹ نہیں چڑھ رہی عورت۔'' ہر لڑکی خود جان بوجھ کر کھلونا بن رہی ہے۔ ٹوٹ پھوٹ کر بکھر رہی ہے۔ شاید اسی لیے عورت کے کردار اور اس کی ذات کے بارے میں مرد کی سوچ بڑی رف ہو گئی ہے۔''

''ہو سکتا ہے تمہاری سوچ صحیح ہو مگر...... محبت تو میں نے بھی کی ہے ماہ۔ ڈیڑھ سال ہو گیا احسان باری سے میری شناسائی ہوئے مگر آج تک وہ مجھے قریب سے دیکھ بھی نہیں پایا۔ میں نے کبھی اس سے دس روپے کے بیلنس کی امید بھی نہیں رکھی۔ مجھے صرف اس کا دکھ بانٹنا اچھا لگتا ہے۔ اسے اپنے بے لوث پیار کا احساس دلانا اچھا لگتا ہے۔ تم سوچ بھی نہیں سکتیں کہ اس کے گھر والے اس کے ساتھ کتنا برا سلوک کرتے ہیں۔ اس کے ابو، اسے چھوٹی چھوٹی باتوں پر

ذلیل کر کے رکھ دیتے ہیں۔ ایک ایک حرکت پر شک کرتے ہیں۔ اس کے چچا، بھائی، ماں سب کا اس کے ساتھ امتیازی سلوک ہے حالاں کہ وہ سب کے لیے بے حد ذمہ دار ہے۔ اپنے گھر والوں میں جان ہے اس کی مگر...... پھر بھی سچے پیار کو ترستا ہے۔ ایسے میں اگر میں بھی اس پر فضول شک کر کے اسے چھوڑ دوں، دکھ دوں تو کیا یہ محبت کی توہین نہیں ہے۔''

اس لمحے وہ بھول گئی تھی کہ ابھی چند روز قبل وہ اپنے محبوب کی بدلی ہوئی روٹین پر بے حد پریشان رہی تھی۔ ماہ آفندی اس کے معصوم دلائل پر دھیمے سے مسکرائی۔

''تمام لوگوں کے بارے میں تمہاری سوچ مثبت نہیں ماہ، ضروری نہیں اگر کسی نے تمہارے ساتھ فلرٹ کیا ہے تو میں بھی کسی کے فلرٹ کا شکار ہو رہی ہوں۔ ہاں میں مانتی ہوں کہ اسے لڑکیاں اچھی لگتی ہیں۔ مجھ سے پہلے شاید کسی کے ساتھ فلرٹ بھی کیا ہوگا اس نے مگر اب وہ ایسا نہیں ہے۔ تم یقین کیوں نہیں کرتیں۔''

''چلو ٹھیک ہے کر لیا یقین۔ یہ بتاؤ اگر زندگی میں کبھی خدانخواستہ وہ تمہارے ساتھ فریب کر جائے تو کیا تم اس کے بغیر خوش باش جی سکو گی......؟''

''نہیں...... میری زندگی میں اس سے ایک لمحے کے لیے بھی دور ہو کر جینے کا تصور نہیں ہے۔ نہ ہی اس کے سوا میں کسی اور کے بارے میں سوچ سکتی ہوں، چاہے میں اسے حاصل نہ کر سکوں۔ وہ مجھے کچھ بھی نہ دے مگر پھر بھی صرف اس کے ہونے کا احساس میری زندگی ہے ماہ۔ وہ سلامت رہے، مجھے اور کیا چاہیے۔''

''بھئی واہ! کوئی دریا دل ہو تو تم جیسا۔ اس کا مطلب ہے وہ تمہیں بے وقوف بنائے یا دوسری لڑکیوں سے تعلق رکھے، تمہیں اس کی حرکتوں سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔''

''کیوں نہیں پڑتا۔ میں اس کے لیے ہر دکھ ہنس کر جھیل سکتی ہوں مگر اسے کسی کے ساتھ شیئر نہیں کر سکتی۔''

''مگر ابھی تو تم نے کہا کہ چاہے وہ تمہیں کچھ بھی نہ دے پھر بھی تم صرف اسی کی ہو۔''

''ہاں...... میں اس سے انکاری نہیں ہوں۔ وہ شادی کر لے مگر میرے سوا کسی اور سے محبت نہ کرے۔''

''اور اگر اس نے کسی اور سے محبت کر لی تو......؟''

''ناممکن۔ اسے جس لڑکی کی تلاش تھی وہ میرے روپ میں اسے مل چکی ہے۔''

''اوہ یار! تم نے وہ کہاوت نہیں سنی کہ مرد دریافت کا پرندہ ہے۔ اس کی تلاش نایاب گوہر پا کر بھی ساری زندگی ختم نہیں ہوتی۔''

''ٹھیک ہے، اب تم مجھ سے کیا چاہتی ہو......؟''

''کچھ نہیں۔ بس اتنا کرو کہ اس فلرٹی کے چکر سے نکل کر کسی مثبت معاملے کی طرف سوچو، وہ...... کیا نام تھا تمہارے اس کزن کا، ہاں سنان۔ وہ اچھا لڑکا ہے۔ اس سے دل لگاؤ۔''

بڑے بوڑھوں کی طرح نصیحت کرتی وہ اسے بالکل اچھی نہیں لگی۔ تبھی وہ بولی۔

''ہرگز نہیں۔ میری زندگی میں میرے باری کی جگہ کوئی اور کبھی نہیں لے سکتا۔'' وہ اپنے ارادے پر مضبوط تھی۔ ماہ رخ نے ہار مانتے ہوئے اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا۔ وہ چاہتی تو اسی وقت اسے احسان باری کے کردار کی حقیقت ثبوت کے ساتھ دکھا کر مزید آگے بڑھنے سے روک سکتی تھی مگر اس نے ایسا نہیں کیا۔ کچھ لوگوں کے لیے ذاتی ٹھوکر کھا کر تجربہ حاصل کرنا ضروری ہوتا ہے۔

☆......☆......☆

ودمان باری کی زندگی میں مصباح آصف کی آمد کیا ہوئی۔ وہ جیسے اپنے آپ کو بھول کر رہ گیا۔ دھیمے لہجے والی مصباح آصف۔ چند ہی روز میں اس کے حواس پر یوں سوار ہوئی کہ اسے سبین حسن احمد کا خیال ہی بھول گیا۔ اسے یاد ہی نہیں رہا کہ اس نے اس سے کیا کیا پیمان کیے تھے۔ کیسی کیسی قسمیں اٹھا کر اسے یقین دلایا تھا کہ اس کی زندگی میں اس کے سوا دوسری کوئی لڑکی نہیں، نہ ہی کبھی آ سکتی ہے۔ شام میں شاپ سے فارغ ہوتے ہی اس پر مستی چھا جاتی تھی۔ لہٰذا پہلی فرصت میں کھانا کھا کر چھت پر چڑھ جاتا۔ جہاں اس کی باتیں سننے اور اس کی حرکتیں دیکھنے والا کوئی نہیں ہوتا تھا۔

ہر روز رات میں دس سے لے کر صبح تین چار بجے تک مصباح آصف سے بات کرنا اس نے اپنی روٹین بنالی تھی۔ سبین احمد کی طرح اس نے مصباح آصف کو بھی یہی یقین دلایا تھا کہ اس کی بے رنگ زندگی میں کسی لڑکی کا کوئی کردار نہیں۔ وہ بالکل تنہا ہے۔ اس سے کوئی پیار کرنے والا نہیں۔ وہ بھی عورت تھی، محبت سے گندھی عورت لہٰذا مضبوط بننے کی ناکام کوشش کرتے کرتے بالآخر پگھل گئی۔

سبین احمد حسن خوددار ہونے کے ساتھ ساتھ بے وقوف بھی تھی۔ جو قیمتی جذبوں کے ساتھ ساتھ جانے کیا کیا اس کی نذر کرتی رہی اور جواب میں کسی صلے کی تمنا نہیں کی جب کہ مصباح آصف ایسی نہیں تھی۔ آغاز میں ہی شادی کی ڈیمانڈ رکھنے کے ساتھ ساتھ وہ مالی طور پر بھی اس سے فائدہ اٹھاتی رہی۔ روزانہ وہ اسے خود سے چھ سات گھنٹوں کی کال کرتا مگر اس کے باوجود اس کے موبائل میں بیلنس لوڈ کرواتا۔ پچیس تیس ہزار کا موبائل الگ تحفے میں دیا اور جس روز مصباح نے اسے بتایا کہ ان کے ہاں بیٹی کے جہیز میں داماد کو ایک عدد بھینس اور نئے ماڈل کی قیمتی کار دینے کا رواج ہے اس روز سے مصباح آصف کے لیے اس

کی محبت کے ساتھ ساتھ عنایات بھی بڑھ گئی تھیں۔

اس بار وہ لڑکی ہاتھ لگی تھی جس کی تلاش میں وہ جانے کتنے برسوں سے لڑکیوں کو اپنے لیے خوار کرتا پھر رہا تھا۔ ہر لڑکی کو اپنی رفاقت کے حسین خواب دکھانے کے بعد اس سے معذرت کر کے راستہ بدل لینا اب اس کی فطرت بن چکا تھا مگر مصباح آصف کے معاملے میں اس نے راستہ بدل لینے کا ارادہ ترک کر دیا تھا۔ اس نے اسے قریب سے دیکھا۔ صورت کے ساتھ ساتھ وہ ہوش ربا سراپے کی مالک تھی۔ اسے اور کیا چاہیے تھا۔ سبین احمد حسن یہی جانتی تھی کہ اس کے والدین بے حد سخت ہیں اور وہ ان سے بہت ڈرتا ہے۔ اسی لیے اپنے گھر والوں سے اس کے متعلق بات نہیں کر سکا لیکن حقیقت میں ایسا نہیں تھا۔ مصباح آصف کی دولت کی چمک نے اس کے ساتھ ساتھ اس کے والدین کو بھی کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ دومان باری نے جب انہیں اس کے بارے میں بتایا تو وہ بے حد برہم ہوئے۔ تاہم بعد میں جب اس نے یہ بتایا کہ اس سے شادی کے نتیجے میں اسے کیا کچھ حاصل ہوسکتا ہے تو وہ نرم پڑ گئے۔ اب تو دن رات اس کے عیش تھے۔ کوئی روکنے پوچھنے والا نہیں تھا۔

آج کل اسے سبین سے دن میں ایک دفعہ بات کرنا بھی گوارا نہیں تھا۔ اس نے اسے صاف کہہ دیا تھا کہ آج کل وہ ''کاروبار'' میں بے حد مصروف ہے لہٰذا اسے پہلے کی طرح روزانہ کال نہیں کر سکتا اگر بات کرنی ضروری ہو تو وہ خود اسے کال کر لیا کرے۔

روزانہ شہد ٹپکانے والے لہجے کے مالک دومان باری کی اس بات نے اسے گہرا شاک لگایا تھا۔ اب بھی صرف اسی سے محبت کے دعوے پر قائم رہنے کے باوجود اسے اس دوری تک کا احساس نہیں تھا۔

اس روز مصباح آصف نے قسم دے کر اس سے پوچھا تھا کیا واقعی اس کے ملنے سے پہلے کوئی لڑکی اس کی زندگی میں نہیں آئی۔ تب مردہ ضمیر کو تھپک کر سلاتے ہوئے وہ بڑے آرام سے بولا۔

''نہیں یار، قسم لے لو جو آج تک تمہارے علاوہ کسی اور لڑکی کو محبوبہ کی نظر سے دیکھا ہو۔ کبھی ٹائم ہی نہیں ملا لڑکیوں پر توجہ دینے کا۔ ہاں ایک لڑکی آئی تھی زندگی میں سبین احمد نام تھا اس کا اچھی لڑکی تھی۔ مجھ سے بہت پیار بھی کرتی تھی۔ ایک ماں کی طرح خیال رکھتی تھی میرا مگر میں نے اسے کبھی نہیں چاہا۔ دو سال پہلے ڈیتھ ہوگئی اس کی۔ اس کے بعد کبھی موقع ہی نہیں ملا۔ کسی لڑکی کے بارے میں سوچنے کا۔ اب تم ملی ہو تو لگتا ہے میری تلاش ختم ہوگئی ہے۔ میں اپنے ہمسفر کے لیے جیسی لڑکی کا خواہشمند تھا بالآخر وہ مجھے مل گئی۔ سچی مصباح تمہارے

مقابل اگر پری بھی آسمان سے اتر کر سامنے آ کھڑی ہو تو میں نظر اٹھا کر اس کی طرف نہیں دیکھوں گا۔''

جب انسان کا ضمیر مر جاتا ہے تو وہ کچھ بھی کہتا اور کرتا ہے۔ اس کا ضمیر بھی مر گیا تھا۔ اسے یاد ہی نہیں رہا تھا کہ ابھی کچھ روز پہلے تک بنا کسی ترمیم کے ایسی ہی باتیں وہ سبین احمد حسن سے کرتا تھا۔ جسے اب مصباح آصف کے سامنے بڑے آرام سے اس نے ''مرحومہ'' بھی بنا دیا تھا۔

فہد رضا اور اس کے دیگر دوست اس کی صلاحیتوں اور قسمت پر رشک کرتے تھے۔ اس روز بلال نے اسے بتایا۔

''یار وہ تیری نئی محبوبہ ہے ناں، مصباح اس کا اکلوتا بھائی کروڑوں کی رقم اکیلا بینک سے نکلوانے چلا جاتا ہے۔ مانا پارٹی مالدار ہے۔ سب کچھ تمہارے ہاتھ آنے والا ہے مگر پھر بھی یار وہ ابھی بہت چھوٹا ہے۔ اپنی محبوبہ سے کہو، اسے منع کرے۔ آج کل کے حالات تو تم جانتے ہی ہو کسی دن مر جائے گا بچہ۔''

فہد کی اطلاع نے اس کے اندر کھلے لالچ کے پودوں کو مزید سرسبز کر دیا۔ دو تین بار وہ خود اپنی آنکھوں سے اپنے ہونے والے متوقع سالے کو قیمتی کار ڈرائیو کرتے دیکھ کر متاثر ہو چکا تھا۔ اس روز جب اس نے مصباح سے یہ بات کی کہ اس کے والد کو چاہیے کہ وہ اپنے اکلوتے بیٹے کو اتنی بڑی رقم اکیلے بینک سے نکلوانے نہ بھیجا کریں۔ تب مصباح نے اسے بتایا کہ وہ جہیز میں خود کیا کیا چیزیں لا سکتی ہے۔ اسی روز سے وہ اس کا زیادہ دیوانہ اور اس کے معاملے میں سیریس ہوا تھا ورنہ اب تک وہ سبین کے ساتھ ساتھ اس کا پرسنل نمبر بھی اپنے دوستوں سے شیئر کر چکا تھا۔ اس روز اس نے خود نئی سم لا کر اسے دی اور یوں اس بازی کو مکمل طور پر اپنے ہاتھ میں کر لیا۔

اس سے قبل اس کے بھائی نے بھی اپنی پسند سے ہی شادی کی تھی۔

مسٹر باری کے والد کو اب اپنی ناقص تربیت کا احساس ہو رہا تھا مگر اب کیا کیا جاسکتا تھا۔ اولاد ان کے سامنے ڈٹ کر آ کھڑی ہوئی تھی۔ لہٰذا وہ ہار گئے اور مسٹر باری اس کی اس ہار کا فائدہ اٹھانے سے ہرگز باز رہنے والا نہیں تھا۔ اپنے بڑے بھائی کی حرکت کا بھرپور فائدہ اٹھاتے ہوئے اس نے اپنے گھر والوں کو خبردار کر دیا تھا کہ اگر اس کے کسی شوق کی راہ میں رکاوٹ کھڑی کی گئی تو وہ بھی انہیں چھوڑ کر چلا جائے گا۔ اس کی دھمکی بہت کامیاب رہی۔ اب

گھر والوں کے سامنے لڑکیوں سے بات کرتا، بلا جھجک جس لڑکی کو چاہتا بائیک پر اپنے ساتھ بٹھا کر شہر میں گھومتا۔ لنچ اور ڈنر کرواتا۔ سبین احمد کی طرح مصباح آصف بھی اس کی خفیہ سرگرمیوں اور مشاغل سے قطعی بے خبر تھی۔

اس روز وہ اسے تنہائی میں ملنے کے لیے کالج سے زبردستی اپنے ساتھ اپنا نیا تعمیر ہونے والا گھر دکھانے لے آیا۔ مصباح آصف خوش تھی کہ وہ اس کے لیے کیا کیا کر رہا ہے۔ اس کا ہاتھ تھام کر اسے کچن، بیڈ روم، ڈرائنگ روم دکھاتے ہوئے وہ دل ہی دل میں خوش تھا تو مصباح آصف بھی اپنے نصیب پر رشک کرتی نہ تھک رہی تھی۔ باری کے بقول اس نے وہ خوبصورت بنگلہ صرف اسی کے لیے بنوایا تھا۔

مصباح نے اسے بتایا کہ وہ اس کی پوری فیملی کو بہت اچھی طرح سے جانتی ہے۔ سبین احمد کی مانند وہ قطعی بیوقوف اور سادہ نہیں تھی۔ مسٹر باری کی محبت کا دم بھرنے سے پہلے اس نے اس کی تمام کمزوریاں اور راز اپنی مٹھی میں کیے تھے۔ وہ بلا جھجک اس کے گھر کے نمبر پر جب چاہتی کال کر سکتی تھی۔ جب بھی اس کا دل چاہتا وہ اسے کال کر کے اپنے گھر بلوا لیتی۔ مسٹر باری اس کے شاندار گھر کی شان و شوکت دیکھ کر مست ہاتھی کی طرح جھومنے لگا تھا۔ اسے حاصل کرنے کے لیے اس نے کاسٹ کا مسئلہ بھی پس پشت ڈال دیا تھا۔

ان ہی دنوں اس کی بے حد نیک اور پرہیزگار دادی ماں کی ڈیتھ ہوگئی تو اس نے اپنا یہ دکھ بھی سبین احمد کی بجائے مصباح آصف سے ہی شیئر کیا تھا۔ سبین جو کبھی اسے کال نہیں کرتی تھی۔ اب ذہنی ڈپریشن اور دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر رات میں بہت دیر تک جاگ کر اسے بیل دیتی رہتی۔ مگر وہ مصباح آصف اور دیگر نئی تتلیوں کے ساتھ رومانوی گفتگو میں مدہوش اس کی کال کی پرواہ نہیں کرتا جبکہ صبح ہوتے ہی اس کی ناراضی دور کرنے کے لیے وہ نئے سرے سے ہزار قسمیں کھا کر اسے یقین دلاتا کہ وہ تھک کر سو گیا تھا۔ یا یہ کہ اس کا سیل سائلنٹ پر تھا اسے پتہ نہیں چلا۔ تب وہ اسے معاف کر کے اپنا دل صاف کرتی۔

اس روز بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ اس نے کئی روز کے بعد یونہی اسے چیک کرنے کے لیے اس کے سیل پر بیل دی تو وہ دوسری لائن پر مصروف ملا پھر اس نے بے چین ہو کر بار بار بیل دی کیونکہ مسٹر باری کے بقول وہ شاپ سے جاتے ہی تھک کر سو جاتا تھا۔ یا پھر اپنے دادا جی کے پاس چلا جاتا تھا اور وہاں سے رات میں کسی سے بھی بات نہیں کر سکتا تھا کیونکہ اس کے دادا جی بہت سخت تھے مگر اس وقت اس کا موبائل بزی مل رہا تھا۔ جس سے اسے بہت زیادہ تکلیف ہو رہی تھی۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ مسٹر باری اسے فریب دینے کے لیے خدا اور

اس کے رسولؐ کی جھوٹی قسمیں کھانا قطعی معیوب نہیں سمجھتا۔ ذہن عجیب سی کرب انگیز بے چینی کی زد میں آ گیا تھا۔ اپنی بے لوث، پاکیزہ محبت میں، محبوب کی بے وفائی کا تصور اس کے لیے مسمار ہونے کے مترادف تھا۔ بار بار اس کے سامنے رو کر شکوے گلے کرنے کے بعد اسے اپنا آپ خاصا حقیر محسوس ہونے لگا۔ لہٰذا اس نے اس سے گلے شکوے کرنے چھوڑ دیے۔ اس کا خیال تھا جب وہ مسٹر باری کی حرکتوں اور غلط سرگرمیوں کا نوٹس لینا چھوڑ دے گی تو وہ خود ہی اس کے کرب کا احساس کر کے اس کے ساتھ پہلے کی طرح محبت بھرا سلوک کرنا شروع کر دے گا مگر اس بے وقوف کو معلوم نہیں تھا کہ کسی بھی قسم کا احساس ضمیر کے زندہ ہونے سے مشروط ہوتا ہے جب کسی کا ضمیر ہی مر جائے تو اس کے لیے پھر آپ سولی پر بھی لٹک جاؤ وہ آپ کی قدر نہیں کرے گا۔

غلط راہ پر بھٹکنے والوں کی قسمت میں ٹھوکریں لکھ دی جاتی ہیں۔ سبین احمد حسن نے بھی محبت جیسے مقدس جذبے کی پذیرائی کے لیے غلط شخص کا انتخاب کر کے اپنے لیے ٹھوکریں قسمت میں لکھوا لی تھیں۔ سنان نے پاکستان سے جانے کے بعد بھی اس کی برین واشنگ کر کے اسے کسی بھی قسم کے ممکنہ نقصان سے بچانے کے لیے خاصی کوشش کی تھی مگر وہ اضطراب کے حصار میں رہ کر بھی اپنی محبت سے باز آنے والی نہیں تھی۔

اب بھی اس کے لب ہمدمان باری کی سلامتی اور خوشیوں کے لیے دعا کرتے نہیں تھکتے تھے۔ اب بھی اسے پہنچنے والی معمولی سی تکلیف اس کا خون نچوڑ لیتی تھی۔ اس کے معاملے میں نہ اسے خدا اور اپنے دین کے احکامات یاد رہے تھے، نہ ماں باپ کی عزت کی پرواہ تھی۔ کھانا، پینا، ہنسنا بولنا، دوستوں سے ملنا ملانا سب بھولتی جا رہی تھی اور مزے کی بات یہ تھی کہ جس شخص کی محبت میں وہ یہ سب کر رہی تھی اسے، اس کے دکھ کا احساس تک نہیں تھا۔ اپنی خوشیوں اور مستیوں میں گم اس شخص کو اب اس کے بارے میں ایک لمحہ سوچنے کی بھی ضرورت نہیں رہی تھی۔ اب اسے یہی یاد رہتا کہ مصباح کو سوٹ کیسا خرید کر دینا ہے۔ اسے جیولری کیسی گفٹ کرنی ہے۔ اب بزنس کے سلسلے میں بھی وہ شہر سے باہر جاتا تو اس کے لیے قیمتی سے قیمتی شاپنگ کر کے لاتا۔ جن باتوں سے اس نے سبین احمد حسن کا دل جیتا تھا اب وہ ہی باتیں اور القاب مصباح آصف کے دل میں اپنا مقام بنانے کے لیے استعمال کر رہا تھا۔

سبین نے اس کی بے نیازی سے ہرٹ ہو کر اپنا ذہن بہلانے کے لیے شاعری شروع کر دی تھی۔ اردو ادب کے ساتھ اسے شروع سے لگاؤ تھا۔ لہٰذا بہت جلد اس کی شاعری میں

نکھار آتا گیا۔ اپنی لکھی ہر نظم، غزل وہ ماہ رخ آفندی کو سناتی اور اس سے داد پا کر مزید تخلیقات میں مگن ہو جاتی۔

گھر میں آج کل اس کی شادی کے موضوع پر سلمٰی بیگم کی اپنے شوہر سے بات چیت شروع ہو گئی تھی۔ احمد حسن صاحب سنان کو اپنا داماد بنانے کے حق میں تھے۔ جبکہ سلمٰی بیگم تو گویا کب سے اپنے اسی خواب کی تعبیر کی منتظر تھیں۔ دونوں اپنے اپنے طور پر جانے کیسے کیسے خواب دیکھنے لگے تھے۔ تاہم سبین نے طے کر لیا تھا کہ اگر وہ احسان باری کی نہ ہو سکی تو اور کسی کو بھی اپنے نصیب کا حصہ بننے نہیں دے گی۔ اس نے مسٹر باری سے بھی کہہ دیا تھا کہ وہ ساری زندگی اس کے نام پر تنہا گزارے گی۔ جواب میں وہ اس کی دیوانگی پر ہنسا تھا۔ اس روز بہت دنوں کے بعد مسٹر باری نے اسے لانگ کال کی تھی۔ مصباح آصف کسی ضروری کام کے سلسلے میں شہر سے باہر اپنی خالہ کے ہاں گئی تھی اور جاتے ہوئے اس نے اپنا سیل آف کر دیا تھا۔ لہٰذا اس کی واپسی تک وہ پھر اس کی طرف پلٹ آیا۔ سبین اس روز بے حد اداس تھی کیونکہ ابھی دو روز قبل اس نے بھرپور بدتمیزی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے والدین کے سامنے سنان کے رشتے سے انکار کر دیا تھا۔ جس سے گھر کی فضا تو مکدر ہوئی ہی تھی ساتھ ہی ساتھ سمندر پار بیٹھا سنان بھی بے حد ہرٹ ہوا تھا۔ کتنی بے رحمی کے ساتھ اس نے اسے طعنہ مارا تھا۔

''میری جان کیوں نہیں چھوڑتے تم۔ دنیا میں کوئی اور لڑکی نہیں ملی تمہیں۔ مل بھی کیسے سکتی ہے۔ گھاٹ گھاٹ کا پانی پینے والوں کو اچھے لوگ کیوں اپنی بیٹی دیں گے۔ سارے لوگ میرے ماں باپ کی طرح مجبور تھوڑی ہیں۔''

اس کے الفاظ جتنے برے تھے، لہجہ اس سے بھی زیادہ کرخت تھا۔ سنان نے اس سے ایک لفظ کہے بغیر اپنا سیل آف کر دیا تھا۔ سبین کو اپنے عمل پر کوئی پشیمانی نہیں تھی۔ رومان باری کا مقام کسی اور کو دینا اس کے لیے ممکن ہی نہیں تھا مگر جانے کیا بات تھی وہ ایسا کر کے سکون محسوس نہیں کر رہی تھی۔

باری کی کال آنے سے اس کا اضطراب کم ہو گیا۔ وہ آج دو سال پہلے والے موڈ میں تھا۔ سبین کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر آئیں۔

''باری! تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ کیا تمہیں بالکل احساس نہیں کہ تم کتنے بدل گئے ہو۔''

''کہاں بدلا ہوں یار۔ تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ فضول شک کرتی ہو مجھ پر۔ تمہیں کیا پتہ میں دن بھر کتنا مصروف رہتا ہوں پھر بھی تم شک کرتی ہو۔''

''شک نہیں کرتی، تمہارے لیے فکر مند ہو جاتی ہوں۔ پتہ نہیں کیوں مجھے لگتا ہے جیسے

اب تمہاری زندگی میں میری کوئی اہمیت نہیں رہی۔ کوئی اور مل گئی ہوگی مجھ سے بہت اچھی۔''

''پھر فضول بکواس، تم بہت گندی ہو گئی ہو۔ تمہاری جگہ کوئی لے سکتا ہے؟ میری زندگی میں۔ تمہیں میرا یقین نہیں آئے گا۔ مر جاؤں گا تو پھر پچھتاؤ گی۔ خدا کی قسم سبی یہ سیل صرف تمہارے لیے ہی رکھا ہوا ہے۔ آج تم کہہ دو میں موبائل رکھنا ہی چھوڑ دوں گا۔ اب تو اتنا موٹا ہو گیا ہوں لڑکیاں دیکھتی ہی نہیں میری طرف۔ زندگی میں اور کسی چیز سے فرق پڑے نہ پڑے۔ تمہارے روٹھ کر تعلق ختم کرنے سے بہت زیادہ پڑتا ہے۔ تم بتا دو تم مجھے کیسے دیکھنا چاہتی ہو، میں ویسا ہی بن جاؤں گا ایک دفعہ کہہ کر تو دیکھو۔''

وہ پھر جان لٹا رہا تھا اس پر۔ سبین کے گلے شکوے پھر دم توڑنے لگے۔

''تم صرف مجھے بے وقوف بناتے ہو اور کچھ نہیں ہے۔ میری تو سمجھ میں نہیں آتا اگر تمہاری زندگی میں صرف میں ہی میں ہوں تو تمہیں میرے لیے وقت کیوں نہیں ملتا۔''

''بتایا تو ہے یار، دن بھر کام میں مصروف ہوتا ہوں۔ اب بھائی تو ہیں نہیں۔ ابو سے ویسے ہی کام نہیں ہوتا لے دے کر میں رہ جاتا ہوں ہر کام کے لیے۔''

''اور رات میں...... کیا رات میں بھی بزی ہوتے ہو، تمہیں تو مجھ سے بات کیے بغیر نیند نہیں آتی تھی۔ اب میسج کیے بغیر کیسے سکون کی نیند سو جاتے ہو......؟''

''سبی! کیا ہو گیا ہے تمہیں۔ تمہارا ذہن پہلے تو اتنا گندا نہیں تھا۔ قسم سے ہمارا جو تعلق ہے، پوری دنیا میں اس کی مثال نہیں مل سکتی۔ اتنا پاکیزہ اور معصوم تعلق۔ آج کل لڑکیاں لڑکے کیا نہیں کرتے۔''

''دوسری لڑکیاں لڑکے جائیں جہنم میں۔ میں صرف اپنے اور تمہارے تعلق کی بات کر رہی ہوں۔ تم دوسرے لڑکوں جیسے نہیں ہو باری۔''

''پھر کیوں شک کرتی ہو جان۔ فضول سوچ سوچ کر اپنا بھی خون جلاتی ہو اور میرا بھی۔ خدا کے واسطے میرا اعتبار کرو۔ جس دن کسی لڑکی نے میرے دل میں تمہاری جگہ لی۔ اللہ کرے میں اس دن مر جاؤں......'' مرے ہوئے ضمیر کے مالک اس شخص کو کچھ بھی کہنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ سبین کا دل پھر سے مچل اٹھا۔

''اللہ نہ کرے، کیسی فضول باتیں کرتے ہو، کتنی دفعہ کہا ہے سوچ سمجھ کر بولا کرو۔''

''پھر تم بھی فضول شک کر کے میرا دل نہ جلایا کرو ناں، جس دن کوئی ثبوت مل جائے اس دن الزام لگانا۔''

''ٹھیک ہے مگر یاد رکھنا، میں ہر دکھ ہنس کر سہہ سکتی ہوں مگر تم مجھ سے بے وفائی کرو، یہ

میں برداشت نہیں کر پاؤں گی۔ مجھے تم سے کچھ نہیں چاہیے بس میرا اعتبار سلامت رکھنا۔ جس دن تم نے میرا مان توڑا اس دن میں خود ریزہ ریزہ ہو کر بکھر جاؤں گی۔''

''چل گندی، باری جان سے جا سکتا ہے مگر تمہاری آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھ سکتا۔ جتنا پیار تم نے مجھے دیا ہے اتنا تو کبھی میری ماں نے نہیں کیا۔ میرا بہت دل چاہتا ہے اپنے گھر والوں سے تمہاری بات کروانے کو مگر مما سے ڈر لگتا ہے۔ میرے معاملے میں وہ بہت سخت ہیں۔ یاد رکھنا سبی اگر تم نے مجھے چھوڑ دیا ناں تو میں دنیا کا سب سے برا انسان بن جاؤں گا۔ تم ٹی وی پر خبریں سنا کرو گی میری۔'' وہ فنکار تھا اور اس کے مدمقابل لڑکی بہت سادہ تھی۔ شاید تبھی اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔

''میں تمہیں کبھی نہیں چھوڑ سکتی باری، ساری دنیا چاہے کچھ بھی کہے، مجھے تم سے بدگمان کرے۔ تم ہی میری زندگی میں آنے والے پہلے اور آخری شخص ہو۔ جب چاہو آزما لینا۔ میں اپنی جان بھی تم پر وار دوں گی۔''

اس سے بات کرتے ہوئے وہ یوں ہی جذباتی ہو جاتی تھی۔ احسان باری اس کی سادگی پر مسکرا کر رہ گیا۔ اگلے پندرہ بیس روز تک وہ پہلے کی طرح صبح و شام اس سے رابطے میں رہا۔ جس سے سبین کا دل پھر اس کے تصور کے حصار میں جکڑ کر نفع و نقصان سے بے نیاز ہو گیا۔

سنان کی طرف سے اسی ہفتے میں اس کی ایمرجنسی شادی کی اطلاع موصول ہو گئی تھی۔ جس نے سلمٰی بیگم کو تو بستر سے لگا دیا تھا۔ خود سنان کی والدہ کو بھی ملول کر دیا۔ شہر کے سب سے بڑے بزنس مین کی اکلوتی، نازک اندام بیٹی کے ساتھ بیاہ رچا کر بھی اس کے چہرے پر خوشی کا کوئی رنگ نہیں تھا۔ پورے دو سال بعد وہ وطن واپس لوٹا تھا۔ سبین چاہ کر بھی اس سے نظر نہیں ملا سکی، نہ ہی اس کی شادی کی تقریب اٹینڈ کر سکی۔

وہ پہلے سے بہت زیادہ کمزور اور خاموش طبع ہو گیا تھا۔ سبین نے دیکھا اس کے پہلو میں بیٹھی، اس کی بیوی ہونے کا رتبہ حاصل کرنے والی وہ لڑکی، اس سے ہزار درجہ زیادہ خوبصورت اور نفیس تھی۔ اب تو سنان کی شخصیت میں بھی عجیب سی دلکشی جھلک آئی تھی۔ وہ اس سے بے نیازی جتانا چاہتی تھی مگر جانے وہ کیسا احساس تھا جو اسے، اس سے بے نیاز ہونے نہیں دے رہا تھا۔ اسے سنان کی بیوی کو دیکھ کر عجیب سا احساس کمتری محسوس ہونے لگا تھا۔ شاید وہ اس کے لیے اتنی شاندار لڑکی مل جانے کی توقع نہیں رکھتی تھی۔ بہرحال اس کے سامنے وہ ہنستی مسکراتی ہوئی مل رہی تھی۔

پندرہ بیس روز گزرنے کے بعد جیسے ہی مصباح آصف واپس آئی مسٹر باری پھر اس سے بے نیاز ہو گیا۔ ابتدا میں وہ بات بات پر اس سے قطع تعلق کے بہانے ڈھونڈتی تھی اور

وہ ہر بار اس کی منت کر کے برین واشنگ کرتا کہ وہ اس کے سامنے بے بس ہو جاتی۔ وہ اب بھی بے بس تھی مگر اب مقابل دل آ گیا تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ اب بھی وہ اسے قطع تعلق کی دھمکی دے تو وہ مچل جائے۔ پہلے کی طرح بے تاب ہو کر کہے۔

''نہیں سبین، تم جو چاہے مجھے کہہ لو مگر تعلق ختم مت کرو، نہ ہی میں تمہیں ایسا کرنے دوں گا۔ تم میری زندگی میں آنے والی پہلی اور آخری لڑکی ہو۔ تم کو خدا کا واسطہ ہے مجھے تنہا مت چھوڑنا۔''

مگر...... ایسا کہنے کی بجائے وہ خود اسے تنہا کر رہا تھا۔ سبین اب بھی اس سے روز اول کی طرح محبت کرتی تھی۔ اب بھی اس کی معمولی سی تکلیف اسے رلا دیتی تھی۔ اب بھی دعا میں ہاتھ اٹھاتے ہوئے پہلا خیال اسی کا آتا تھا۔ اب بھی اس کے خیالوں اور خوابوں میں کھو کر وہ دین اور دنیا دونوں سے بے نیاز ہو گئی تھی مگر...... وہ بدل گیا تھا۔

اسے یاد آ رہا تھا کہ ایک بار وہ اس سے ناراض ہو گئی تھی تو وہ بیمار پڑ گیا تھا۔ راتوں رات شہر چھوڑ کر بنا کسی منزل کا تعین کیے وہ گاڑی میں سوار ہو گیا اور اپنا ایکسیڈنٹ کروا بیٹھا تھا۔ اس واقعے کے بعد سبین نے ناراض ہونے والی باتوں پر بھی اس سے ناراض ہونا چھوڑ دیا تھا۔ وہ اس کا خیال ایسے ہی رکھتی تھی جیسے کوئی ماں اپنے بچے کا خیال رکھتی ہے۔ اسی کی محبت میں سرشار اس نے شاعری بھی شروع کر دی تھی۔ روزانہ گھریلو کام کاج سے فارغ ہو کر، ناولز پڑھنے کی بجائے اب وہ رومان باری کے تصور کو ذہن میں بسائے دن بھر جانے کیا کیا لکھتی رہتی تھی۔ ہر ناول، فلم اور ڈرامے کے ہیرو میں اسے مسٹر باری کا سراپا چھلکتا دکھائی دیتا تھا۔

ماہ رخ آفندی نے اتفاق سے اس کے سیل میں مسٹر باری کے میسج اور اس کا نمبر دیکھ لیا تھا۔ سبین صحیح کہتی تھی۔ اپنے ہر میسج میں وہ اس پر نثار ہو رہا تھا مگر پھر بھی اسے چیک کرنے کے لیے سبین سے چوری چوری وہ اسے خود سے میسج کر بیٹھی۔ رزلٹ اس کی توقع کے عین مطابق آیا۔ میسج ملتے ہی مسٹر باری نے فوراً اسے کال کی۔ وہ بھی یہ دیکھنے کے لیے کہ وہ کتنے پانی میں ہے اس کے ساتھ باتوں میں لگ گئی۔ اگلے دو چار روز میں وہی شخص جسے سبین دنیا کے تمام مردوں سے قطعی منفرد ثابت کرنے پر تلی رہتی تھی اس پر لٹو ہو گیا تھا۔

اب روز رات میں پہلے مصباح آصف سے بات کرنے کے بعد وہ اپنی دوسری سم آن کر کے رات بھر اس کے ساتھ اپنے گھٹیا جذبات شیئر کرتا۔ فقط چند روز کی گفتگو میں ماہ رخ آفندی جیسی سمجھدار لڑکی کو اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ نفس کا غلام ہے۔ اسے سبین کے انتخاب محبت پر بہت افسوس ہوا۔ کسی بھی انسان کی زندگی میں پہلی محبت بہت اہم کردار ادا کرتی ہے۔ دل

کے کورے کاغذ پر لکھا جانے والا پہلا نام زندگی بھر دل سے کبھی نہیں مٹتا۔ اس لیے جو لوگ پہلی محبت کے انتخاب میں غلط انسان کے ساتھ اپنے احساسات وابستہ کر لیتے ہیں ان کی آنکھوں کے دریا پھر کوئی متبادل سہارا نہ ملنے تک ہمیشہ رواں رہتے ہیں۔

وہ سبین کو سمجھانا چاہتی تھی مگر جانتی تھی کہ جب آنکھیں اندھے عشق کے خمار میں ڈوبی ہوں تب دماغ سو جاتا ہے۔ کوئی نصیحت، کوئی عقل کی بات اثر نہیں کرتی۔ لہٰذا وہ بھی خاموش تھی۔ تاہم اس روز سبین اس سے ملنے گئی تو وہ اس سے پوچھ بیٹھی۔

''سبی...... سنا ہے تمہارا کزن پاکستان آ گیا ہے اور اس نے شادی بھی کر لی ہے۔''

''ہاں۔''

''کیوں؟ وہ تو تمہارے ساتھ انگیج تھا ناں پھر کسی اور سے شادی کیوں کی اس نے......؟'' اسے حیرانی ہوئی تھی جب وہ سر جھکا کر مجرمانہ لہجے میں بولی۔

''اسے میں نے ہی کہا تھا کہ میرا پیچھا چھوڑ دے۔ میں باری کے علاوہ اور کسی کے ساتھ زندگی بسر کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتی ماہ۔ وہ مر جائے گا۔ تم نہیں جانتیں، وہ مجھ سے کتنا پیار کرتا ہے۔ ایک بار اس نے مجھ سے کہا تھا سبی! اگر مجھ سے پہلے کسی نے تمہیں چھوا تو یہ میری محبت کی توہین ہوگی۔ تم ہی بتاؤ میں اس کی محبت کی توہین کیسے گوارہ کر لوں......؟''

ماہ رخ کا دل چاہا وہ اس کی بیوقوفی پر اپنا سر پیٹ لے۔

''اچھا...... اور اگر اس نے تم سے پہلے کسی اور سے شادی کر لی تو کیا یہ تمہاری محبت کی توہین نہیں ہوگی......؟''

''میں ایسا نہیں سوچتی، وہ مجبور ہے، اپنی مما سے بہت ڈرتا ہے۔ آج کل ویسے بھی اس کے گھر میں بہت مسائل چل رہے ہیں۔ اسی لیے رات میں بات بھی نہیں کر سکتا۔ میں اپنی وجہ سے اسے کسی امتحان میں نہیں ڈال سکتی۔ میں نے بے لوث پیار کیا ہے اس سے، خریدا نہیں ہے اسے جو زبردستی خود سے شادی کے لیے مجبور کروں۔ جانے وہ کیسی لڑکیاں ہوتی ہیں جو صرف دل کی خوشی کے لیے اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دیتی ہیں۔ میں ایسی لڑکی نہیں ہوں ماہ۔ مجھے محبت کے ساتھ ساتھ اپنی خودداری اور عزتِ نفس بھی بے حد پیاری ہے۔ اسے پانے کے لیے میں اس کے پاؤں پر نہیں گر سکتی۔''

جھکے سر اور دھیمے لہجے کے ساتھ کہتی وہ ماہ رخ آفندی کو بے حد معصوم لگی۔

بے ساختہ ہی اس کے تراشیدہ لبوں پر کٹیلی مسکان بکھر گئی۔

''بڑی کم ظرف ذات ہے مردوں کی۔ ہر عورت کو کھلونا سمجھتے ہیں۔ ایک ہی لاٹھی سے ہانکتے ہیں۔''

اس کی آنکھوں میں درد ہلکورے لے رہا تھا۔ سبین اس بار اس سے پوچھے بغیر نہ رہ سکی۔

''ماہ! تم مردوں کے اتنی خلاف کیوں ہو......؟ محبت کے موضوع کو ڈسکس کرتے ہی تمہارے لہجے میں تلخی گھل جاتی ہے کیوں......؟'' اس کا سوال ماہ رخ کے لیے غیر متوقع نہیں تھا مگر پھر بھی وہ خاموش رہی۔

''تم مجھے لیکچر دیتی ہو، اچھے برے کی پہچان کرواتی ہو مگر خود کو نہیں سمجھاتیں۔ خود بیسیوں لڑکوں سے تعلق ہے تمہارا۔ دن بھر انٹرنیٹ پر واہیات فلمیں بھی دیکھتی ہو، چیٹ بھی کرتی ہو۔ کیا تم عورت نہیں ہو۔ کیا تم مسلمان نہیں ہو ماہ......'' ماہ رخ کی توقع کے عین مطابق وہ جذباتی ہو گئی تھی۔ تبھی اس کی آنکھوں میں نمی چھلکی تھی۔

''محبت کے جن خارزار راستوں سے میں گزر کر آئی ہوں، کیا تم بھی انہی پر سفر کرنا چاہتی ہو......؟ ادھر دیکھو، میری آنکھیں، میرے ہاتھ بالکل خالی ہیں۔ میں بھٹک گئی ہوں۔ میں نے اپنے رب کی مقرر کردہ حدوں سے نکل کر اسے ناراض کر لیا ہے۔ میں جانتی ہوں وہ رحیم ہے، مجھے روتے دیکھ کر معاف کر دے گا۔ اس کی رحمت کا دروازہ بڑے سے بڑے گناہ سے وسیع تر ہے مگر...... مجھے شرم آتی ہے۔ مجھے اس سے معافی مانگتے ہوئے بھی شرم آتی ہے۔ میں بہت بری ہوں مگر پھر بھی تمہیں اس کرب سے بچانا چاہتی ہوں جو اس وقت نسلِ نو نے خود جان بوجھ کر اپنا مقدر بنا لیا ہے۔''

''کون تھا وہ؟'' اس کی آنکھوں میں جھلکتی نمی سے خائف ہو کر اس نے پوچھا، تو وہ بولی۔

''پتہ نہیں، میں تو آج تک خود نہیں جان پائی کہ وہ کون تھا اور اس نے مجھے دائمی کرب کیوں دیا۔'' اس کے لہجے میں شکستگی تھی۔ سبین چپ چاپ اس کی طرف دیکھتی رہی۔

''بڑے گرم مزاج کی لڑکی تھی میں۔ حسین سے حسین لڑکے ایڑیاں رگڑتے پھرتے تھے میرے پیچھے مگر میں اپنی خود پسندی کا شکار، ایک نگاہ ڈالنا بھی پسند نہیں کرتی تھی ان پر۔ ان دنوں اگر میری کوئی دوست مجھ سے اپنی محبت کی باتیں شیئر کرتی تو میں اسے ڈانٹ دیتی۔ مرد کی مکاری اور عورت کی بے وقوفی پر خوب لمبے لمبے لیکچر دیتی۔ میرے ذہن کے وجدان میں یہ بات بیٹھی تھی کہ کوئی بھی مرد کبھی بھی کسی ایک عورت پر اکتفا نہیں کر سکتا۔ بار بار محبت کرنا مرد اپنی شان سمجھتا ہے۔ میری دوستیں میرے گھمنڈ پر کڑھتے ہوئے مجھے بددعا دیتیں۔ خدا کرے تم منہ کے بل گرو ماہ! تب تمہیں پتہ چلے گا کہ اپنے دل کو لگے تو کتنی تکلیف ہوتی ہے۔ مجھے ان کی بددعا لگ گئی۔ میں منہ کے بل گر گئی۔'' پلکوں کو نم کرتے آنسو اب ٹوٹ کر گریبان میں

جذب ہو چکے تھے۔ سبین کا دل دکھ کر رہ گیا۔

''میری محبت کی کہانی بہت عجیب تھی۔ ایسی عجیب و غریب کہ شاید کسی نے محبت کے ایسے فریب کا تصور بھی نہ کیا ہو......'' بائیں ہاتھ سے آنسوؤں کو رگڑتے ہوئے وہ دھیرے دھیرے چلتی اپنے کمرے کی کھڑکی میں جا کھڑی ہوئی۔

''پتہ ہے سبی، میرے دل کی نگری میں جس نے پہلا قدم دھرا تھا، تم سنو گی تو حیران رہ جاؤ گی وہ شخص مجھ سے پورے پینتیس سال بڑا تھا۔ اس نے کبھی چھچھورے مردوں جیسی فضول حرکتیں نہیں کیں۔ کچھ نہ کچھ خاص تھا اس میں جو میں نے اسے لفٹ دی۔''

''وہاٹ......؟''

''ہاں سبی، تم شاید یقین نہ کرو مگر اس شخص نے کبھی مجھے دیکھا نہیں تھا۔ نہ ہی میں اس کے بارے میں کچھ جانتی تھی۔ کالج کو خیر باد کہنے کے بعد جب میں نے سیل نمبر بدلا تو اپنی ایک دوست کو اپنا نیا نمبر دے دیا۔ میں نہیں جانتی تھی کہ اس کی شادی طے ہے۔ وہ بیاہ کر چلی گئی اور اس نے رابطہ منقطع کر دیا۔ چند روز میں، میں بھی اسے بھول گئی بعد ازاں اس کے ہی نمبر سے وہ شخص میری دنیا میں در آیا۔ میں نے فرسٹ کال پک کرنے کے بعد دوبارہ اسے لفٹ نہیں دی۔ یہ تک نہیں پوچھا کہ اس کے پاس میری دوست کے ساتھ ساتھ میرا نمبر کیسے آیا؟ مگر اس نے میرا پیچھا نہیں چھوڑا۔ بے حد میچور ہو کر بھی وہ ٹین ایج لڑکوں کی طرح مجھ سے بات کرنے کی درخواست کر رہا تھا۔ میں نے اس سے دامن بچانے کے لیے یہ جھوٹ بھی بولا کہ میں شادی شدہ اور دو بچوں کی ماں ہوں مگر اسے میرے اس جھوٹ سے بھی کوئی فرق نہیں پڑا۔ عجیب دیوانہ شخص تھا۔ رات کا ایک ایک پہر جاگ کر مجھے میسج اور کالز کرتا مگر میں موبائل سائلنٹ پر رکھ کر پوری رات سکون سے سوئی رہتی۔ تم یقین کرو وہ شخص بھر رات ایک ہی میسج ہر سیکنڈ بعد کرتا رہتا۔ ''زندگی جی میں مر جاؤں گا۔'' اپنی زندگی کہتا تھا وہ مجھے۔ میں اس کی دیوانگی سے موم ہو گئی۔ ایسی محبت اور شدت وہ بھی کسی میچور انسان کی طرف سے میرے لیے قطعی نئی بات تھی۔ مجھے وہ شخص لب و لہجے سے بے حد سادہ اور مظلوم لگا۔ تم سوچ بھی نہیں سکتیں کہ میں نے اس سے جان چھڑانے کے لیے کیا کیا طریقے نہیں آزمائے۔ جی بھر کر انسلٹ کرنے کے بعد میں نے پورے چار ماہ اپنا سیل مسلسل آف رکھا۔ کبھی کبھار ضرورت پڑنے پر آن کرتی تو فوراً اس کی کال آنا شروع ہو جاتی۔ یوں لگتا جیسے وہ شخص ہر وقت موبائل ہاتھ میں لیے میرا نمبر چیک کرتا رہتا ہو۔ میں سچ مچ اس کی دیوانگی دیکھ کر حیران رہ گئی۔ میرے صرف ایک منٹ بات کرنے پر اس شخص کے لہجے سے چھلکنے والی خوشی محسوس کرنا میرا دلچسپ مشغلہ تھا۔ وہ بچوں کی طرح خوش ہو کر یوں ممنونیت کا اظہار کرتا کہ میں

خوامخواہ ہی ہواؤں میں اڑنے پر مجبور ہو جاتی۔'' رفتہ رفتہ اس کی جنوں خیز دیوانگی نے مجھے اس سے گاہے بگاہے بات کرنے پر مجبور کر دیا۔ اس سے بات کرتے ہوئے مجھے ہمیشہ اس کے لہجے میں ایک عجیب سا درد چھلکتا محسوس ہوتا تھا۔ بعد میں اس نے خود بھی بتایا کہ وہ بالکل اکیلا رہتا ہے۔ ماں کی وفات کے بعد اس کی باغی طبیعت نے کسی کے اصولوں سے سمجھوتہ نہیں کیا۔ لہٰذا وہ تنہا رہ گیا۔ اس کے بہن بھائیوں یہاں تک کہ باپ کو بھی اس کی کوئی پروا نہیں تھی۔ کسی کو اس کے جینے مرنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ میں مضبوط دماغ اور مضبوط کردار کی لڑکی تھی مگر اس کے دکھوں نے میرا دل موم کر ڈالا۔ اس نے مجھے بتایا تھا کہ اسے میرا نمبر سم کے ساتھ سیکنڈ ہینڈ موبائل خریدنے پر ملا۔ میں یہی سمجھی کہ شاید میری دوست کو موبائل بیچتے وقت سم نکالنے کا خیال نہیں رہا ہو گا اور یوں اللہ نے معجزاتی طور پر ایک انمول شخص کو میری دنیا میں بھیج دیا۔ وہ ویسا ہی تھا جیسا میں اپنے لیے چاہتی تھی۔ بے حد ذمہ دار، نرم گو اور ضرورت سے زیادہ خیال رکھنے والا۔ اس کی باتیں اتنی اچھی اور سادہ ہوتی تھیں کہ میں کبھی اس کی محبت کی سچائی پر شک کرنے کا سوچ بھی نہ سکی۔ رفتہ رفتہ اس کی آئیڈیل شخصیت کے سحر میں الجھ کر میں نے کب اپنے ہر خواب اور مسئلے کا سرا اس کی ذات سے جوڑ دیا، مجھے خبر ہی نہ ہو سکی۔ مجھے یہ بات معتبر کرتی تھی کہ ایک شاندار شخص صرف مجھ سے جنون کی حد تک محبت کا دعوے دار ہے بلکہ وہ میری پرستش بھی کرتا ہے۔ میری چھوٹی سے چھوٹی بات اس کے لیے زندگی اور موت کا مسئلہ تھی۔ آہ! کچھ فریب ایسے ہوتے ہیں کہ انسان کو آخر تک اپنی بربادی کا پتہ نہیں چلتا اور وہ ختم ہو جاتا ہے۔''

پلکوں کے ساتھ ساتھ اس کے لہجے میں بھی نمی چھلک آئی۔ سبین دھیرے سے چلتی اس کے قریب آ کر کھڑی ہو گئی۔

''جیسے جیسے تعلق بڑھا، میری توجہ بھی اسے نصیب ہو گئی۔ کبھی کبھی اس کی کچھ مشکوک حرکتیں مجھے چونکا دیتیں۔ بات کرتے کرتے وہ اکثر گھبرا کر بتائے بنا کال کاٹ دیتا۔ کبھی تیز آواز میں ٹی وی آن کر کے بات کرتا۔ اس نے مجھے بہت خوبصورت خواب دکھائے تھے۔ اتنے خوبصورت کہ کوئی بھی لڑکی ان کے حصول کے لیے پاگل ہو جاتی۔ میں پاگل نہیں ہوئی تھی مگر دل میں قسم کھالی کہ اس کے سوا میری زندگی میں دوسرا کوئی مرد نہیں آئے گا۔ مجھے خوشی تھی کہ میں نے زندگی سے بیزار ایک انسان کو اپنی محبت سے جینے کی امنگ دی تھی۔ وہ خوش رہنے لگا تھا۔ میری محبت نے اسے اللہ سے قریب کر دیا تھا۔ شب برات، شب معراج اور دیگر مقدس راتوں میں پل پل میرے ساتھ جاگ کر صرف میری ہی رفاقت کی دعائیں مانگنے والے اس شخص نے مجھے ہی اللہ سے دور کر دیا تھا۔ کبھی کبھی وہ بڑی عاجزی سے دعا مانگتے

ہوئے کہتا۔ یا اللہ مجھ سے میری ساری دولت، شان وشوکت سب کچھ لے لے۔ بس میری ماہ رخ مجھے دے دے اور کبھی بہت بے بس ہو کر کہتا۔ ماہی، مجھے اپنا نوکر رکھ لو۔ تمہارے سارے کام کروں گا اور کوئی تنخواہ بھی نہیں لوں گا۔ جانے کیسی کیسی باتیں کی تھیں اس نے۔ میں اس کی دیوانگی میں مدہوش رہتی تو شاید کبھی اس کاغذی محبت کے چہرے سے نقاب نہ ہٹا سکتی۔''

پھر سے ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے وہ کھڑکی سے ہٹ آئی۔

''میں تمہیں مرد کی محبت کے فریب سے آشنا کرانا چاہتی ہوں۔ اس شخص نے مقدس راتوں میں مسجدوں میں کھڑے ہو کر اللہ، اس کے رسولؐ اور اس کی پاک کتاب کی قسمیں کھا کر یہ یقین دلایا تھا کہ میرے سوا اس کی دنیا میں کسی عورت کا کوئی وجود نہیں مگر......اس کی ہر قسم جھوٹی تھی۔ میری کل عمر بھی تیس سال نہیں تھی اور اس شخص کی شادی کو تیس سال سے زائد ہو گئے تھے۔ اس کی بیٹیاں مجھ سے بڑی تھیں۔ پورے ڈیڑھ سال بعد مجھ پر آشنائی کے در وا ہوئے تھے۔ پورے ڈیڑھ سال بعد اس لڑکی سے پھر میرا رابطہ استوار ہوا تھا جو میری دوست اور اس شخص کی بیٹی تھی۔''

وہ بول رہی تھی اور سبین حیرانی سے ٹکر ٹکر اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

''مرد کی محبت کے فریب کے ہزار رنگ ہوتے ہیں۔ میری بدقسمتی دیکھو، میں نے محبت میں فریب کھایا اور ساری ملامتیں بھی میرے ہی حصے میں آئیں۔ اس شخص کی بیوی نے مجھے ایک بازاری عورت سمجھ لیا۔ اس کے بچے حقیقت سے آشنا ہونے کے بعد مجھے گالیاں دے رہے تھے اور بیٹے نے کئی روز مجھے پریشان کیا۔ میں جو بے خبری میں کسی کی مظلومیت سے ہار گئی تھی۔ کیسی کیسی نفرتوں کے تیر کھانے نہیں پڑے مجھے اور وہ شخص جو ایک لمحہ بھی میرے بغیر سانس لینے کا روادار نہیں تھا۔ وہ یوں نظریں پھیر گیا جیسے مجھ سے کبھی اس کا واسطہ ہی نہ رہا ہو۔ شہد ٹپکانے والے لہجے میں ایک دم سے حد درجہ حقارت اتر آئی۔ پہلے جیسے وہ مجھے قسمیں کھا کر اپنے پارسا ہونے کی یقین دہانی کراتا تھا۔ اب اپنے چہرے سے نقاب اترنے کے بعد اپنی بیوی کو قسمیں دے کر اپنی وفاداری کا یقین دلا رہا تھا۔ پہلی محبت کے اس قطعی غیر متوقع انجام نے میرے اعصاب مفلوج کر دیے تھے۔ میرے لیے دنیا سے سکون ختم ہو گیا تھا۔ سوتے جاگتے اٹھتے بیٹھتے اس شخص کی باتیں میرے دماغ میں بھونچال اٹھائے رکھتیں۔ نماز، قرآن، اللہ، دین کچھ بھی یاد نہیں رہا تھا مجھے۔ اسی لیے بھٹک گئی۔ صرف سکون پانے کے لیے میں نے خود اپنے لیے غلط راستے کا انتخاب کر لیا۔ ایک شخص کے فریب کو ذہن سے جھٹکنے کے لیے مجھے کیا کیا پاپڑ بیلنے پڑے۔''

ہاتھ سختی سے کرسی کی پشت پر جمائے وہ اپنے آنسو ضبط کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔
جب سبین نے آگے بڑھ کر خود اپنے ہاتھوں سے اس کے آنسو پونچھ دیے۔

''تم رومان باری کی اصلیت جاننا چاہو گی......؟'' اچانک سر اٹھاتے ہوئے اس نے پھر اسے سرپرائز کیا تھا۔

''کیسی اصلیت......؟''

''وہی اصلیت جو تم سے پوشیدہ ہے۔ ابھی دیکھو، میری بات پر تم کبھی بھی یقین نہیں کرو گی......'' قطعی جذباتی انداز میں کہتے ہوئے اس نے اپنا سیل اٹھایا اور مسٹر باری کا موبائل نمبر پریس کر ڈالا۔ سبین بے حد حیرانی سے ٹکر ٹکر اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ یہ وقت رومان باری کے لیے بے حد مصروفیت کا تھا۔ شروع کے ابتدائی چھ سات ماہ کے علاوہ وہ دن میں اس ٹائم بہت کم اسے کال کرتا تھا۔

''ہیلو......''

''ہاں سوہنی، بولو کیا بات ہے۔ آج خود سے کیسے یاد کر لیا میری زندگی نے......؟'' ماہ رخ کے ہیلو کے جواب میں اس کے موبائل اسپیکر سے گونجنے والی آواز بلاشبہ رومان باری کی ہی تھی۔ اسی رومان باری کی جو خدا کی پاک ذات کی قسم کھا کر یہ یقین دلاتا نہیں تھکتا تھا کہ اس کی زندگی میں کوئی دوسری لڑکی نہیں ہے۔ اس بار اوندھے منہ گرنے کی باری سبین احمد حسن کی تھی۔

''بس یوں ہی فارغ بیٹھی بور ہو رہی تھی۔ سوچا تمہیں چیک کر لوں کہیں اور تو بزی نہیں ہو؟'' ماہ رخ کا انداز بتا رہا تھا کہ یہ گفتگو پہلی نہیں تھی جب کہ احسان باری نے اس کی بات پر اپنے مخصوص انداز میں قہقہہ لگایا۔

''تم بہت خراب ہو، کیسے یقین دلاؤں کہ میرا کسی لڑکی سے کوئی افیئر نہیں ہے۔ اتنا وقت ہی نہیں ہوتا میرے پاس کہ اتنی سویٹ لڑکی کو نظر انداز کر کے اور لڑکیوں کے پیچھے بھاگوں۔''

یہ آواز، یہ لہجہ وہ لاکھوں نہیں، کروڑوں میں پہچان سکتی تھی۔ اعصاب کو ایک دم سے شدید دھچکا لگا تھا۔

''شادی کب ہو رہی ہے تمہاری......؟''

''پتہ نہیں۔ میری ماں کو مصیبت پڑی ہے گلے میں پھندا ڈالنے کی۔ ادھر وہ لڑکی کہتی ہے باری سے شادی نہ ہوئی تو اپنی جان دے دوں گی۔ میرا دل نہیں مانتا۔ بڑی ہوشیار لڑکی ہے۔ کردار بھی ٹھیک نہیں مگر میری ماں کو اس کی اصلیت کا پتہ نہیں۔ شاندار گھر بار دیکھ کر

راضی ہوگئی ہیں۔ میں تو چچا کا سہارا بننا چاہتا تھا۔ ان کی پانچ بیٹیاں ہیں۔ بیٹا کوئی نہیں پھر بڑے بھائی نے بھی کمینگی دکھائی ہے مگر...... میری ماں کو کون سمجھائے۔ میں نے تو صاف کہہ دیا ہے آپ جانیں اور وہ لڑکی، میرا کوئی واسطہ نہیں۔''

''کیا نام ہے اس لڑکی کا......؟'' وہ جان بوجھ کر ایسے سوال پوچھ رہی تھی۔ وہ بولا۔

''مصباح آصف۔''

''چلو ٹھیک ہے۔ اللہ تمہارے حال پر رحم کرے۔ میں اب جاتی ہوں کچن میں، تم بھی اپنا کام کرو۔''

''کرلیں گے یار کام بھی، قسمت سے آج کال کر ہی لی ہے تو دو منٹ رک جاؤ ناں۔'' اس کے لہجے میں پورے ڈیڑھ سال بعد اصرار چھلکا تھا مگر اس کے لیے نہیں کسی اور کے لیے۔ سبین کو لگا اس کے اعتبار کی دھجیاں اڑنے کے ساتھ ساتھ اس کی ذات بھی ایک دم بلاسٹ ہوگئی ہو۔ وہ جس کے پاس آج کل اس کے لیے ایک منٹ بھی نہیں تھا۔ وہی ''مصروف ترین'' شخص کسی اور کے لیے مچل رہا تھا۔

ماہ رخ نے کن انکھیوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے فوراً معذرت کرتے ہوئے فون بند کردیا۔

''دیکھا سبی، کہا جاتا ہے ہاتھ کی پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہوتیں مگر...... مرد کی فطرت میں کوئی چینج نہیں۔ کسی بھی مرد کی سوچ اور طلب کس لمحے، کس موڑ پر رخ بدل لے۔ کچھ پتہ نہیں چلتا۔ بہت دن پہلے ہی میں تمہیں اس لڑکے کی سرگرمیوں کے بارے میں بتانا چاہتی تھی مگر تمہاری ناراضی کے ڈر سے چپ رہی۔ یہ شخص جس کے لیے تم اپنی پوری زندگی داؤ پر لگائے بیٹھی ہو۔ اس قابل بھی نہیں کہ تم ایک لحہ بھی اس کے بارے میں سوچو۔ شہر بھر کی بیسیوں لڑکیوں کے ساتھ دوستیاں گانٹھ رکھی ہیں اس نے۔ چار چار موبائل فون اور بے شمار سم ہیں۔ کبھی ایسا دن طلوع نہیں ہوا جس کی پوری رات اس کا موبائل بزی نہ رہتا ہو۔ حال ہی میں اپنی منگنی توڑ کر شہر کی ایک مالدار لڑکی کے ساتھ تعلق جوڑا ہے اس نے۔ جب دل چاہتا ہے بائیک پر ساتھ بٹھا کر شہر میں گھماتا پھرتا ہے۔ اس نے ایک سے بڑھ کر ایک آوارہ دوست پال رکھے ہیں۔ یہ جو رانگ کالز آتی رہتی ہیں تمہیں یہ سب اسی کے کرتوت ہیں۔''

ماہ رخ اور بھی جانے کیا کیا کہہ رہی تھی مگر اس کی سماعت تو برف ہوگئی تھی۔

اس روز وہ ماہ رخ کے گھر سے واپس آئی تو زندگی اس کے ساتھ نہیں تھی۔ زندہ لاش کی مانند اپنے بوجھل وجود کو گھسیٹتی وہ اپنے کمرے میں آتے ہی پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔ اسے اپنی محبت کو بے مثال بنانا تھا۔ مصنوعی جذبوں کے دور میں اپنے محبوب کو سب سے منفرد

ثابت کر کے خود کو خوش قسمت بنانا تھا۔ وہ تو جان ہتھیلی پر لے کر بیٹھی تھی۔ ادھر رومان باری اشارہ کرتا اور وہ چٹان بن کر سارے زمانے سے ٹکرا جاتی۔ آج تک اپنے لیے اس نے کچھ بھی نہیں مانگا تھا۔ وہ تو اس کا دائمی ساتھ بھی اسی لیے چاہتی تھی تاکہ اس کی محرومیوں کا ازالہ اپنے بے تحاشا پیار سے کر سکے۔ پھر کیوں کھلونا سمجھا گیا اسے......؟ وہ جتنا سوچ رہی تھی دل اتنا ہی کٹتا جا رہا تھا۔ وہ رات قیامت کی تھی اس کے لیے۔ بہت دنوں کے بعد اس نے خود سے اس کا نمبر ڈائل کر کے چیک کیا تھا اور واقعی آدھی رات کے اس پہر میں اس کا سیل کال ویٹنگ پر جا رہا تھا۔ شاید نہیں یقیناً اب اسے سبین احمد حسن کا کوئی ڈر خوف نہیں رہا تھا۔

اس رات پورے تین گھنٹے تک وہ اسے بیل دے کر چیک کرتی رہی تھی مگر رومان باری نے قطعی کمینگی کا مظاہرہ کرتے ہوئے نہ تو اس کی کال پک کرنا گوارا کی، نہ ہی اپنی ''مصروفیت'' پس پشت ڈال کر خود سے اسے کال کرنے کی زحمت کی جس کے بعد اس کا رہا سہا حوصلہ بھی بکھر گیا۔

محبوب کے مزاج کی اچانک تبدیلی اور محبت کے موسم میں اس اچانک خزاں نے اسے سر سے پاؤں تک صدمے کی کیفیت میں مبتلا کر دیا تھا۔ فجر کی نماز کے بعد وہ فارغ ہوا تو اسے کال کرنے کی زحمت کی مگر سبین میں اس سے بات کرنے کا حوصلہ نہیں تھا۔ اس نے اپنا سیل آف کردیا۔ تاہم اسی روز شام میں خود اس نے اسے کال کی تھی۔

''ہاں بولو جانی، کیا پرابلم ہے، رات میں آپی سے بات کر رہا تھا۔ جب تمہاری کال آرہی تھی۔ اسی لیے پک نہیں کرسکا، خیریت تو تھی ناں؟''

وہ شخص مکار بہروپیا تھا۔ سبین کا غصہ آسمان کو چھو گیا۔

''بکواس بند کرو مسٹر باری اور کتنا جھوٹ بول کر فریب دیتے رہو گے تم۔ میں تمہاری اصلیت سے اچھی طرح واقف ہوچکی ہوں۔ تم بھی عام لڑکوں جیسے نکلے، کیوں......؟ کیوں فراڈ کیا تم نے میرے ساتھ؟''

''کیا فراڈ کیا ہے میں نے......؟'' اس کے رونے پر یکلخت اس کا لہجہ بدل کر کرخت ہوگیا۔

تبھی وہ چلاتے ہوئے بولی۔ ''تم نے دھوکہ دیا ہے مجھے، شہر بھر کی لڑکیوں سے تعلقات ہیں تمہارے اور تم صرف میرے پیار کی قسمیں کھاتے رہے؟'' اس سے بولا نہیں جا رہا تھا۔ دوسری طرف وہ مزید اجنبی ہوگیا۔

''بکواس بند کرو۔ ہر وقت کا رونا دھونا اور الزام تراشی کرنا تمہاری عادت بن چکا ہے، جاؤ کام کرو اپنا اور مجھے بھی کرنے دو۔''

''تم کتنے گھٹیا انسان ہو یہ بہت دیر کے بعد پتہ چلا ہے مجھے۔ تمہاری ماہ رخ آفندی سے ہونے والی تازہ بکواس میں خود اپنے کانوں سے سن کر آ رہی ہوں۔ یہی تازہ مصروفیات ہیں تمہاری۔ آج تک میں صرف شک کرتی تھی مگر تمہارے گھٹیا پن کا ثبوت آج ملا۔ تم اس قابل ہی نہیں تھے کہ مجھ جیسی لڑکی تم سے محبت کرتی۔''

وہ چلّا کر دل کا سارا غبار نکالنا چاہتی تھی مگر مسٹر باری نے اسے مزید کچھ کہنے کا موقع دیے بغیر کال کاٹ دی۔ وہ شخص اپنی اصل شکل کے ساتھ سامنے آ گیا تھا مگر سبین کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ ایسی صورتحال میں کیا کرے؟ اب تک جو خواب اس فریبی شخص نے اسے دکھائے تھے۔ ان میں ایسی کسی صورتحال کا کوئی گزر نہیں تھا۔ سلمٰی بیگم اسے شام کے کھانے کی تیاری کے لیے آوازیں دے رہی تھیں مگر اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ خواب آور گولیاں کھائے اور ہمیشہ کے لیے پرسکون ہو کر سو جائے۔ اندھے اعتبار کا شیشہ یوں چور چور ہوا تھا کہ اس کی کرچیاں سبین کو اپنی روح میں چبھتی محسوس ہو رہی تھیں۔

سنان اور اس کی بیوی آئے تھے۔ ایسے میں اماں کے ہاتھوں گالیوں کوسوں کا شکار بننا بہت شرمندگی کا باعث تھا۔ لہٰذا اپنے چور چور وجود اور جلتی آنکھوں میں مچلتے آنسو پیتے ہوئے اس نے جیسے تیسے شام کا کھانا تو تیار کر دیا مگر دن بھر کی بھوک کے باوجود ایک نوالہ بھی حلق سے اتارنے کی متحمل نہ ہو سکی۔

سنان اس کے گریز اور اداسی کو سمجھتے ہوئے بھی سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ جانے کیوں اس نے اس سے بات نہ کرنے کی قسم کھا لی تھی۔

اسی رات بستر پر لیٹے ہوئے اس نے پھر باری کو کال کی۔ مقصد اس کی بے وفائی کا سبب پوچھنا تھا مگر دوسری طرف وہ کال پک کرتے ہی شروع ہو گیا۔

''اب کیا مصیبت ہے تمہیں، خدا کا واسطہ ہے جان چھوڑ دو میری۔'' قطعی بدلے ہوئے لہجے کے ساتھ کرختگی سے کہتا وہ اس کا دل ٹکڑے ٹکڑے کر گیا۔ وہ دکھی ہو کر چلّا بھی نہ سکی۔

''تم شروع سے گھٹیا تھے رومان باری! اپنے بارے میں بالکل صحیح کہتے تھے تم، میں ہی عقل کی اندھی تھی جو تمہاری فریبی باتوں میں آ گئی مگر مجھے میرا قصور تو بتاؤ۔ کیوں کھیلے تم میرے معصوم احساسات کے ساتھ، جب میں تمہاری منزل نہیں تھی تو کیوں اب تک جھوٹی قسمیں کھا کر مجھے اپنے حصار میں لیے رکھا تم نے آخر کیوں؟''

''تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ سارا شہر لڑکیوں سے باتیں کرتا ہے، میں نے کر لیں تو کون سی قیامت آ گئی۔'' اسے اپنے کسی فعل پر کوئی ندامت نہیں تھی۔ سبین کے اندر جیسے بہت کچھ ٹوٹ کر بکھر گیا۔

''میں نے تمہیں دوسروں سے مختلف سمجھا تھا۔''

''تو یہ تمہاری غلطی تھی ناں، میں نے تمہیں کبھی حلف اٹھا کر اپنی پارسائی کا یقین نہیں دلایا۔ اب پلیز دوبارہ ڈسٹرب مت کرنا مجھے۔'' درشتگی سے کہتا وہ پھر کال کاٹ گیا۔ سبین کو لگا جیسے وہ آسمان سے اوندھے منہ زمین پر آ گری ہو۔ محبت کی تتلی کے پیچھے بھاگتے بھاگتے اس نے خود اپنی دل کشی کے رنگ کھو دیے تھے۔ اس وقت لہولہو ہوتے دل کا ہر قطرہ رومان باری کے لیے بد دعا کر رہا تھا۔ ابھی کل ہی تو اس نے اللہ سے دعا مانگی تھی کہ وہ پاک ذات اسے سچائی سے آشنا کر دے۔ رومان باری کی محبت کا معمہ اس پر کھول کر اسے حقیقت سے روشناس کرا دے اور بے شک اس کی دعا بارگاہ الٰہی میں قبول ہو گئی مگر آشنائی کا یہ درد اس کی برداشت سے باہر تھا۔

غم و غصے سے اس کے دماغ کی شریانیں پھٹنے کو تھیں۔ رات کا ایک ایک پل عذاب کی صورت میں آنکھوں میں کاٹنے کے بعد صبح ہی وہ سلمٰی بیگم کو بتائے بغیر ماہ رخ کی طرف چلی آئی۔

''ماہی...... کیا تم مجھے اس لڑکی سے ملوا سکتی ہو جس سے وہ شادی کر رہا ہے۔''

ماہ رخ اس وقت شاور لینے کا سوچ رہی تھی۔ جب وہ اس کی مما کو دعا و سلام کرنے کے بعد اس کے پاس چلی آئی۔

''کیا کرو گی اس سے مل کر......؟'' جواب دینے کی بجائے وہ اس سے سوال کر بیٹھی۔

''کچھ نہیں، میں دیکھنا چاہتی ہوں اس لڑکی میں ایسا کیا ہے جو رومان باری کو مجھ میں نظر نہیں آتا۔ ہو سکتا ہے وہ واقعی مجبور ہو، گھر والوں نے پریشرائز کیا ہوا سے۔'' وہ اب بھی اپنی کاغذی محبت کی ناؤ کو ڈوبنے سے بچا رہی تھی۔ ماہ رخ اس کی سادگی پر بے ساختہ مسکرا اٹھی۔

''تم صرف بے وقوف ہی نہیں بہت معصوم بھی ہو۔ ابھی تک بیس سال پہلے کے زمانے میں رہ رہی ہو۔ اب لوگ ایسے نہیں ہیں۔ آپ کے اندر جھانک کر دیکھنے والے، آپ کے سچے پیار کی قدر کرنے والے۔ اب تو جذبوں کی سیل لگ گئی ہے مائی ڈیئر۔ جہاں جذبات سستے میں بکے وہیں لپکتے ہیں۔ محبت اب روح نہیں جسم ہو گئی ہے یار۔ نت نئی مصنوعات کی ایجاد کے اس دور میں دل کے خالص جذبات بھی مصنوعی ہو کر رہ گئے ہیں۔ ہم عورتوں کے ساتھ بہت بڑا المیہ یہ ہے کہ ہم ہمیشہ جذبات کے ہاتھوں ذلیل ہوتی ہیں۔ کوئی لاکھ سمجھاتا رہے، غلط راہ سے روکتا رہے۔ جب تک ذاتی نقصان نہیں ہوتا ہم کچھ سمجھنا ہی نہیں چاہتیں۔ محبت کی نگری میں سب پر ایک جیسا قانون لاگو نہیں ہوتا مگر پہلی محبت دل کے کورے کاغذ پر

کھدنے والا پہلا نام، ساری زندگی کچھ بھولنے بھی نہیں دیتا۔'' اس موضوع پر لیکچر دیتے ہوئے ماہ رخ آفندی کے اپنے زخم ہمیشہ ہرے ہو جاتے تھے۔

''بہرحال، آج مسٹر باری سے اس کی نئی مال دار محبوبہ کے متعلق پوچھ کر کل میں تمہیں اس سے ملوادوں گی۔'' ماہ رخ آفندی نے اس سے وعدہ کر لیا اور اپنے وعدے کے عین مطابق اگلے روز وہ لڑکی ماہ رخ آفندی کے گھر میں اس کے مقابل تھی۔ سبین احمد حسن اپنی اور اس کی حیثیت میں فرق اس کے شاندار لباس اور جیولری سے ہی جان گئی تھی۔ ماہ رخ کے بلاوے پر وہ جیسے ہی اس کے روم تک پہنچی اس نے خود آگے بڑھ کر اس کا استقبال کیا۔

''آؤ سبی...... یہ مصباح ہے، میری بہت پرانی دوست، اسی کی وجہ سے باری سے ہیلو ہائے ہوئی تھی میری۔ ابھی میں نے تمہارے اور مسٹر باری کے تعلق کے بارے میں اسے کچھ بھی نہیں بتایا ہے، بہتر ہے تم خود ہی اس سے بات کر لو۔'' ماہ رخ اسے مصباح آصف سے متعارف کروا کے خود کمرے سے نکل گئی۔

''کون ہیں آپ اور باری کو کیسے جانتی ہیں......؟''

اس کی طرح شاید مصباح آصف کو بھی رومان باری سے اس کے تعلق کو جان کر جھٹکا لگا تھا۔ یہی وہ لمحہ تھا جب اس نے ضبط کا دامن چھوڑا۔

''سبین احمد حسن کہتے ہیں مجھے اور باری کی پہلی محبوبہ ہوں۔ میرے نام پر جینے مرنے کی قسمیں کھائی تھیں اس نے۔''

''شٹ اپ، سبین احمد مرچکی ہے۔ باری نے خود مجھے بتایا تھا۔ تم جھوٹ بول رہی ہو۔'' اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی وہ چلاّ اٹھی۔

''مجھے کوئی ضرورت نہیں تم سے جھوٹ بولنے کی۔ ابھی کال کرو تمہارے سامنے اس سے بات کر کے یہ دکھاتی ہوں کہ میں زندہ ہوں یا مرگئی۔'' اس کا اپنا حوصلہ ڈولنے لگا تھا۔ بے خبری میں آتے ہوئے وہ سیل بھی ساتھ نہیں لائی تھی۔ تاہم اس سے پہلے کہ مصباح آصف اسے کچھ کہتی، اس کے سیل پر اسی وقت مسٹر باری کی اتفاقیہ کال آ گئی جسے اس نے فوراً پک کر لیا۔

''ہیلو جانو، کیا کر رہی ہو......؟''

وہ بے حد فریش لگ رہا تھا۔ تاہم مصباح آصف اپنا غصہ کنٹرول نہ رکھ سکی اور اس پر پل پڑی۔

''شٹ اپ، تم نے مجھ سے بکواس کی تھی کہ سبین نام کی جو لڑکی تمہاری زندگی میں تھی وہ مرچکی ہے مگر وہ لڑکی زندہ ہے اور میرے سامنے کھڑی تم سے اپنے تعلق کا اعتراف کر رہی

ہے۔''

''یہ بکواس ہے گڑیا، میں تمہارے سوا کسی لڑکی کو نہیں جانتا۔ وہ جو کوئی بھی ہے تم سے جھوٹ بول رہی ہے۔'' دوسری طرف وہ بے حد پریشان ہو گیا۔

''اوکے، ایسی ہی بات ہے تو یہ لو، تم خود اس سے بات کرو۔'' کہنے کے ساتھ ہی اس نے موبائل قریب کھڑی سبین کو پکڑا دیا تو وہ اس سے الجھ پڑا۔

''بولو...... کیا فضول بکواس کر رہی ہو تم، خبردار جو گڑیا کو کوئی بھی الٹی سیدھی بات بتائی تم نے۔''

''کیوں نہ بتاؤں اسے میں الٹی سیدھی بات، تم نے ایک ساتھ دو لڑکیوں کو فریب دیا ہے۔ پورے ڈیڑھ سال تک میرے معصوم جذبات کے ساتھ کھیلتے رہے اور اب راستہ بدل کر اس لڑکی کی نظروں میں پارسا بن رہے ہو۔ نہیں باری میں تمہیں اتنی آسانی سے ایسا نہیں کرنے دوں گی۔''

وہ کیوں چپ رہتی۔ دوسری طرف مسٹر باری نے موبائل ہی آف کر دیا۔ اسی اثنا میں ماہ رخ بھی کمرے میں آ گئی تو مصباح آصف اسی سے الجھ پڑی۔

''ماہی، یہ لڑکی کون ہے اور باری سے کیا تعلق ہے اس کا، پلیز مجھے بتاؤ۔'' اس سے برداشت نہیں ہو رہا تھا۔ شکل روہانسی ہو رہی تھی۔ تب ماہ رخ نے الف سے یے تک سبین احمد سے اس کے تعلق کی ساری کہانی کہہ سنائی جسے سن کر وہ اپنے آنسوؤں پر قابو نہ رکھ سکی۔

''یہ جھوٹ ہے ماہی، اس نے ہزار قسمیں کھا کر مجھے یقین دلایا تھا کہ اس کی زندگی میں میرے سوا دوسری کوئی لڑکی نہیں۔ صرف میری محبت میں اپنی پہلی منگنی توڑ کر اپنے گھر والوں کو میرے لیے راضی کیا۔ اس سے میرا تعلق بہت گہرا ہے۔ وہ دو دن میری وجہ سے کھانا نہیں کھاتا تو اس کی ماں فون کر کے میری منت کرتی ہے کہ میں اسے کھانے کے لیے کہوں۔ پچھلے ایک سال میں کوئی رات ایسی نہیں گزری جب اس نے پوری رات مجھ سے بات نہ کی ہو۔ وہ میرا ہے صرف میرا......'' بچوں کی طرح بلک بلک کر روتی وہ سبین کا درد مزید گہرا کر گئی تھی۔ کتنا بڑا فریب کھایا تھا اس نے محبت کے ہاتھوں۔ جس شخص کے لیے اس نے پوری دنیا تج دی تھی وہ چھ ماہ بھی اس سے مخلص نہیں رہا تھا۔

اس روز مصباح آصف نے بہت سے انکشاف کیے۔ اس نے بتایا تھا کہ رومان باری اس سے تعلق بنانے کے لیے شروع میں کتنا ذلیل ہوا تھا، اس کی بہنوں کے ہاتھوں۔ وہ شروع سے جانتی تھیں کہ وہ آوارہ ہے، اس کی بہنوں نے خود اپنی آنکھوں سے اسے اسکول کی لڑکیوں کے پیچھے ذلیل ہوتے دیکھا تھا۔ خود اس کے کالج کی ایک لڑکی نے زبردست

عزت افزائی کی تھی اس کی مگر اس کے لیے صنفِ نازک کے ہاتھوں ذلیل ہونا قطعی شرمندگی کی بات نہیں تھی۔

مصباح آصف نے ہی سبین کے سامنے ماہ رخ کو بتایا کہ اس نے مسٹر باری سے دوستی شادی کی شرط پر کی تھی۔ ابتدا میں اس کی ہر بات میں سبین کا ذکر ہوتا تھا مگر ایک روز جب اس نے اسے بتایا کہ ان کے تایا نے اپنی بیٹی کو جہیز میں داماد کے لیے نیو ٹو ڈی کار اور دو بھینسیں دی ہیں۔ تب سے وہ اس کے کلمے پڑھنے لگا تھا۔ اس نے مصباح کو بظاہر مسکرا کر لاپروا انداز میں بتایا تھا کہ پتہ ہے ایک بھینس کی کتنی قیمت ہوتی ہے؟ ستر سے اسی ہزار...... تب اس نے جواب دیا تھا۔

''تو کیا ہوا ہمارے ہاں بیٹیوں کو جہیز میں بہت کچھ دیا جاتا ہے۔ میری شادی میں ابو اس سے بھی بڑھ کر دیں گے۔ ان کی کروڑوں کی جائیداد ہمارے سوا اور کس کی ہے......؟'' جب سے مصباح نے اسے یہ کہا تھا اسی دن سے وہ اس پر لٹو ہو کر سبین احمد حسن سے غافل ہو گیا تھا۔'' شدید غم و غصے کا شکار ہو کر وہ اس کی ذات سے اور بھی بہت سے پردے اٹھا رہی تھی۔ تاہم سبین کو اپنی الجھن کا سرا مل گیا تھا۔ وہ جان گئی کہ مصباح آصف کی کون سی چیز اس کے پاس نہیں تھی۔

مصباح اب مسٹر باری کے گھر والوں کو گالیاں دیتے ہوئے اسے سبق سکھانے کی دھمکی دے رہی تھی۔

''تم دیکھنا ماہ، میں نے اس کی بہن کو سرِ عام سڑک پر بے عزت نہ کروایا تو میرا نام بھی گڑیا نہیں۔ یہ لڑکیوں سے رات بھر بات کر کے اپنے نفس کی آگ بجھاتا ہے میں اسے سزا دوں گی۔''

سبین گم صم اس کے عزائم اور دھمکیاں سن رہی تھی۔

''اس کی ماں کو میں بتاؤں گی اس کے کرتوتوں کا اور وہ جو اس کی شادی شدہ بہن ہے۔ بڑی پارسا بنی پھرتی ہے میں اس کی پارسائی کے پول کھولوں گی۔ میرے بھی کزن ہیں، یہ جانتا نہیں ہے مجھے۔ اس کا پورا خاندان میری فیملی کی نظر میں ہے۔ تم دیکھنا میں کیا کرتی ہوں اس کے ساتھ۔''

وہ حد سے زیادہ ہرٹ ہو رہی تھی۔ اسی روز شام میں باری نے سبین کو کال کی۔ جسے کئی بار کاٹنے کے بعد بالآخر اس نے پک کر لیا۔ دوسری طرف وہ رو رہا تھا۔

''سبین، تم یہ سب کیوں کر رہی ہو۔ میری ماں رو رہی ہے۔ وہ مر جائے گی......؟''

''میں نے کیا کیا ہے تمہاری ماں کے ساتھ......؟''

دکھی ہونے کے ساتھ ساتھ وہ حیران بھی ہوئی جب وہ اس پر الزام تراشی کرتے ہوئے بولا۔

''تم صبح سے کسی لڑکی سے میرے گھر کے نمبر پر کال کروا کر دھمکیاں دے رہی ہو اس سے پہلے تم نے کسی لڑکی سے دوسرے نمبر سے مجھ سے رابطہ کروایا۔ خدا کا واسطہ ہے تمہیں مجھے معاف کر دو۔ پلیز۔''

سبین کو اس کے رونے کی وجہ سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ وہ اس کی سوچ سے بھی زیادہ پست ذہن کا تھا۔ اس نے بنا کچھ کہے کال کاٹ دی۔ وہ شخص اس کی محبت کو کبھی بھی سمجھ نہیں سکا تھا۔ اسے پھر بے تحاشا دکھ ہوا۔ کچھ ہی دیر میں پھر اس کی کال آ گئی۔ وہ اب بھی رو رہا تھا۔

''سبین تم نے گڑیا کو کیا کہا ہے، وہ رو رہی ہے، میری کال بھی اٹینڈ نہیں کر رہی۔ ہاں میں جھوٹا ہوں، میں نے تمہارے ساتھ فراڈ کیا ہے۔ میں تمہارا قصور وار ہوں۔ تم مجھے سزا دو اسے کس بات کی سزا دی ہے تم نے؟ پلیز اسے بول دو کہ تمہارا مجھ سے کوئی تعلق نہیں ہے، پلیز سبی۔''

زندہ بھسم ہونا کسے کہتے ہیں اس لمحے کوئی سبین احمد حسن سے پوچھتا۔ وہ شخص جو ایک لمحے کے لیے اس کا کسی سے بات کرنا برداشت نہیں کرتا تھا۔ جو کہتا تھا محبت کے امتحان میں، میں تمہارے لیے جان دے دوں گا مگر تم بھاگ جاؤ گی۔ اب وہی اپنا ہر عہد بھلائے اس کے احساسات کی پروا کیے بغیر اس کا درد جانے بغیر، اس سے یہ بھیک مانگ رہا تھا کہ وہ اس کی محبت کے احساس سے مکر جائے۔ اس کے دکھائے گئے خوابوں سے دستبردار ہو جائے۔ وہ جان ہی نہیں سکتا تھا کہ اس لمحے وہ اذیت کے کس پل صراط سے گزر رہی تھی۔

''اس میں ایسا کیا ہے جو تمہیں مجھ میں دکھائی نہیں دیا مسٹر باری؟'' وہ جانتی تھی پھر بھی پوچھ بیٹھی۔ تبھی وہ روتے ہوئے بولا۔

''مجھے نہیں پتہ، وہ مر جائے گی۔ تم بہت اچھی لڑکی ہو، وہ تمہارے جیسی نہیں ہے۔ میں جانتا ہوں، وہ میرے بارے میں سب کچھ جانتی ہے۔ تم سوچ بھی نہیں سکتیں وہ میرے ساتھ کیا کر سکتی ہے۔ میری ماں مر جائے گی۔ پلیز اس سے بات کر لو۔ میں تم سے وعدہ کرتا ہوں تین دن کے اندر اندر اس سے تعلق ختم کر لوں گا۔ صرف تین دن کی مہلت دے دو مجھے۔ تم ہی مجھے جانور سے انسان بنا سکتی ہو، پلیز۔''

سبین احمد حسن اس وقت اعصابی طور پر اس حد تک کمزور ہو گئی تھی کہ اسے اس کا کوئی انداز سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ پچھلے ڈیڑھ دو سال سے جھوٹی قسمیں کھا کر جو فریب وہ اسے دیتا آیا

تھا، اس وقت بڑے آرام سے اس کا اعتراف کر لیا تھا مگر ستم کی بات تو یہ تھی کہ وہ اپنی اصلیت کھل جانے کے باوجود اس سے محبت کے دعوے پر قائم تھا۔

سبین کو یکلخت اس سے بے تحاشا نفرت محسوس ہوئی۔ ساری عمر اسے اپنے لیے رلانے والا اس وقت اسی کے سامنے کس ڈھٹائی سے کسی اور کے لیے رو رہا تھا۔ سبین کو اپنے سارے نقصانات یاد آ رہے تھے۔ اسے یاد آ رہا تھا کہ اس فریبی شخص کی جھوٹی محبت کے سحر میں کھو کر وہ کن کن پیارے رشتوں سے دور ہو گئی تھی۔ کتنے دن ہو گئے تھے وہ نماز پڑھتے ہوئے بھی اللہ کے قریب نہیں ہوتی تھی۔ رومان باری کی باتیں، اس کا تصور نماز میں بھی اس کا پیچھا نہ چھوڑتا۔ اسے لگا جیسے اللہ نے اسے سنان جیسے اچھے شخص کا دل دکھانے کی سزا دی ہو۔

دل و دماغ کا برا حال تھا، کبھی شدت سے دل چاہتا کہ وہ بھی سدرہ کی طرح سوسائیڈ کر کے دنیا سے منہ موڑ لے تاکہ اس فریبی انسان کو اپنے کیے پر پچھتاوا ہو۔ اس طرف سے دماغ ہٹ جاتا تو نئی رانگ کالز سے رابطہ کر کے مسٹر باری کی طرف سے ذہن ہٹانے کا خیال آتا۔ عجیب سا درد تھا جو برداشت سے باہر ہو رہا تھا۔ رو رو کر اس نے اپنا برا حال کر لیا۔ باری جس کے کانٹا چبھنے پر وہ رو پڑتی تھی۔ آج خود اسے درد دے کر اس کے حال سے بے نیاز اس لڑکی کی منت کر کے اسے منانے میں لگا ہوا تھا۔ جس سے وہ محبت کا دعوے دار بھی نہیں تھا۔ کسی کا ضمیر اس حد تک مردہ ہو سکتا ہے وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔

سلمٰی بیگم اس کا یہ حال دیکھ کر تڑپ اٹھی تھیں۔ وہ بیٹی کے درد سے واقف نہیں تھیں پھر بھی اس کے بخار اور آنسوؤں نے ان کی جان سولی پر لٹکا دی تھی۔ رات بھر جانے کیا کیا پڑھ کر اس پر پھونکتے ہوئے وہ اس کے ساتھ جاگتی رہی تھیں۔ صبح فجر کی نماز سے ذرا پہلے اس نے مصباح آصف اور احسان باری دونوں کا نمبر چیک کیا تو دونوں کو ایک دوسرے کے ساتھ مصروف پایا۔ گویا رات بھر اپنی نئی محبوبہ کو کال کر کے وہ اس کا برین واش کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ادھر سبین کو شدت سے محسوس ہو رہا تھا کہ اسے کچھ ہو جائے گا اگر دل کو کچھ نہ ہوا تو دماغ کی شریانیں ضرور پھٹ جائیں گی۔

فجر کی اذان ہو رہی تھی مگر اس سے اٹھا نہیں جا رہا تھا۔ سلمٰی بیگم نماز پڑھ کر پھر اس کے پاس چلی آئی تھیں۔

''سبی پتر، کچھ بتا تو سہی کیا ہوا ہے۔ رات بھر سے رو رہی ہے تو، میں تیری ماں ہوں مجھے تو بتا دے کیا ہوا ہے؟'' کتنی فکرمندی تھی اس مہربان وجود کے لہجے میں۔ سبین کو اپنی چند روز پہلے والی بدتمیزی یاد کر کے اور رونا آ گیا۔

''کوئی مر گیا ہے اماں، بہت عزیز تھا میرا۔ کل رات موت ہو گئی ہے اس کی۔''

بلک کر ان کی گود میں منہ چھپاتے ہوئے اس نے انکشاف کیا۔ بیٹی کے الفاظ اتنے مبہم نہیں تھے کہ وہ سمجھ نہ پاتیں۔ اپنی بے خبری پر وہ خود اپنے آپ سے نگاہ ملانے کے قابل نہیں رہی تھیں۔

چند عذاب راتوں اور سلگتے دنوں کی اذیت نے اس کی شخصیت ہی بدل کر رکھ دی تھی۔ مصباح آصف اس سے زیادہ ہرٹ ہونے کا اظہار کر رہی تھی۔ اپنے اور احسان باری کے متعلق بہت کچھ کھول رہی تھی اس پر۔ اس کے لہجے میں بھی اس شخص کے لیے نفرت تھی۔

باری کے کردار کے بارے میں اس نے ایسے ایسے انکشافات کیے تھے کہ وہ سن کر دنگ رہ گئی تھی۔ اب اسے یاد آ رہا تھا کہ جب اس نے مسٹر باری کی دوستی کی آفر قبول کی تھی تو اس کے اندر بے سکونی کیوں پھیل گئی تھی۔ اللہ نے ہر بار، ہر قدم پر اسے اس شخص سے باز رکھنے کے لیے کئی اشارے مختلف حوالوں سے واضح کیے مگر وہ عقل کی اندھی بنی، محبت کی انگلی تھامے خود خارزار پر چلتی رہی۔

سنان اس روز بہت دنوں کے بعد ان کی طرف آیا تھا۔ اس کی بیوی امید سے تھی اور وہ اسے لے کر آسٹریلیا گیا ہوا تھا۔ اب جو لوٹا تو سبین کا حال دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ زندگی کو ہاتھ دکھاتی وہ لڑکی اتنی خاموش تو کبھی نہ تھی۔

دسمبر پھر لوٹ آیا تھا۔ وہ چولہے کے پاس بیٹھی کوئلے سے زمین پر آڑی ترچھی لکیریں کھینچ رہی تھی۔ جب اس کی بیوی چپکے سے اس کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔ اس کی طبیعت آج کل ٹھیک نہیں رہتی تھی۔ سبین اس کے یوں پاس آ کر بیٹھنے پر حیران ہو گئی تھی۔

''کیسی ہو سبین تم تو لفٹ ہی نہیں دیتیں، ہم غریبوں کو۔'' پہلی بار وہ اس سے بے تکلف ہو رہی تھی۔ سبین اسے دیکھتی رہ گئی۔

''ایسی کوئی بات نہیں ہے۔'' مرے مرے سے لہجے میں اس نے وضاحت دی۔ جواب میں وہ مسکرا دی۔

''کچھ پوچھنا ہے تم سے، سچ سچ بتاؤ گی۔''

''پوچھیے......'' وہ پھر حیران ہو گئی۔ سنان کی بیوی کی یہ بے تکلفی اس کی سمجھ سے باہر تھی۔

''سنان کئی سال اسی گھر میں رہے ہیں نا......؟''

''ہاں۔''

''تو پھر تم تو جانتی ہو گی، ان کی زندگی میں کوئی تھی ناں......؟''

کیسا غیر متوقع سوال پوچھ لیا تھا اس نے، سبین کچھ بھی کہنے کی پوزیشن میں نہیں تھی۔

"میں نہیں جانتی، آپ مجھ سے کیوں پوچھ رہی ہیں؟"

اسے پھر رونا آنے لگا۔ آج کل بات بے بات نگاہیں بھیگنے کو تیار رہتی تھیں۔ دل کا عارضہ بھی لاحق ہو گیا تھا۔

"ویسے ہی جب سے شادی ہوئی ہے میں نے سنی کو کبھی خوش نہیں دیکھا۔ اکثر راتوں میں جاگ کر اٹھ بیٹھتے ہیں۔ محفلوں میں جانا تو خود پر حرام کر رکھا ہے، مجھ سے تعلق بھی گویا زبردستی کا ہے۔ امی ڈانٹتی نہ رہیں تو شاید یہ مجھے بھی کسی فائل میں بند کر کے الماری میں رکھ چھوڑیں۔ کوئی خوامخواہ تو ایسا نہیں کرتا۔ وہ یہاں رہتے ہیں۔ آپ کچھ نہ کچھ تو جانتی ہوں گی ان کے بارے میں۔"

اس کی الجھن بھی محبت تھی، سبین نے کوئلہ واپس چولہے میں پھینک کر ہاتھ جھاڑ لیے۔

"وہ مجھ سے دل کی باتیں شیئر نہیں کرتا تھا۔ میری اپنی الجھنیں تھیں، اس کے اپنے مسائل تھے۔"

دل میں دبی راکھ کو کریدنے سے فائدہ بھی کیا تھا۔ اس کی بیوی خاصی مایوس ہو کر اٹھ گئی۔

رومان باری کی نئی محبوبہ مصباح آصف کا رابطہ اس کے ساتھ مستقل ہو گیا تھا۔ شاید اس کے دل کے زخم بار بار ادھیڑنے کے لیے ہی وہ روزانہ اپنی اور رومان باری کے عشق کی کہانی لے کر بیٹھ جاتی تھی۔ اس نے اسے بتایا تھا کہ وہ جب بھی شہر سے باہر جاتا ہے، اس کے لیے کوئی نہ کوئی چیز ضرور خرید کر لاتا تھا۔ کبھی قیمتی ملبوسات، میچنگ جیولری کے ساتھ تو کبھی ریسٹ واچ، چوڑیاں، بریسلٹ، ڈھیر سارے کارڈ، گولڈ کی قیمتی رنگ اور بھی جانے کیا کیا۔ اسے موبائل بھی اسی نے لے کر دیا تھا۔ روزانہ خود کال کرنے کے باوجود اسے کارڈ بھی وہ لوڈ کروا کر دیتا تھا۔ مصباح آصف نے اسے بتایا کہ اس سے روٹھ کر جب وہ شہر چھوڑنے کی دھمکی دیتا تھا تب اسے اپنے کسی نہ کسی ضروری کام کی وجہ سے شہر سے باہر جانا ہوتا تھا اور وہ غریب سمجھ لیتی تھی کہ وہ اس کی وجہ سے در بدر ہو رہا ہے۔

گزرتے لمحات کے کھلتے انکشاف اس کا درد ادھیڑتے جا رہے تھے۔ ماضی میں اسے جو چیز سب سے زیادہ متاثر کرتی تھی وہ محبت تھی مگر آج اسے جس چیز سے سب سے زیادہ نفرت محسوس ہو رہی تھی، وہ بھی محبت تھی۔ اسے محبت سے، آشنا کروانے والی بہت سی ہستیاں تھیں مگر آج اسی لفظ سے نفرت کروانے والا صرف ایک شخص تھا۔ وہ شخص جو اس کی محبت کی پاکیزگی پر فخر کرتے نہیں تھکتا تھا۔ مصباح آصف کی زبانی اسے پتہ چلا کہ وہ اسے ایک بدکردار لڑکی سمجھتا تھا۔ اپنی مالدار محبوبہ کی نگاہوں میں سرخرو ہونے کے لیے اس نے جانے کتنی جھوٹی، گھٹیا

کہانیاں اس کی ذات سے منسوب کر دی تھیں۔ مختلف لڑکوں کو اس کا پرسنل موبائل نمبر دینے والا بھی وہی تھا۔

وہ کس کس بات کو روتی۔ وہ شخص تو محبت کے مفہوم سے بھی واقف نہیں تھا۔

آنے والے دنوں میں ضبط و درگزر کا بے مثال مظاہرہ کرتے ہوئے اس نے مصباح آصف کو کہہ دیا تھا۔

"میرا اس شخص سے کوئی واسطہ نہیں ہے گڑیا۔ وہ میرا کبھی ہو بھی نہیں سکتا۔ اسے جس چیز کی طلب تھی وہ تم ہی اسے دے سکتی ہوں۔ سو میں تم سے درخواست کرتی ہوں اسے معاف کر دو۔ وہ واقعی صرف تم سے پیار کرتا ہے۔"

جس شخص نے اسے عمر بھر کے لیے آنسو سونپ دیے تھے اسی کی خوشیوں کے لیے وہ اپنے حصے کے خوابوں سے دستبردار ہو گئی تھی۔ یہی مانگا تھا رومان باری نے اس سے۔ سو یہ آخری تحفہ بھی اس کی نذر کر دیا۔ مصباح آصف کے دل کی ساری بدگمانیوں کو دور کرنے کے لیے وہ اس کی محبت کے ہر احساس سے منکر ہو گئی مگر کتنی عجیب بات تھی کہ اس بدنصیب کو پھر بھی سرخروئی نہ مل سکی۔

اس کا دل دریا تھا۔ اس نے محبت میں اعلاظرفی کا مظاہرہ کرتے ہوئے خود کو زمین بوس کر دیا مگر مصباح آصف بڑے ظرف کا مظاہرہ نہ کر سکی۔ اپنے دل کی تسلی اور سکون کے لیے وہ ہر صورت اس کا نمبر بند کروا دینا چاہتی تھی۔ لہٰذا کئی لڑکیوں کو اس کا نمبر دے کر اسے ذہنی طور پر پریشان کرنے کے ساتھ ساتھ اس نے خود اپنے نیو نمبرز سے رومان باری بن کر اسے ایسے میسج بھیجنا شروع کر دیے جن میں نہ صرف اس کی تضحیک ہوتی بلکہ بے تحاشا نفرت کا اظہار بھی ملتا۔ وہ اس کی سازشوں کو اپنی سادہ دلی کے باعث سمجھ ہی نہ سکی۔

اس وقت وہ ماہ رخ کے پاس ہی بیٹھی تھی جب اسی نئے نمبر سے پھر میسج آنے شروع ہو گئے۔

"میں باری ہوں، کیا تم ابھی تک مجھ سے ناراض ہو......؟"

وہ اسے باری کہتی تھی مگر رومان باری کو مصباح آصف کا دیا نام زیادہ محبوب تھا لہٰذا اس نے اسے منع کر دیا تھا کہ وہ اسے مصباح آصف کے دیے ہوئے نام سے نہ پکارا کرے۔ اس شخص نے کبھی کچھ نہ دے کر بھی سب کچھ چھین لیا تھا اس سے اس وقت قطعی ڈس ہارٹ ہو کر اس نے فوراً مصباح آصف سے رابطہ کیا اور درخواست کی کہ وہ مسٹر باری کو منع کر دے اب وہ اس کے ساتھ کوئی تعلق رکھنا نہیں چاہتی۔ مصباح آصف نے وعدہ کر لیا کہ آئندہ وہ اسے تنگ نہیں کرے گا۔ ماہ رخ یہ ساری کارروائی چپ چاپ دیکھ رہی تھی۔ تھوڑی

دیر کے بعد اسی نئے نمبر سے مسٹر باری کے نام کے ساتھ پھر میسج آ گیا۔

"میں نے صرف تم سے معافی مانگنے کے لیے فون کیا تھا۔تمہیں جو تکلیف ہے مجھ سے کہو، اسے کیوں تنگ کر رہی ہو۔میں تم سے نفرت کرتا ہوں، بے تحاشا نفرت، وہی میری زندگی ہے۔اب مجھے پتہ چلا سچا پیار کیا ہوتا ہے۔ وہ تنکا بھی نہ لائے میں اسے ہمیشہ خوش رکھوں گا۔ میں اس سے محبت کرتا ہوں۔ دوبارہ اس نمبر پر میسج نہ کرنا۔ میں یہ سم بھی اپنی جان کو دینے والا ہوں۔"

وہ میسج ماہ رخ نے بھی پڑھا۔سبین کی آنکھیں نم ہو رہی تھی جب وہ اسے ڈپٹتے ہوئے بولی۔

"خبردار! جو اب تم نے ایک آنسو بھی اس ذلیل شخص کے لیے بہایا تو۔ میں گناہ گار ہوں مگر پھر بھی ایمان رکھتی ہوں اللہ اپنے سادہ لوح بندوں کے ساتھ کبھی کچھ غلط نہیں کرتا۔وہ شخص اللہ کو تمہارے قابل نہیں لگا اسی لیے تمہیں اس کا اصل چہرہ دکھا دیا۔تم اپنا معاملہ اس پاک ذات پر چھوڑ دو۔ ہر انسان کو اپنے غلط اور صحیح عمل کا صلہ ملتا ہے۔ یہ دونوں ایک ہی راستے کے مسافر ہیں۔انہیں ایک دوسرے میں مگن رہنے دو۔تم صرف یہ دیکھو کہ اللہ تمہارے لیے کیا بہتر کرتا ہے۔"

"اب کیا بہتر ہوگا ماہ!میری تو ساری زندگی ہی بے رنگ ہوگئی ہے،کبھی کسی کی طرف آنکھ اٹھا کر نہ دیکھنے والی یوں اوندھے منہ گری ہے کہ اٹھ کر سنبھلنے کی خواہش بھی نہیں رہی۔"

اسے کسی کے سامنے رونا برا لگتا تھا مگر وہ رو رہی تھی۔تبھی ماہ رخ نے اس کے آنسو پونچھے۔

"یہ سب جو ہوا، یہ تمہاری اپنی غلطی تھی۔ بعض اوقات انسان اپنے نفس کے بہکاوے میں آ کر غلط لوگوں کا انتخاب کر لیتا ہے۔تمہارا انتخاب بھی غلط تھا۔اپنی سادہ لوحی کے باعث تم نے بھی اپنے کردار و وقار کا خیال رکھے بغیر اس شخص کو اپنے خواب سونپ دیے جو کبھی کسی کا نہیں ہوسکتا۔جن دنوں تم نے اور مصباح نے اسے دھتکارا تھا وہ بنا ٹینشن لیے بڑے فریش موڈ کے ساتھ دوسری لڑکیوں کے ساتھ معمول کے عین مطابق ساری ساری رات موبائل پر مصروف رہتا تھا۔ اسے کسی کے ہونے نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔میری بڑی پرانی جان پہچان ہے اس سے،اس کی فیملی کے ایک ایک بندے کو جانتی ہوں میں۔ پتہ نہیں تم سے پہلے کتنی لڑکیوں کو اس نے بے وقوف بنا کر چھوڑا ہے۔اس کی منگنی بھی اسی لیے ختم ہوئی ہے۔خود سوچو اگر وہ بے وفائی نہ کرتا، کیا تب بھی تم اس کی اصلیت کھل جانے پر اس کا ساتھ دیتیں؟ جو شخص آپ کو عزت اور تحفظ ہی نہ دے سکے اس کی رفاقت سے کہیں بہتر تنہا جینا

ہے۔تم ان کی دنیا کی باسی نہیں ہو پھر یہ ملال کیسا۔خدا کا شکر ادا کرو کہ اس نے تم پر اپنا کرم کرتے ہوئے ایک گھٹیا شخص کی جھوٹی محبت کے سحر سے نکال لیا۔تمہارے پاس اسے دینے کے لیے گاڑی اور بینک بیلنس نہیں ہے مگر اس دوسری لڑکی کے پاس ہے پھر وہ اسے چھوڑ کر تمہارا ہاتھ کیوں تھامے۔ ہوتے ہیں کچھ لوگ ایسے عقل کے اندھے۔"

وہ اسے آئینہ دکھا رہی تھی۔ سبین نے آنسو پونچھ لیے۔

"ہم لڑکیاں بہت بے وقوف ہوتی ہیں، فلموں ڈراموں، ناولوں کے ہیرو دیکھ کر اپنی حقیقت کی دنیا میں بھی ویسے ہی کردار ڈھونڈنے لگتی ہیں۔ ہم سوچتی ہی نہیں ہیں کہ ہمارے یہی خواب ہمیں ایک دن ذلیل بھی کر سکتے ہیں۔ ہم اپنا اختیار اللہ کو کیوں نہیں سونپتے۔ آج پورے پاکستان میں نوجوان نسل، سستے نیٹ ورک کی بھینٹ چڑھ کر دھڑا دھڑ اپنی دنیا اور آخرت کی بربادی خرید رہی ہے۔ دشمنوں کو ان کے شرمناک مقاصد میں کامیاب کر رہی ہے، ایسے میں کیا اسلامی قواعد و ضوابط کی پابندی کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔"

وہ رنجیدہ ہو رہی تھی مگر سبین اس کے علم اور تقریر سے متاثر ہو کر دل ہی دل میں خوش ہوئی۔ ماہ رخ نے شاید اس کی سوچ پڑھ لی تھی۔تبھی مسکراتے ہوئے بولی۔

"میرے لیکچر پر حیرانی ہو رہی ہے ناں......؟ مت حیران ہو یار۔ اللہ نے کسی کے ساتھ نیکی کرنے کے صلے میں مجھ جیسی گناہ گار کو معاف کر کے ہدایت عطا فرما دی ہے۔ سارے فضول کام چھوڑ دیے ہیں میں نے۔ اکتا گئی تھی گمراہی کی زندگی سے، اب سکون ملا ہے۔تم سوچ بھی نہیں سکتیں کہ دو چار روز قبل جب مجھے یہ خیال آیا کہ کسی بھی پل میری سانس رک سکتی ہے، مجھے فالج کا اٹیک یا کچھ بھی ہوسکتا ہے۔ صرف ایک سانس کے آنے سے میں اس جہان میں ہوں اور صرف ایک سانس نہ آنے سے چند لمحوں میں وہ جہان میرا ہوگا جہاں کوئی سفارش چلتی ہے نہ مکر و فریب، تب میرے ساتھ کیا ہوگا۔ اللہ تو کسی بھی وقت کچھ بھی کر سکتا ہے پھر ہم غرور کس بات پر کریں۔ اس کی ذات سے پیار ہی جب دنیا اور آخرت کی کامیابی ہے تو پھر محبت بھی اسی سے کیوں نہ کریں۔ اس کے احسانات بھلا کر نکمے نکمے انسانوں کی فضول محبت میں کیوں اپنی زندگی بے کار کر لیں۔ بس جب سے اس سوچ نے دل میں گھر کیا ہے تب سے میں نے اپنی ذات کو مکمل طور پر اللہ کی سپردگی میں دے دیا۔ یقین کرو، اب پانچوں نمازوں کی ادائیگی کے بعد اتنے سکون کی نیند آتی ہے کہ بتا نہیں سکتی۔ کمپیوٹر کو گھر سے دفع کر کے اسلامی سینٹر جوائن کر لیا ہے جس سے ایمان میں تازگی پیدا ہوئی ہے۔ تم چلو گی میرے ساتھ......؟"

"ہاں۔" گم صم سے انداز میں اسے جواب دینے کے بعد وہ گھر آئی تو اسے ایسا لگا

جیسے وہ عالم خواب سے بیدار ہوئی ہو۔

سلمٰی بیگم اسپتال گئی ہوئی تھیں۔سنان کی بیوی کا ڈلیوری کیس تھا۔ وہ آسیہ بیگم کے ساتھ ہی صبح ناشتہ کیے بغیر اسپتال چلی گئی تھیں۔اس وقت چاشت کی نماز کا وقت ہو رہا تھا۔ کتنے دن ہوگئے تھے اس نے قرآن پاک کو ہاتھ تک نہیں لگایا تھا۔سجدے میں جاتے ہوئے بھی اس کا دھیان اللہ کی پاک ذات کی طرف نہیں ہوتا تھا۔ایک طرح سے مشترک ہو کر رہ گئی تھی۔ ابھی جو وضو کر کے جائے نماز پر کھڑی ہوئی تو جانے کب کے رکے آنسو بہہ نکلے۔اپنے حقیقی غم گسار کے سامنے آتے ہی اسے نئے سرے سے اپنا ہر درد یاد آ گیا۔ جیسے کوئی بچہ ماں کی آغوش میں آ کر لوگوں کی شکایت کرتا ہے کہ فلاں نے مارا، فلاں نے چیز چھین لی۔ بالکل ویسے ہی پھوٹ پھوٹ کر روتے ہوئے وہ بھی اپنے اللہ سے فریبی لوگوں کی شکایت کر رہی تھی۔ جس پاک ذات کو وہ اپنی جھوٹی خوشیوں میں مگن ہو کر فراموش کر بیٹھی تھی اب اسی کے قریب آ کر وہ بلک رہی تھی اور اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اللہ اس کی فریاد سن رہا ہے۔ اندھی محبت کے خمار سے باہر آ کر ہی اسے اپنی خطائیں یاد آئیں۔ جو حال اس نے ایک کم ظرف، بے قدر انسان کی محبت میں کیا تھا۔ وہی حال اگر اللہ کی محبت میں کرتی تو اب تک وہ پاک ذات جانے اسے کتنا نواز دیتی۔ بات شعور و آگہی کی ہے اور بے شک اللہ خود ہدایت نہ چاہنے والوں پر کبھی آگہی کے در وا نہیں کرتا۔اس کی نگری میں بھی اس کے حضور جا کر سب کچھ مانگنا پڑتا ہے۔

اللہ سے اپنا دکھ شیئر کرنے کے بعد اسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ ایک نئی سبین احمد ہو۔ اسی وقت نماز سے فارغ ہو کر اس نے نہا دھو کر نئے کپڑے پہنے، دوپہر کا کھانا بنایا، پورے گھر کی صفائی کی اور ابھی برتن دھونے کا ارادہ کر رہی تھی جب احمد حسن صاحب خاصے افسردہ چہرے کے ساتھ گھر میں داخل ہوئے۔

''ابا، اماں ساتھ نہیں آئیں......؟''انہیں تنہا اور مغموم دیکھ کر وہ پوچھے بغیر نہ رہ سکی۔ جواب میں وہ افسردگی سے بولے۔

''نہیں بیٹی، سنی کی بیوی کا کیس بگڑ گیا تھا ایک گھنٹہ پہلے اس کی ڈیتھ ہوگئی۔

''واٹ......؟''اس کے ہاتھ میں پکڑی پلیٹ چھوٹ کر زمین پر جا گری۔

''ہاں بیٹی، ابھی وہیں سے آ رہا ہوں میں، بی پی کنٹرول نہیں ہو رہا تھا اور آپریشن ضروری ہو گیا تھا۔ بچے کی ولادت تو بخیریت ہوگئی مگر وہ بدنصیب خود زیادہ دیر تک زندہ نہ رہ سکی۔''احمد صاحب کے لہجے میں بے حد رنج تھا۔ سبین کا سارا جسم جیسے سن ہو گیا ہو۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے وہ کتنی خوش تھی۔ مدت کے بعد اس نے سنان کی خوشیوں کے لیے ہاتھ اٹھا کر

دعا مانگی تھی مگر......وہ دکھی ہوگئی تھی۔

شام میں وہ احمد صاحب کے ساتھ سنان کے گھر گئی تو وہ کہیں دکھائی نہ دیا۔ آسیہ بیگم پہلے ہی بیمار رہتی تھیں اب اس نئے غم نے انہیں گویا بستر سے لگا دیا۔ ان کی حالت کے پیش نظر ہی احمد حسن صاحب اور سلمٰی بیگم نے انہیں بصد اصرار اپنے گھر میں شفٹ ہونے پر راضی کر لیا۔ بیوی کے چہلم تک وہ خود سارے معاملات سنبھالتا رہا۔ بعدازاں جاب کی وجہ سے اپنے ننھے منے بچے کی نگہداشت اور ماں کی علالت کی مجبوری کی وجہ سے احمد صاحب اور سلمٰی بیگم کی ہدایت کے مطابق اپنا گھر رینٹ پر دے کر وہ ایک مرتبہ پھر اسی گھر میں آ گیا جہاں اس کی خاموش محبت نے آنکھیں کھولی تھیں۔ جس گھر کے درودیوار اس کے ایک ایک راز اور درد سے واقف تھے۔

شعوری کوشش کے تحت اس نے تاحال سبین احمد حسن کا سامنا نہیں کیا تھا۔ اپنی خوشیوں کے ساتھ ساتھ وہ اپنے غم بھی اس سے پرائے رکھنا چاہتا تھا۔ سبین نے اب تک اتفاقیہ سامنا ہونے پر اسے گہرے سمندر کی مانند خاموش دیکھا تھا۔ وہ اب تک ایک بار بھی کسی کے سامنے نہیں رویا تھا۔

سبین نے ایک ماں کی طرح نا صرف اس کے بیٹے کو سنبھال لیا بلکہ آسیہ بیگم کی خدمت بھی وہ ایسے کر رہی تھی جیسے ان ہی کی سگی بیٹی ہو۔

منا اب چھ ماہ کا ہو گیا تھا۔ سبین کے لیے پرانے دکھوں سے نکلنے کی وہ بہترین مصروفیت تھا۔ سارا دن منے کی ذات میں کھو کر اسے کچھ فضول سوچنے کا وقت نہیں ملتا تھا۔ پانچوں وقت نماز کی ادائیگی کے ساتھ ساتھ چاشت، اشراق اور اوابین کی نمازیں بھی اس نے خود پر فرض کر لی تھیں۔ روزانہ تلاوتِ قرآن پاک سے ایسا سکون ملتا کہ وہ اپنی پچھلی کوتاہیوں پر دن میں ہزار بار پچھتاتی۔

آسیہ بیگم دل کی گہرائیوں سے دوبارہ اسے اپنے بیٹے کی زندگی کا حصہ بنانا چاہتی تھیں کیونکہ یہ ان کی بہت پرانی آرزو تھی مگر بیٹے کی پچھلی غلطی اور اس کے ایک بیٹے کا باپ ہونے کی وجہ سے دل مارے خاموش بیٹھی تھیں۔ ان کی خاموشی کی وجہ سے احمد صاحب اور سلمٰی بیگم بھی خاموش تھے ورنہ سنان کے بیٹے کو سبین کے ساتھ اٹیچ دیکھ کر وہ اب بھی اسے سنان کی زندگی کا حصہ ہی بنانا چاہتے تھے۔ آج کل اچھے رشتوں کی قلت کا سامنا الگ مسئلہ تھا۔

سنان ایک مرتبہ پھر ملک سے باہر جانے کا پروگرام بنا رہا تھا۔ سبین اور سلمٰی بیگم کے لاکھ خلوص و اصرار کے باوجود وہ کھانا باہر سے کھاتا تھا۔ کپڑے بھی لانڈری سے دھلواتا۔ اس کے باوجود روزانہ کبھی پھل، کبھی خشک میوہ جات، کبھی دودھ کے ڈبے، تو کبھی کیا اٹھا کر لے

آ تا۔گویا اپنے بیٹے اور ماں کی خدمت کا قرض چکا رہا تھا۔

موسم سرما کی آمد ہو چکی تھی۔ ہواؤں میں اب خنکی کا احساس برداشت سے بڑھنے لگا تھا۔

اس روز رات میں پیاس لگنے پر وہ اپنے کمرے سے باہر آئی تو سنان کو بنا کسی گرم شال کے صحن کے ایک طرف چھوٹی سی کیاری کے پاس کرسی پر تنہا بیٹھے دیکھ کر ٹھٹک گئی۔ سر کرسی کی پشت سے ٹکائے، پلکیں موندے وہ اندھیرے میں بیٹھا چپ چاپ رو رہا تھا۔ تب بنا چاپ پیدا کیے وہ اس کے قریب آئی تو اسے روتے دیکھ کر اس کا موم سا دل جیسے سکڑ گیا۔

''سنی...... یہاں اکیلے کیوں بیٹھے ہو؟''

وہ ہاتھ بڑھا کر اس کے آنسو پونچھنا چاہتی تھی مگر ہمت نہ کر سکی۔ سنان نے اس کی پکار پر پٹ سے آنکھیں کھولیں مگر اس کی طرف دیکھے بغیر اٹھ کھڑا ہوا۔

''سنان! مجھے معاف کر دو پلیز......'' بہت مجبور ہو کر اس نے اس کا ہاتھ تھاما تھا۔ جب وہ اپنی قسم توڑتے ہوئے رخ پھیر کر روکھے لہجے میں بولا۔

''کس بات کے لیے؟''

''ہر اس بات کے لیے جس نے تمہیں ہرٹ کیا۔''

''ٹھیک ہے اور کچھ۔''

''اور......اور مجھے میرا وہ دوست واپس لوٹا دو جسے فریبی رشتوں کے اندھیرے میں کھو کر میں گنوا بیٹھی ہوں۔'' اس کی آنکھوں میں آس تھی مگر سنان نے پلٹ کر اس کی طرف نہیں دیکھا۔

''وہ مر چکا ہے۔ میرے ہوئے لوگ دوبارہ لوٹ کر نہیں آتے، اتنا تو تم بھی جانتی ہو۔''

''سنان......تمہاری یہ بیگانگی مجھے بھی مار ڈالے گی۔'' وہ رو پڑی تو وہ اس کی طرف پلٹا۔

''میں مر چکا ہوں مگر پھر بھی میری وجہ سے تم کبھی نہیں مرو گی، یہ وعدہ ہے میرا تم سے۔'' خشک لہجے میں کہنے کے ساتھ ہی وہ تیز تیز قدم اٹھاتا اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا تو وہ بھی آنسو پونچھتی مرے مرے قدموں کے ساتھ بنا پانی پیے اپنے کمرے میں چلی گئی۔

اگلے چند روز میں سنان کی وساطت سے اس کے لیے ایک بہترین گھرانے سے رشتہ آ گیا۔ سنان کا ارادہ اسے رخصت کر کے خود باقی لوگوں کے ساتھ ملک سے باہر شفٹ ہونے کا تھا۔ وہ جاب بھی چھوڑنے کا سوچ رہا تھا مگر سبین کے انتہائی قدم نے اس معاملے میں اس کے ارادوں کو کامیاب نہیں ہونے دیا۔ وہ آفس کا کام کر رہا تھا جب وہ دھاڑتی ہوئی اس

کے کمرے میں داخل ہوئی۔

''تم اپنے آپ کو کیا سمجھتے ہو، کوئی فرشتہ ہو یا آسمان سے اترے ہو جو احسانوں کے بوجھ تلے دبا کر مار دینا چاہتے ہو اور تمہارا مجھ پر کیا حق ہے جو تمہیں میری شادی کی فکر پڑ گئی۔ تمہیں ملک سے باہر جا کر اپنی نئی دنیا بسانی ہے تو بساؤ، میرا وجود تمہاری کسی خوشی کی راہ میں رکاوٹ نہیں بنے گا مگر مجھے میرے اختیار کے ساتھ جینے دو۔ میں پھر سے کس اجنبی شخص کے ہاتھوں میں کھلونا بن کر ٹوٹنا نہیں چاہتی سنان۔ مجھے میرے حال پر چھوڑ دو پلیز......'' وہ اس کے سامنے پھر رو پڑی اور یہی مضبوط ہتھیار تھا اس کا۔ سنان کو لمحوں میں کمزور کرنے والا ہتھیار۔ اس ایک لمحے میں وہ اس کی پچھلی ساری بے وفائیاں بھول گیا۔

''اٹس اوکے، اس میں یوں جذباتی ہونے والی کون سی بات ہے۔''

گھسے پٹے سے سوٹ میں وہ صرف دوپٹہ لیے خود پر ظلم کر رہی تھی۔ سنان اسے دیکھ کر رہ گیا۔

''تمہاری بیوی نے ایک بار مجھ سے کچھ پوچھا تھا۔ کیا وہی سوال میں تم سے پوچھ سکتی ہوں۔'' اسے اپنے لیے پریشان دیکھ کر اس کا حوصلہ بڑھا۔ سنان نے اثبات میں سر ہلا کر اس سے سوال پوچھنے کی اجازت دے دی۔

''شادی سے پہلے تمہاری زندگی میں کوئی لڑکی تھی ناں......؟''

اس نے یہ سوال پوچھا بھی تو کب جب ساری کشتیاں جل کر راکھ ہو چکی تھیں۔ سنان کے دل میں ہلکی سی درد کی ٹیس اٹھی۔

''نہیں......'' بے ساختہ نظریں چرا کر اس نے رخ پھیر لیا۔ تو وہ چلا اٹھی۔

''بکواس کرتے ہو تم، تم نے اپنی بیوی کو کبھی خوش نہیں رکھا کیونکہ...... کیونکہ تم کسی اور سے پیار کرتے تھے، اتنا زیادہ پیار کہ کسی اور کے ہو کر بھی اسی کے رہے۔ اپنے دل، اپنی یادوں سے کبھی باہر نہیں نکال پائے اسے۔ پوری زندگی داؤ پر لگا دی، بس ایک اس لڑکی کو سچے اور جھوٹے پیار کی پہچان نہ کروا سکے۔ کیوں سنان، جن سے پیار کیا جاتا ہے، انہیں ان کی ضد پر بھی ڈوبنے کے لیے اکیلا نہیں چھوڑ دیا کرتے۔''

اس کا لہجہ بھرا گیا۔ سنان کو لگا آج اس کے سارے جذبے بے نقاب ہو گئے ہوں۔

''میں تم سے بہت شرمندہ ہوں سنان۔ میں نے تمہاری نصیحت نہیں مانی، سزا کے طور پر محبت نے وہ طمانچہ لگایا کہ اب تک درد کم نہیں ہوا۔ میں مانتی ہوں، میرا جرم ناقابل معافی ہے مگر اتنا بڑا تو نہیں کہ ہم دوستوں کی طرح ایک دوسرے سے اپنا دکھ بھی شیئر نہ کر سکیں۔ تم......تم میرے ہاتھ کا بنا کھانا بھی نہ کھا سکو۔''

میں تمہارے ساتھ کیا کرتی ہوں۔''

ایک اور دھموکا اس کے مضبوط بازو پر رسید کرتے ہوئے بولی تو سنان نے کھل کر مسکراتے ہوئے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

''بس کرو یار، سارے بدلے آج ہی پورے کرو گی کیا۔ ابھی تو بہت ساری باتیں شیئر کرنی ہیں تم سے۔ پچھلے دو سال میں جس ملک کا چکر لگتا تھا، پاگلوں کی طرح تمہارے لیے پتہ نہیں کیا کیا خرید لیتا تھا۔ دانیہ (بیوی) کے ساتھ واقعی بہت زیادتی کی ہے میں نے۔ اس کی قصور وار بھی تم ہی ہو۔ تمہارے طعنے کی وجہ سے غصے میں آ کر بنا کچھ سوچے سمجھے اس سے شادی کرنا پڑی۔ خیر چھوڑو، چلو مارکیٹ چلتے ہیں، اپنی تو دو سال کے بعد عید آئی ہے پھر ایک لمحہ بھی ضائع کیوں کریں۔''

وہ بے حد خوش اور پرسکون دکھائی دے رہا تھا۔ اس لمحے سبین پر یہ حقیقت بھی منکشف ہوئی تھی کہ مرد اپنی زندگی میں صرف اسی عورت کو اہمیت دیتا ہے جس سے دل کا رشتہ جڑا ہو، باقی کوئی کتنی ہی حسین، جاں نثار کیوں نہ ہو وہ اس کی قدر کبھی نہیں کرتا۔

''سنی...... تمہاری زندگی میں میرے بعد تو کوئی لڑکی نہیں آئے گی ناں......؟''

جانے کس خدشے کے تحت وہ پوچھ بیٹھی۔ جواب میں وہ شرارت سے اس کی چٹیا کھینچ کر مسکراتے ہوئے بولا۔

''کیسے آ سکتی ہے، یہ چڑیل دل خالی کرے گی تو وہاں کسی کا بسیرا ہوگا ناں......''

وہی اس کا مخصوص انداز۔ سبین مدت کے بعد کھل کر ہنسی۔

''تم ریئلی بہت اچھے ہو، بس کبھی بے وفائی نہ کرنا ورنہ میری اور تمہاری اماں بڑھاپے میں رل جائیں گی۔'' اس بار بے ساختہ ہنسنے کی باری سنان احمد کی تھی۔

بے شک اللہ اپنے نیک بندوں کے اعمال ضائع نہیں کرتا۔ رومان باری کے ساتھ کیا ہونا تھا وہ نہیں جانتی تھی تاہم اس کے رب نے اسے بہترین ساتھی عطا فرما کر یہ دکھا دیا تھا کہ وہ پاک ذات بہتر نوازنا جانتی ہے اور جو لوگ اس پر توکل کرتے ہیں وہ کبھی مایوس نہیں لوٹتے۔

دو سال بعد اس کے آنگن میں خوشیوں بھری زندگی نے قدم رکھا تھا اور اب وہ اپنے اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ادا کرتے ہوئے اسی زندگی کا ہاتھ تھام کر مسکرا رہی تھی۔

بن تیرے زندگی

جدائی راستوں اور موسموں کے ساتھ چلتی ہے۔
اداسی آسمانوں کی طرح بے انت ہوتی ہے
دلوں میں پھیل جاتی ہے۔
ہوا کے کینوس پہ درد کی تصویر بنتی ہے۔
بچھڑنا ہی مقدر ہو۔
تو آنکھوں میں امڈتی بارشوں کو روک لیتے ہیں
سلگتی ریت کے بوسے عجیب تسکین دیتے ہیں
لبوں پہ ذائقہ نمکین پانی کا
ہمیشہ یاد رہتا ہے

شب کے تقریباً پونے دو بج رہے تھے، جب اس نے تھکے تھکے سے نڈھال انداز میں اپنے گھر کے وسیع لاؤنج میں قدم رکھا۔ حسب توقع نگاہوں سے کچھ ہی فاصلے پر سر نیہوڑائے بیٹھی وہ یقیناً اسی کا انتظار کر رہی تھی۔

''آج...... پھر بہت دیر کر دی آپ نے؟''

ہر روز کی طرح اس وقت بھی اس کے قدموں کی آہٹ پر، یمنیٰ رحمٰن کی ساعتیں فوراً

وہ بے نیاز نہیں تھی۔ سنان کے اندر سوئی ہوئی زندگی نے چپکے سے کروٹ لی۔

''میں نے تم سے کہا تھا تمہیں اچھی لڑکی نہیں مل سکتی مگر...... حقیقت میں، میں اس قابل نہیں تھی کہ مجھے تم ملتے۔ میں غلط تھی، پلیز مجھے دل سے معاف کر دو، پلیز......''

اس نے، اس کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے۔ سنان رخ پھیر کر جلدی سے بنا کچھ کہے کمرے سے باہر نکل گیا۔

رمضان المبارک کا مقدس ماہ شروع ہو کر نہایت سکون سے اختتام کی طرف بڑھ رہا تھا۔ سبین کو خوشی تھی کہ اس کے شکوؤں کے بعد سنان نے افطار اور سحری میں گھر کا کھانا کھانا شروع کر دیا تھا۔ اس کی صحت جو ہوٹلوں کے کھانے کھا کھا کر بہت زیادہ گر رہی تھی اب پھر بحال ہو رہی تھی۔ رات میں سبین زبردستی اس سے کتاب چھین کر اس کے کمرے کی لائٹ آف کر جاتی تو مجبوراً اسے جلدی سونا پڑتا۔

رفتہ رفتہ اس کی زندگی میں پھر سے بھرپور دخل اندازی کر کے وہ اس کے سوئے ہوئے نیم مردہ جذبات بیدار کر رہی تھی۔ ایسے میں آسیہ بیگم کو جب موقعہ ملتا وہ اس کے گن گاتے ہوئے اپنی خواہش لے کر بیٹھ جاتیں۔

اس روز آخری روزہ تھا۔ سبین بضد تھی کہ کل عید ہوگی مگر سنان نے اعلان کر دیا تھا کہ کل بھی روزہ ہوگا۔ دونوں کے درمیان بحث بڑھتے بڑھتے شرط تک پہنچ گئی۔ ابھی شرط لگی تھی کہ مسجدوں میں عیدالفطر کا چاند نظر آنے کی خبر سنا دی گئی۔ سنان نے دیکھا اس سے شرط جیت کر وہ بالکل دو سال پہلے والی سبین کی طرح خوش و خرم نظر آ رہی تھی۔ سلمیٰ بیگم نے عید کی نوید سنتے ہی مہندی بھگو کر رکھ دی۔ ساتھ میں کل پکنے والے میٹھے پکوانوں کی تیاری بھی شروع کر دی۔

سبین کو بے ساختہ دو سال پہلے والا رمضان اور عید یاد آ گئی، جب اس نے پہلی بار اپنے محبوب رومان باری کو دیکھا تھا۔ پورے رمضان میں پل پل دونوں ایک دوسرے حال کی خبر رکھتے۔ رمضان کے ایک ایک دن کو انجوائے کرتے تھے۔ باری کو اکثر پیاس لگ جاتی تھی، افطاری کے بعد بھی اس کی طبیعت خراب رہتی جس کی وجہ سے وہ روزے چھوڑ دیتا۔ پانچوں وقت کی نماز بھی سبین اسے ڈانٹ کر زبردستی پڑھواتی۔ کچن میں سنان کے منے کا فیڈر تیار کرتے ہوئے اس کی پلکیں غیر محسوس طریقے سے بھیگ گئیں۔ جب وہ ہلکے سے دروازہ ناک کرتے ہوئے اس کے قریب چلا آیا۔

''سبی...... تم نے عید کی شاپنگ کر لی......؟''

''نہیں......'' کسی اور کے خیالوں میں کھوئی بے ساختہ وہ اس سے کہہ گئی تھی۔

''کیوں......؟''

''بس یوں ہی دل ہی نہیں چاہ رہا۔ عید تو اب بچوں کا تہوار ہے، اپنی تو عمر گزر گئی۔''

''صرف دو برسوں میں زندگی کا سارا حسن ختم ہو گیا تمہارے لیے......؟'' وہ پھر ہرٹ ہو گیا۔ سبین نے آہستہ سے رخ پھیر لیا۔

''نہیں، مجھے کسی کی بے وفائی کا کوئی ملال نہیں اگر دکھ ہے تو صرف اس بات کا کہ میں نے تم سے محبت کیوں نہیں کی۔ کیوں اپنے پاکیزہ احساسات کو ایک غلط شخص سے وابستہ کر کے بے مول کیا۔''

''ہو جاتا ہے زندگی میں ایسا۔ بہت ساری باتوں کی سمجھ وقت کے ساتھ ساتھ آتی ہے۔ اس وقت میں تم سے صرف یہی کہنے آیا ہوں، مجھے پھر اپنا دکھ سکھ شیئر کرنے کے لیے کوئی اچھی لڑکی نہیں مل رہی حالانکہ اب تو میں بہت سدھر گیا ہوں۔ کیا اب تم مجھے سنبھال سکتی ہو۔ میری تنہائی بانٹ سکتی ہو، پلیز انکار مت کرنا۔ دو سال تمہارے بغیر جیسے میں نے گزارے ہیں، میرا دل جانتا ہے، پل پل سمٹ کر بکھرنے کی اذیت جھیلی ہے میں نے۔ ادھر کسی درد نے تمہارے دل کو چھوا اور اُدھر تکلیف میں نے محسوس کی۔ تم تو میری نظر میں بچ گئی تھیں پھر کسی اور دل میں کیسے بس جاتیں۔ میں اپنی بیوی اور باری کے قصے کہنا سننا نہیں چاہتا۔ ہمارے بیچ جو کچھ ہوا اسے بھلا دیا ہے میں نے۔ کیا تم گزرے ماضی کا ہر لمحہ بھلا کر میرا ہاتھ تھام سکتی ہو......؟''

کیسی آس تھی اس کی آنکھوں میں سبین کی آنکھیں لبالب آنسوؤں سے بھر گئیں۔

''میں تمہیں بہت خوش رکھوں گا، کبھی کسی گزرے ہوئے لمحے کا غم تمہارے قریب آنے نہیں دوں گا۔ چاہتا تو میں دو سال پہلے زبردستی تم سے شادی کر کے تمہیں غلط رستے پر چلنے سے روک سکتا تھا مگر اس صورت میں تم میرے ساتھ ہو کر بھی ہمیشہ اسی کی رہتیں۔ تمہیں تاعمر اسے کھونے کا ملال رہتا اور یہی مجھ سے برداشت نہیں ہوتا۔ لڑکیاں جذباتی ہوتی ہیں، کسی بھی معاملے میں خود ٹھوکر کھائے بغیر انہیں عقل نہیں آتی۔ تمہارے لیے بھی یہ ٹھوکر کھانا ضروری تھا کیونکہ ہیرے کی قدر جوہری جانتا ہے۔''

''عقل سیکھنے کے چکر میں اگر میں جان سے گزر جاتی تو۔ ان دو برسوں میں میرے بے شمار جو ہیروں جیسے آنسو ضائع ہوئے ہیں وہ؟''

ایک دم ہلکی پھلکی ہو کر پرانے روپ میں واپس لوٹتے ہوئے اس نے سنان کے سینے پر مکا مارا تو وہ بھی آسودگی سے مسکرا دیا۔

''سوری......''

''کیا سوری، اگر ماہ رخ جیسی اچھی دوست میری رہنمائی نہ کرتی تو شاید میرا انجام بھی سدرہ جیسا ہوتا۔ پتہ نہیں کس نیکی کے صلے میں میرے اللہ نے مجھے بچا لیا سنی۔ اب تم دیکھنا

بیدار ہوئی تھیں۔ خمار آلود نگاہوں میں، تفکرات کی گہری پرچھائیں صاف دکھائی دے رہی تھیں۔ ہر روز کی طرح اس وقت بھی وہ اس کی بے داری پر، خفا ہوتے ہوئے اسے لتاڑ بیٹھا۔

''تو کیا کروں......؟'' سورج چھپتے ہی آ کر تمہارے قدموں میں بیٹھ جایا کروں۔ کام کاج چھوڑ کر۔ ہر وقت تمہاری اس منحوس صورت کو تکتا رہوں، اور کوئی کام نہیں ہے مجھے......؟''

درشتی سے کہتے ہوئے کندھے پر پڑا کوٹ اس نے قریبی صوفے کی طرف اچھال دیا تھا۔ فریج سے ٹھنڈے پانی کی بوتل نکال کر، وہ تیزی سے اپنے بیڈ روم کی طرف بڑھا۔ تو یمنیٰ رحمٰن بھی خاموشی سے اس کے پیچھے چلی آئی۔

''کھانا گرم کروں آپ کے لیے......''

یہ سوال اس کے معمولات میں شامل تھا۔ خواہ عون احمر جعفری کا رویہ اس کے ساتھ کیسا ہی ہوتا۔

''نہیں......'' ریموٹ اٹھا کر ٹی وی آن کرتے ہوئے اس نے یمنیٰ رحمٰن کی طرف دیکھنے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی تھی۔

''اور چائے......''

''چائے بھی پی کر آیا ہوں میں۔ آپ براہ مہربانی میرے لیے کوئی زحمت نہ کریں۔ ویسے بھی میں آل ریڈی بہت تھکا ہوا ہوں۔ جائیں جا کر اپنا کام کریں۔''

قطعی روڈ لہجے میں کہتے ہوئے اس نے اپنی توجہ سامنے اسکرین پر موجود مختلف خوبصورت لڑکیوں پر مرکوز کر دی۔ تو وہ لب بھینچ کر کچھ پل اس کی طرف خاموشی سے دیکھنے کے بعد چپکے سے اس کے پہلو میں بیٹھ گئی۔

''جس سے پیار کرتے ہو، کیا وہ مجھ سے زیادہ خوبصورت، اور آپ کا خیال رکھنے والی ہے۔ ایسا کیا ہے اس میں عون...... جو آپ کو مجھ میں دکھائی نہیں دیتا۔''

بہت دھیمے لہجے میں اس نے استفسار کیا تھا۔ جواب میں ہمیشہ کی طرح وہ جیسے چیخ کر رہ گیا۔

''تم اس بات سے انجان نہیں ہو کہ میں تم سے شدید نفرت کرتا ہوں۔'' انگارے چباتا لہجہ کسی نشتر کی طرح اسے اپنی روح میں اترتا محسوس ہوا تھا۔ مگر اس نے لب بھینچ کر سینے میں اودھم مچاتی ٹیسوں کو ضبط کر لیا۔

''آپ مجھ سے صرف اس لیے نفرت کرتے ہیں نا کہ میں، آپ سے شدید محبت کرتی

ہوں۔''

''میں۔'' پرزور دیتے ہوئے اس نے جانے کس ضبط سے پوچھا تھا۔ جواب میں وہ مزید تلخ ہوتے ہوئے بولا۔

''تم سے نفرت کے لیے یہی وجہ کافی ہے کہ تمہاری وجہ سے میری پوری زندگی ڈسٹرب ہو کر رہ گئی ہے۔ ترس گیا ہوں میں دلی سکون اور ذہنی راحت کے لیے۔ صرف تمہاری ضد اور ہٹ دھرمی کے باعث آج میں اپنی محبت سے کوسوں دور ہوں......''

''زندگی میں انسان، بہت سی چیزوں کی خواہش کرتا ہے۔ مگر وہ سب چیزیں اسے مل تو نہیں جاتیں عون، کچھ چیزوں کے لیے انسان کو ہمیشہ ترسنا پڑتا ہے۔'' اب بھی اس کا لہجہ بے حد دھیما تھا۔

''ہاں...... مگر دانیہ خان کوئی چیز نہیں ہے میرے لیے، زندگی ہے وہ میری۔ میری ہر خوشی، ہر راحت، ہر خواب اس کی ذات سے وابستہ ہے۔ اور یہ بات میں نے کبھی تم سے نہیں چھپائی۔ مگر اس کے باوجود تم نے جان بوجھ کر، میری زندگی کو عذاب بنا ڈالا۔ اب گلہ کیسا محترمہ......؟ یہ سب ہونا تو طے تھا۔ اب ترستی رہو ساری عمر میری محبت کے لیے۔'' تلخی سے کہتے ہوئے وہ اس کے پہلو سے اٹھ کھڑا ہوا۔

''مانتی ہوں کہ میں نے آپ پر ظلم کیا ہے، مگر میری محبت بھی تو دیکھیں عون، صرف ایک آپ کو پانے کے لیے کیا سے کیا ہو کر رہ گئی ہوں میں......'' اب کے اس کے لہجے میں نمی در آئی تھی۔ مگر عون احمر جعفری نے اس کے نڈھال چہرے کی طرف نہیں دیکھا۔

''تم مجھے کبھی نہیں پا سکتیں یمنیٰ، اس بات کا اندازہ یقیناً بہت جلد تمہیں ہو جائے گا۔ بہر حال اس وقت میں تم سے بحث کے موڈ میں نہیں ہوں۔ میرے سر میں بہت درد ہو رہا ہے۔''

بیڈ پر نیم دراز ہوتے ہوئے، اس نے گداز تکیے پر سر ٹکا کر پلکیں موند لیں۔

تو ناچار اسے اٹھ کر اپنے بیڈ روم میں واپس آنا پڑا۔ سرخ سرخ آنکھیں آنسو لٹانے کو بے تاب ہو رہی تھیں۔ اعصاب کے ساتھ اب تو زندگی بھی جیسے اس کے اندر تھکنے لگی تھی۔ ایک گہری سانس خنک فضاؤں کے سپرد کرتے ہوئے اس نے شکستگی کے انداز میں بیڈ کی پشت سے ٹیک لگا کر آہستہ سے پلکیں موند لیں۔

ہجر کے ماہتاب سن
ہم بھی ہیں تیرے ہم سفر
ہم سے نہ اجتناب کر

جب بخت میں نہ چین ہو
کسی سے کیا گلہ کریں
راہ میں ان کو روک لیں
کیسے یہ حوصلہ کریں

☆......☆......☆

عشق اگر حسن کا محتاج ہوتا تو یقیناً وہ اس کے عشق میں اب تک اپنے حواس گنوا چکا ہوتا۔ کیونکہ وہ حسن و رعنائی میں بے مثال تھی۔ محبت اگر سلیقے، ہنرمندی یا وفا سے مشروط ہوتی تو اب تک شاید یمنی رحمٰن کی محبت، اس کے دل میں اپنی جڑیں مضبوط کر چکی ہوتی۔ کیونکہ یہ سب خوبیاں بدرجہ اتم اس میں موجود تھیں مگر عون احمر جعفر کا عشق حسن کا محتاج نہیں تھا۔ اس کی محبت، سلیقے، ہنرمندی یا وفا سے مشروط نہیں تھی۔ نتیجتاً اس کی زندگی میں آنے کے بعد یمنی رحمٰن کو سوائے آنسوؤں کی سوغات کے اور کچھ نہیں ملا تھا۔

تین سال ہو گئے تھے ان کی شادی کو مگر ان تین سالوں کے ایک ایک پل میں یمنی رحمٰن نے سوائے ذہنی اذیت اور دلی کرب کے اور کچھ بھی نہیں پایا تھا۔ تین سال سے وہ اپنے ملک، اپنے گھر والوں سے دور صرف اپنے محبوب شوہر کا دل جیتنے کی ضد میں کانٹوں پر زندگی بسر کر رہی تھی۔ اجنبی دیس کی بے درد فضاؤں اور بے باک ماحول میں۔ ہر پل اکیلی، سلگتے آنسوؤں کا زہر پی رہی تھی۔ زندگی اور تقدیر کی بے حسی سے مقابلہ کر رہی تھی۔ لیکن اب گزشتہ کچھ دنوں سے جانے کیوں یہ احساس اسے اندر ہی اندر تھکانے لگا تھا کہ وہ زندگی سے کبھی نہیں جیت سکتی۔

کروڑ پتی باپ کی اکلوتی اور لاڈلی بیٹی ہونے کے باوجود، صرف ایک عام سے شخص کی محبت میں اس نے اپنا آپ روند ڈالا تھا۔ اپنی ہر خوشی، پسند، ضد، فرمائش، راحت کو، خود اپنی ہی ذات کی تجوری میں رکھ کر لاک کر ڈالا تھا۔ عون احمر جعفر نامی اس شخص کے جسم کے ساتھ ساتھ اس کے دل کو بھی اپنی دسترس میں لے لینا، اس کی زندگی کا واحد نصب العین بن چکا تھا۔ خواہ اس کامیابی کے لیے اسے کتنی ہی جدوجہد کیوں نہ کرنی پڑتی۔ کتنا ہی لہولہان کیوں نہ ہونا پڑتا۔ وہ کسی قیمت پر بھی شکست کا بوجھ اٹھانے کو تیار نہیں تھی۔

تیار ہوتی بھی کیسے؟ زندگی میں ہار کا ذائقہ اس نے کبھی چکھا ہی نہیں تھا۔ جس وقت، جس چیز کے لیے اس کا دل مچلا، اسی وقت وہ چیز اس کی دسترس میں آ جاتی تھی۔ نتیجتاً آج وہ خودسری کی انتہا پر تھی اور خود اپنی زندگی کے ساتھ کھیل رہی تھی۔

وسیع کمرے میں لگی دیوار گیر گھڑی نے تین بجے کا الارم بجایا تھا۔ تبھی اس نے اپنی

آنکھیں کھولیں۔

''سنو یمنی......! جس سے پیار کرتی ہو، کیا وہ مجھ سے زیادہ خوبصورت ہے۔ مجھ سے زیادہ خیال رکھتا ہے تمہارا؟'' میران شاہ کی دھیمی مانوس آواز قریب سے ابھری تھی۔ جواب میں وہ بری طرح چونک کر ادھر ادھر نگاہ دوڑانے لگی۔

''تم نے محبت کا دل دکھایا ہے یمنی! میں خدا سے دعا کرتا ہوں، محبت تمہارا دل کبھی نہ دکھائے۔''

اس کی آواز میں آنسوؤں کی نمی شامل تھی۔ تب ہی وہ ایک دم سے دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر سسک اٹھی۔

''مجھے کسی کی نہیں، صرف تمہاری بددعا لگی ہے۔ میران شاہ۔ صرف تمہاری آہ لگی ہے مجھے۔'' جو آنسو اس وقت اس کی آنکھوں سے بہہ رہے تھے۔ وہ آنسو، میران شاہ کی آنکھوں سے بہہ رہے تھے۔ وہ آنسو تھے جنہیں وہ پچھلے تین سال سے نہایت بے دردی کے ساتھ اپنی آنکھوں سے دربدر کر رہی تھی۔ گو پچھلے تین سال سے بابا اور میران شاہ سے اس کا کوئی رابطہ نہیں رہا تھا۔ مگر پھر بھی وہ ہر پل اس کے ساتھ تھے جب بھی کبھی وہ کرب کی شدت سے گھبرا کر رونے بیٹھتی تھی۔ میران شاہ، فوراً نم آنکھوں کے ساتھ چپکے سے اس کے پہلو میں آ بیٹھتا تھا۔

''رو کیوں رہی ہو یمنی؟ جانتی ہو نا، میران شاہ تمہاری آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھ سکتا۔''

''ہاں...... جانتی تھی میں...... کہ تم میری آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھ سکتے میران۔ تبھی تو تم سے اتنی دور چلی آئی کیونکہ یہ آنسو میں نے خود اپنے لیے خریدے ہیں۔''

وہ دھیرے سے بڑبڑائی۔ وقت بہت آگے بڑھ گیا تھا۔ اب اگر وہ یاد نہ بھی کرتی، تب بھی اسے یاد رہتا تھا کہ اس نے کس دیوانگی کے ساتھ ''عون احمر جعفری'' کو چاہا تھا۔ حالانکہ عون احمر جعفری کو دیکھنے سے قبل۔ وہ سرے سے محبت کے وجود کو ماننے سے انکاری تھی۔

میران شاہ، جو اس کا فرسٹ چچا زاد کزن، منگیتر، اور سب سے قریبی دوست تھا۔ اس کی رفاقت بھی کبھی یمنی رحمٰن کے دل کے تاروں کو منتشر نہیں کر سکی تھی۔ حالانکہ دونوں میں انڈر اسٹینڈنگ تھی۔ مگر اس کے باوجود وہ کبھی میران شاہ کو محبوب کی حیثیت سے تسلیم نہیں کر سکی تھی۔

بچپن سے لے کر جوانی تک، وہ عجیب عادتوں کی مالک رہی تھی۔

قدرتی طور پر اس کی شخصیت میں شدت پسندی کا عنصر غالب رہا تھا۔ کبھی معمولی سی تکلیف پر رو رو کر آنکھیں سرخ کر لیتی، تو کبھی لہولہان ہو کر بھی لب سے ''سی'' نہیں نکالتی تھی۔ جو چیز دل کو بھا جاتی پھر اسے پانے کے لیے خواہ اسے آگ کے دریا میں ہی کیوں نہ کودنا پڑتا، وہ پیچھے ہٹ جانے والوں میں سے نہیں تھی۔ حد درجہ حساس، حد درجہ خودسر، حد درجہ ضدی...... یہ تھی اس کی شخصیت۔

رحمٰن صاحب، اپنی اکلوتی لخت جگر کی ان حرکتوں کے باعث خاصے پریشان رہا کرتے تھے۔ مگر مشکل یہ تھی کہ وہ اس سے کچھ کہہ بھی نہیں سکتے تھے۔ کیونکہ یمنی کے وجود میں ان کی جان تھی۔ حقیقت میں عائشہ بیگم کی وفات کے بعد ان ہی کے بے جا لاڈ پیار نے یمنی رحمٰن کے مزاج ساتویں آسمان پر پہنچا دیے تھے۔ وہ اتنی توجہ و اہمیت پر، خود کو عام انسانوں سے ماورا سمجھنے لگی تھی۔ ان لوگوں میں شامل ہو گئی تھی جو ایک پل کے لیے بھی نظرانداز ہونا گوارا نہیں کرتے۔ اس کی اسی عادت کے باعث میران شاہ نے کبھی اس سے ہٹ کر کسی اور لڑکی کے ساتھ راہ و رسم بڑھانے کی کوشش بھی نہیں کی تھی۔

تین سال قبل ہی وہ لوگ ایک طویل عرصہ شارجہ میں رہنے کے بعد پاکستان واپس لوٹے تھے۔ میران شاہ کو رحمٰن صاحب کی طرح اپنی مٹی سے بہت لگاؤ تھا۔ مگر یمنی رحمٰن پاکستانی کلچر کو ناپسندیدہ نگاہوں سے دیکھتی تھی۔ لہٰذا وہ پاکستان آ کر کچھ خاص خوش نہیں تھی۔ مزید یہاں آ کر نئے گھر اور نئے آفس کی سیٹنگ کی مصروفیات نے میران شاہ کو اس سے قدرے بے نیاز کر دیا تھا۔ وہ شدید بے زار رہنے لگی تھی۔ اس روز بھی ان دونوں کے مابین غالباً ایسا ہی کوئی جھگڑا ہوا تھا۔

☆......☆......☆

کل شام میران نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ وہ اسے آفس سے واپسی کے بعد ڈنر کے لیے لے جائے گا۔ ساتھ میں آئس کریم اور لانگ ڈرائیونگ کے دوران پورا شہر گھمانے کی یقین دہانی بھی کروائی تھی۔ لہٰذا یمنی نے خوب دل لگا کر تیاری کی۔ مگر آفس میں مصروفیات کے باعث، رات بہت دیر سے اس کی واپسی ہوئی تھی۔ اوپر سے اس نے اپنا موبائل بھی آف کر دیا تھا۔ نتیجتاً یمنی کا موڈ آف ہونا یقینی بات تھی۔

شدید ناراضی کے اظہار کے طور پر اس نے خود کو کمرے میں مقید کر کے اگلی صبح کا ناشتا بھی گول کر دیا تھا۔ تب مجبوراً میران شاہ کو اس کا موڈ بحال کرنے کے لیے آفس سے چھٹی کرنا پڑی۔ کیونکہ یمنی کی ناراضی اور آنسو۔ یہ دونوں چیزیں وہ برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ صبح کے تقریباً دس بج رہے تھے۔ جب وہ اس کی ناراضی کو دور کرنے کے لیے معذرتی الفاظ

سوچتا اس کے کمرے میں داخل ہوا تھا۔ نظروں سے کچھ ہی فاصلے پر گداز بستر میں وہ میٹھی نیند کے مزے لے رہی تھی۔ دراز پلکوں کے ساتھ، گالوں پر بے دردی سے بہائے گئے آنسوؤں کے نشانات رقم تھے۔ ایک پل کے لیے میران کو اپنی غفلت پر افسوس ہوا۔ اگلے ہی پل وہ فریج کی طرف بڑھا۔ اور اس میں سے ٹھنڈے یخ پانی کی بوتل نکال کر بے خبر سوئی یمنی رحمٰن پر انڈیل دی۔ اس کی توقع کے عین مطابق وہ فوراً ہی ہڑبڑا کر اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ سرخ سرخ سی خمار آلود نگاہیں، جونہی بیڈ کے قریب کھڑے میران شاہ کے مسکراتے چہرے کی طرف اٹھیں۔ وہ تپ کر رہ گئی۔

''یہ کیا بدتمیزی ہے مانی......؟ اور کسی کو نیند سے جگانے کا یہ کون سا مہذب طریقہ ہے۔'' ترش لہجے میں کہنے کے ساتھ ہی اس نے چہرے کا رخ پھیر لیا تھا ایک دھیمی سی مسکراہٹ میران شاہ کے لبوں کو چھو گئی۔

وہ کان پکڑ کر سوری کرتے ہوئے بولا۔

''معاف کر دو نا یار...... اصل میں رات کچھ دوستوں کے ساتھ نئے پروجیکٹ کے سلسلے میں ایک بلڈنگ کی لوکیشن دیکھنے چلا گیا تھا۔ موبائل تو آن تھا۔ مگر وہاں سگنل سسٹم کام نہیں کر رہا تھا۔ سروس نہ ہونے کے باعث، تم سے رابطہ نہ ہو سکا...... یقین مانو، مجھے اچھی طرح سے یاد تھا کہ میں نے تمہیں لانگ ڈرائیونگ کے ساتھ ڈنر کے لیے بھی لے جانا ہے۔''

''ہاں، باتیں بنانا تو کوئی تم سے سیکھے۔''

میران شاہ کی وضاحت پر سارا غصہ، پل میں رفع ہو گیا تھا۔ مگر آنکھوں میں اب بھی ہلکی سی خفگی کی جھلک بخوبی دیکھی جا سکتی تھی۔

''بالکل...... اور پاگل بنانا تم سے......'' اب کے اِس کی چھوٹی سی ناک دباتے ہوئے اس نے سکون کا سانس لیا۔

''او کے، لیکن کل چونکہ تمہاری وجہ سے میرے اتنے قیمتی آنسو ضائع ہوئے۔ لہٰذا تمہیں فائن تو ادا کرنا ہی پڑے گا۔ اور تمہارا فائن یہ ہے تم آج مجھے دوپہر میں لنچ کے ساتھ ساتھ ڈھیر ساری شاپنگ بھی کرواؤ گے۔ اور رات میں ڈنر...... اور پورا شہر دکھاؤ گے۔''

وہ اس کا ہاتھ تھام کر کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔ ''او کے۔''

☆......☆......☆

وہ اکیلی ہی گاڑی لے کر وسیع سڑکوں پر نکل کھڑی ہوئی۔ وہ ریش ڈرائیونگ کرتے ہوئے گھر واپس پلٹ رہی تھی۔ جب اچانک سامنے سے آتی ہوئی میرون سوک سے بری

طرح ٹکرا گئی۔

پل دو پل کے لیے آنکھوں کے سامنے جیسے تارے جھلملا گئے تھے۔ سر اسٹیئرنگ سے ٹکرانے کے باعث، یقیناً زخمی ہوگیا تھا۔ نچلا ہونٹ بھی دانتوں تلے آ کر کچلا جا چکا تھا۔ صد شکر کہ سامنے والے نے فوراً ہوشیاری سے کام لیتے ہوئے گاڑی کا رخ سڑک کی سائیڈ پر کچے راستے کی جانب موڑ دیا تھا۔ وگرنہ آج یمنی کا جلال نجانے کیا قیامت لاتا۔

میرون سوک میں بیٹھا خوبصورت سا اجنبی نوجوان تین چار جھٹکے کھانے کے بعد بمشکل گاڑی پر کنٹرول حاصل کر پایا تو غصے سے سرخ یمنی رحمٰن اپنی تکلیف کو پس پشت ڈال کر فوراً تنے ہوئے اعصاب کے ساتھ اس کے سر پر جا پہنچی۔

''مسٹر ایکس وائی، زیڈ! آپ کیا نشے میں گاڑی چلا رہے ہیں یا گھر سے نکلتے وقت آنکھیں ساتھ لانا بھول گئے ہیں۔ جو سڑکوں پر چلتی پھرتی اتنی بڑی بڑی گاڑیاں آپ کو دکھائی نہیں دے رہیں۔''

ہر ایرے غیرے پر اپنا رعب جمانے کی عادت پڑ چکی تھی۔ تبھی سوک میں بیٹھے، اس نوجوان کو خشمگیں نگاہوں سے گھورتے ہوئے بولی۔ تو اجنبی نوجوان نے بھی اسے منہ توڑ جواب دینے میں قطعی کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کی۔

''محترمہ، میرے خیال سے آپ نے کسی کے ساتھ ریس لگا رکھی تھی۔ یا پھر مجھ غریب کے ساتھ کوئی دیرینہ دشمنی نکالتے ہوئے صاف پھانسی پر چڑھ جانے کا ارادہ تھا آپ کا......''

''شٹ اپ! صرف آپ کی وجہ سے مجھے اتنی چوٹیں آئی ہیں۔ اور گاڑی کا نقصان الگ ہوگیا۔ اب میں گھر کیسے جاؤں گی۔''

نوجوان کے سرد لہجے پر تپتے ہوئے وہ اس کی بات کاٹ کر بولی۔ تو بے ساختہ وہ مسکرا کر رہ گیا۔

''کمال ہے۔ خودکشی کی دانستہ کوشش آپ کر رہی تھیں اور الزام میرے سر ڈال رہی ہیں۔ یہ تو وہی بات ہوگئی کہ الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے۔ ویسے میرے خیال سے سوسائیڈ کرنے کا یہ طریقہ بہت پرانا ہو چکا ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے......؟''

گداز گلابی لبوں پر آنے والی مسکراہٹ اس کا خون جلا رہی تھی۔ تبھی وہ ایک زبردست ٹھوکر اس کی گاڑی کو رسید کر کے خاصے سلگتے ہوئے لہجے میں بولی۔

''سوسائیڈ کریں میرے دشمن۔ خوب جانتی ہوں میں، آپ جیسے مردوں کو راہ چلتی خوبصورت لڑکیوں کے منہ لگنے کا تو بہانہ چاہیے......؟''

''اللہ رے خوش فہمی! مائنڈ یو میڈم، میں آپ جیسی لڑکیوں کو جوتے کی نوک پر رکھتا

ہوں۔'' وہ بھی شاید اپنے نام کا ایک ہی تھا۔ ذرا جو اس کے جلال سے مرعوب ہوا ہو۔

''بس، بس دیکھے ہیں بہت آپ جیسے، ہونہہ۔''

تیوری چڑھا کر رخ پھیرتے ہوئے وہ دھیمے سے بڑبڑائی تھی۔ جب وہ اجنبی نوجوان، سرعت سے ڈرائیونگ سیٹ چھوڑ کر۔ گاڑی کا دروازہ کھولتے ہوئے بولا۔

''ایکسکیوزمی میڈم، خاکسار کو عون احمر جعفری کہتے ہیں۔ حال ہی میں ایم بی بی ایس اور ایم پی پی ایس کی شاندار ڈگری لے کر وطن واپس لوٹا ہوں یقیناً آپ نے بہت سے ڈیشنگ مرد دیکھے ہوں گے۔ مگر مائنڈ یو میم، ان میں کوئی بھی عون احمر جعفری نہیں ہوگا۔ کیونکہ میں آپ جیسی نک چڑھی لڑکیوں کو سیدھا کرنے کا فن بخوبی جانتا ہوں۔''

''شٹ اپ! ڈاکٹری کی شاندار ڈگریاں لے کر بھی آپ کو عورتوں سے بات کرنے کی تمیز نہیں آئی۔''

''عورت کا احترام کرنا میں بخوبی جانتا ہوں۔ مگر معذرت کے ساتھ آپ جیسی عورت کے ساتھ بات کرنے کے لیے مجھے ایسا ہی لہجہ اپنانا پڑتا ہے۔''

دونوں بازو سینے پر لپیٹے وہ اب عین اس کے مقابل کھڑا تھا۔

''وہاٹ...... مجھ جیسی کیا......؟ آپ کو جرأت کیسے ہوئی مجھ سے یہ بات کہنے کی؟''

یمنی کے تو گویا تلوؤں سے لگی سر پر بجھی۔

''آپ خوامخواہ بات کو بڑھا کر اپنا اور میرا قیمتی وقت ضائع کر رہی ہیں میڈم مہربانی فرما کر یہ فضول کی بک بک بند کریں اور اپنا راستہ ناپیں، بصورت دیگر میں آپ جیسی لڑکیوں سے نبٹنا بخوبی جانتا ہوں۔''

بہت معمولی سا تناؤ آیا تھا اس کے چہرے پر شاید وہ فضول کی اس بک بک سے اکتا گیا تھا۔ سدا کی ایموشنل یمنی رحمٰن کی آنکھوں میں اس وقت جیسے خون اتر آیا۔

''یو اسٹوپڈ...... کیا آپ جیسی، آپ جیسی کی رٹ لگا رکھی ہے آپ نے......؟'' آپ کیا سمجھتے ہیں، جن عورتوں پر محض آپ کے ناموں کی مہر لگی ہے، وہی پاکدامن ہیں، باقی ہر عورت آپ کے لیے کوئی چلتا پھرتا ایڈ ہے۔ جسے آپ دیکھیں۔ چھیڑیں۔ اور لطف اٹھائیں۔ مسٹر عون احمر جعفری صاحب آپ مردوں کی غیرت کی کہانی محض اتنی سی ہے کہ آپ لوگ صرف اس عورت کے لیے مرنے مارنے پر تل جاتے ہیں جس کی ذات پر کسی نہ کسی حوالے سے آپ کے تعلق کا لیبل لگا ہوتا ہے۔ مگر ایسی ہی دوسری، پرائی عورت کے متعلق نہایت پست انداز میں سوچتے میں آپ خاصا لطف محسوس کرتے ہیں۔ وجہ محض اتنی سی ہے کہ آپ کے اندر کی انسانیت بے موت مرگئی ہے۔'' کوئی اس وقت اس کے تنفر سے پر

لہجے کو محسوس کرتا۔ اس کے چہرے پر بکھری سرخی کو دیکھتا۔ آنکھوں سے چھلکتے غصے کو دیکھتا۔ تو بخوبی جان لیتا کہ وہ کس حد تک ایموشنل لڑکی ہے۔

''ایکسکیوز می میڈم...... آپ پسند کریں تو میں آپ کو، آپ کے گھر ڈراپ کرسکتا ہوں۔''

مگر یمنی نے اس کی آفر پر کان نہیں دھرے۔

عون احمر جعفری سے اس کی دوسری ملاقات تقریباً تین ماہ بعد دوبارہ اسی روڈ پر ہوئی تھی۔ جس روڈ پر تین ماہ قبل ان کا ایکسیڈنٹ ہو چکا تھا۔

☆......☆......☆

اس روز موسم بہت خوبصورت تھا۔ پاپا اپنے آفس میں مصروف تھے۔ جب کہ میران شاہ بزنس ٹور کے سلسلے میں آسٹریلیا جا رہا تھا۔ میران شاہ کی فرمائش پر وہ اسے ڈراپ کر کے آئی تو دل بے ساختہ اپنی نئی فرینڈ زمعطر آفندی سے ملنے کو مچل اٹھا۔

معطر آفندی سے اس کی پہلی ملاقات ڈھائی ماہ قبل ایک بک شاپ میں ہوئی تھی۔ دونوں کو اپنے ذوق کی تسکین کے لیے ایک ہی کتاب درکار تھی۔ اور اتفاق سے اس وقت اس شاپ میں بہت تلاش کے بعد وہ کتاب ایک ہی دستیاب ہوسکی تھی۔ لہٰذا یمنی تو کسی صورت اس کتاب سے دستبردار ہو کر، مزید خوار ہونے کو تیار نہیں تھی۔ جب کہ معطر آفندی کو نئی فرینڈ کے برتھ ڈے گفٹ کے لیے اس سے بہتر تحفہ کوئی نہیں لگ رہا تھا۔ لہٰذا دونوں مین تھوڑی دیر معمولی سی تکرار ہوئی، بالآخر معطر نے وہ کتاب خود خرید کر، خاصے دوستانہ انداز میں یمنی رحمٰن کے سپرد کر دی۔ یہی پہلی ملاقات ان دونوں کی دوستی کا باعث بنی تھی۔

جس کے بعد ملنے ملانے اور فون کالز کرنے کا سلسلہ خود بخود شروع ہو گیا تھا۔ اس روز یمنی کے پاس اپنی گاڑی نہ ہونے کے باعث معطر نے اسے اپنی گاڑی میں خود اس کے گھر ڈراپ کیا تھا۔ بعد ازاں یمنی بھی کئی بار اس کے گھر جا چکی تھی۔ چند ہی دنوں میں دونوں ایک دوسرے کے خاصے قریب آ چکی تھیں۔

اس روز بھی یمنی کا ارادہ کچھ ایسا ہی تھا، نیلے آسمان پہ چھائے، کالے بادل اور رم جھم برستی بارش کی ننھی ننھی پھواریں۔ اس کے اعصاب پر خاصا خوشگوار اثر ڈال رہی تھیں۔ جب اچانک ایک دم سے سامنے سے آتے اک ٹرک کو سائیڈ دیتے ہوئے جونہی اس نے اپنی گاڑی کا رخ سڑک کے بائیں جانب کچے راستے کی طرف کیا۔ جانے کہاں سے نکل کر بھیڑوں کے پیچھے بھاگتا ایک چھوٹا سا بچہ اس کی گاڑی کے سامنے آ گیا۔ تب بدحواسی کے عالم میں اس نے ممکنہ حادثے سے بچنے کی پوری کوشش کی۔ مگر بچہ اس کی گاڑی سے ٹکرا کر

زمین پر گر چکا تھا۔ جب کہ کچھ ہی فاصلے پر گئے درخت سے ٹکرا کر گاڑی بھی حادثے کا شکار ہو چکی تھی۔

دیکھتے ہی دیکھتے لوگوں کا ایک جم غفیر وہاں جمع ہو چکا تھا۔ سب یمنی رحمٰن کی لاپروائی کو نشانہ بنا رہے تھے، کچھ لوگوں نے تو باقاعدہ اسے پولیس کیس قرار دیتے ہوئے یمنی کو پولیس حراست میں دینے کی تجویز پیش کر دی تھی۔ جس کے منہ میں جو آ رہا تھا وہ کہہ رہا تھا۔

جب کہ نیچے زمین پر پڑا بچہ، فوری امداد کے لیے تڑپ رہا تھا۔ سہمی سہمی سی یمنی رحمان نے اپنی زندگی میں پہلے کبھی ایسا خطرناک سانحہ نہیں دیکھا تھا۔ لہٰذا لوگوں کے گھیراؤں میں کھڑی پھٹی پھٹی نگاہوں سے بچے کی طرف دیکھتے ہوئے پتے کی مانند کانپ رہی تھی۔ پولیس کے نام سے ہی، اس کا خون خشک ہو رہا تھا۔ ٹانگیں مزید بوجھ سہارنے سے قاصر دکھائی دے رہی تھیں۔ موبائل کا کچھ پتا نہیں تھا کہ کہاں گر گیا تھا۔ جب کہ مشکل کی اس گھڑی میں، کسی بھی طریقے سے میران شاہ کو پکارنا بھی اس کے لیے ممکن نہیں رہا تھا۔

ہر طرف اجنبی لوگ تھے اور ان کے روح نگار جملے...... عجیب بے بسی کی کیفیت تھی۔

اس سے قبل کہ وہ رو پڑتی۔ خدا نے عون احمر جعفری کو رحمت کا فرشتہ بنا کر وہاں بھیج دیا تھا۔ گو عون نے وہاں جمع لوگوں کی وجہ سے محض سرسری انداز میں واقعہ کی تحقیقات کے لیے اپنی گاڑی روکی تھی۔ تاہم اصل صورت حال جاننے کے بعد وہ سرعت سے نکل کر سڑک پر بے یار و مددگار پڑے بچے کی طرف لپکا۔

بچے کی پیشانی سے بہتا خون، شدید خطرے کا باعث بن سکتا تھا۔ اسے فوری ٹریٹ منٹ دے کر گاڑی میں لٹانے کے بعد اس نے اپنی توجہ، لوگوں کے بیچ سر جھکائے کھڑی، یمنی رحمٰن کی جانب مبذول کی تھی۔ ہوائیاں اڑے چہرے کے ساتھ، متفکر کھڑی وہ اسے اس یمنی رحمٰن سے بہت مختلف دکھائی دے رہی تھی کہ جس سے ابھی تین ماہ قبل اس کی خاصی ناخوشگوار ملاقات ہوئی تھی۔ وہ خود اس وقت زخمی تھی۔ مگر زخموں کی تکلیف سے زیادہ رسوائی کا خوف اس پر غالب آ رہا تھا۔ تبھی عون احمر جعفری نے وہاں موجود لوگوں سے اپنا تعارف کروا کے بچے کی ذمہ داری خود پر لی۔ اور یمنی رحمٰن کو اپنی ایک عزیزہ کی حیثیت سے متعارف کروا کے لوگوں کی بھیڑ سے نکال لایا۔ یمنی تو اس کے اس اقدام پر ٹکر ٹکر اس کی طرف دیکھتی ہی رہ گئی تھی۔ جب کہ وہ بڑے آرام سے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر اپنی گاڑی کی طرف بڑھ آیا۔

بچے کو اسپتال میں داخل کر کے وہ فارغ ہوا تو اس کی توجہ یمنی پر گئی۔

یمنی کی آنکھیں، اب آنسوؤں سے بھیگ رہی تھیں۔ چہرے اور جسم پر لگے زخموں کی

تکلیف کا احساس بھی جاگ اٹھا تھا۔ تبھی وہ ایک دم سے دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔

''اب رو کیوں رہی ہو جب ڈرائیونگ کرنا آتی ہی نہیں تو گاڑی لے کر گھر سے نکلنا سراسر حماقت کے سوا اور کیا ہے......؟''

عون کے سرد لہجے پر اس نے فوراً سے پیشتر اپنے آنسو رگڑ ڈالے تھے۔

''میں گاڑی چلانا بخوبی جانتی ہوں، مم...... مگر اچانک بریک فیل ہو گئے تھے۔'' نم پلکوں کی جھالر سے سجی، بلوری نگاہیں، باقاعدہ اس کی آنکھوں میں ڈال کر اس نے وضاحت پیش کی تھی۔ جب وہ دھیمے سے سر جھٹک کر ذرا سا رخ پھیرتے ہوئے بولا۔

''آج گاڑی اور اس روز، غالباً آپ کے دماغ اور زبان کا بریک فیل ہو گیا تھا۔ ہے نا۔''

''آئی ایم سوری فار دیٹ......''

پلکیں جھپک کر قدرے شرمندہ لہجے میں اس نے کہا تو وہ ایک سرسری سی نگاہ اس پر ڈال کر گہری سانس فضا کے سپرد کر گیا۔

''پتا نہیں کیا چیز ہیں آپ؟ لڑکیوں کو غیر ذمہ دارانہ عادات بالکل سوٹ نہیں کرتیں......''

اس روز کی نسبت آج اس کا لہجہ خاصا سخت تھا۔ یمنی رحمٰن چپ چاپ آنسو بہانے میں مصروف رہی۔

''شکر کریں خدا کا کہ بچے کو زیادہ خطرناک چوٹ نہیں لگی۔ ورنہ اس معصوم کی جان تو جاتی ہی۔ ساتھ میں آپ کو سزائے موت کی بھینٹ چڑھنے سے بھی کوئی نہیں روک سکتا تھا۔''

آج اس کی خاموشی سے فائدہ اٹھا کر، وہ دل کا غبار نکالنا چاہ رہا تھا۔ پھر دفعتاً نگاہ اس کی پیشانی پر جمے خون، پھٹے ہونٹ اور چہرے پر لگی جابجا خراشوں کی طرف اٹھی۔ تو مزید ''گل فشانیوں'' سے احتراز برت کر فرسٹ ایڈ باکس اٹھا لیا۔

موسم کے تیور گزرتے ہر پل کے ساتھ بگڑتے چلے جا رہے تھے۔ ہلکی ہلکی بوندوں نے اب تیز بارش کی شکل اختیار کر لی تھی۔ قوی امکان تھا کہ اگلے کچھ لمحوں میں تیز جھکڑ بھی چلنا شروع ہو جاتے۔ خراب موسم کے باعث دن کے اجالے تیزی سے رات کی تاریکیوں کی لپیٹ میں آ رہے تھے۔

''آپ کے چہرے پر کافی زخم لگے ہیں۔ لائیے میں ڈریسنگ کر دیتا ہوں۔''

جونہی اس نے اپنی توجہ آنسو بہاتی یمنی رحمٰن کی جانب مبذول کی۔ وہ ایک دم سے

بوکھلا کر رہ گئی۔

''نن...... نہیں...... مم...... میں ٹھیک ہوں، آپ جلدی سے مجھے گھر پہنچا دیجئے...... پلیز۔''

''گھر کہیں بھاگا نہیں جا رہا، ویسے بھی اس حال میں گھر جائیں گی تو گھر والے زیادہ پریشان ہوں گے۔''

کہنے کے ساتھ ہی اس نے یمنی کی پیشانی پر لگا زخم کاٹن سے صاف کرنا شروع کر دیا۔ تو وہ مزید احتجاج نہ کر سکی۔

''اتنے خراب موسم میں، بھلا گھر سے نکلنے کی کیا ضرورت تھی آپ کو؟''

اس کی پیشانی کی ڈریسنگ کرتے ہوئے اس نے پھر ڈپٹا تھا۔

''جب میں گھر سے نکلی تھی، تو موسم اتنا خراب نہیں تھا۔''

ساری بولڈنیس، تیزی، طراری اس پل جیسے ہوا ہو کر رہ گئی تھی۔

''تھینکس...... آج آپ کی وجہ سے، میں ایک بہت بڑی مصیبت میں گرفتار ہونے سے بچ گئی۔ پتا نہیں آج اگر آپ یہاں میری مدد کے لیے نہیں آتے تو میرے ساتھ کیا ہوتا۔ میں نے اپنی زندگی میں کبھی اس طرح کے حالات کا سامنا نہیں کیا۔''

رحمٰن صاحب سے بات کرنے کے بعد اس کا اعتماد خاصا بحال ہو چکا تھا۔ تبھی عون کو موبائل واپس کرتے ہوئے وہ متانت سے بولی۔ تو وہ بھی دھیرے سے مسکرا دیا۔

''اٹس او کے۔ لیکن آپ سے ہمدردی کرنے کی پاداش میں اس وقت جو نقصان مجھے ہوا ہے آپ اس کا اندازہ نہیں لگا سکتیں۔'' اس کے تصور میں اس وقت دانیہ خان کا غصے سے سرخ چہرہ گھوم رہا تھا۔ جسے وہ قریبی ریسٹورنٹ میں چائے پینے کی دعوت دے کر آیا تھا۔ اور اب یقیناً وہ وہاں اکیلی بیٹھی اس کے انتظار میں کڑھ رہی تھی۔ مگر یمنی رحمٰن کو اس حقیقت کا ادراک نہیں تھا۔ لہٰذا وہ ذرا سا چونک کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

''میں سمجھی نہیں......''

''آپ سمجھ بھی کیسے سکتی ہیں محترمہ! یہ پرمحبت کی کہانیاں، بھلا سب کی سمجھ میں کہاں آتی ہیں؟

آئیں آپ کو چھوڑ آؤں۔'' اس نے گاڑی اسٹارٹ کی۔

عون کی مکمل توجہ ڈرائیونگ پر مرکوز تھی۔ وہ اس کی طرف بالکل نہیں دیکھ رہا تھا۔ مگر پھر بھی وہ اس کے الفاظ پر ٹھٹک گئی تھی۔

''میرا شام سلونا شاہ پیا

سانوں مار گئی تیری چاہ پیا

اپنی ہی رو میں گم وہ گنگنا رہا تھا اور ادھر یمنی رحمٰن حیران نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے الجھ رہی تھی۔

''عون یہ سب کس کے لیے کہہ رہا ہے؟ کہیں، کہیں یہ بھی تو میرے ملکوتی حسن سے انسپائر نہیں ہوگیا۔ یقیناً ایسا ہی ہے۔ تبھی تو اس نے مجھے عزیزہ کہا۔ بچے کی ساری ذمہ داری خود پر ڈالی کوئی یونہی تو کسی کے لیے اتنا نہیں کرتا۔ ہاں ضرور میرے حسن نے اس خوبرو سے شخص پر بھی اپنا سحر پھونک دیا ہے۔'' نگاہیں، مسلسل اس کے خوبصورت چہرے پر مرکوز کیے وہ سوچ رہی تھی۔ جب اس نے پھر سے اسے مخاطب کر ڈالا۔

''آپ کی گاڑی کا خاصا نقصان ہو چکا ہے۔ میں اپنے ڈرائیور سے بات کرلوں گا۔ وہ آپ کی گاڑی کو ایک دو روز میں ٹھیک کروا کے، آپ کے گھر پہنچا دے گا۔ تاہم گاڑی میں اگر آپ کا کوئی سامان نہ ہو تو سیدھے گھر چلیں۔''

''میرا پرس اور موبائل گاڑی میں رہ گیا ہے۔''

''اوکے......'' یمنی کی نشاندہی پر دھیرے سے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے اس نے گاڑی کو ریورس کیا تھا۔ جب کہ بارش کی شدت میں تاحال کوئی کمی واقع نہیں ہوئی تھی۔

عون احمر جعفری نے گاڑی کو بیک کر کے عین اسی جگہ روک دیا تھا کہ جہاں درخت سے ٹکرانے کے بعد یمنی کی کار خود بخود رک گئی تھی۔ وہ عون کی گاڑی سے نکل کر، اپنی گاڑی کی طرف بڑھی تو تیز بارش کے موٹے موٹے قطروں نے لمحے میں اسے اچھا خاصا بھگو ڈالا، اوپر سے بجلی کی خوفناک کڑک یمنی تو اس موسم میں اپنے بستر سے ایک پل کے لیے بھی باہر نہیں نکلتی تھی۔ کجا کہ یوں سڑکوں پر اجنبی لوگوں کے ساتھ خوار ہونا۔

گاڑی کی لائٹس چونکہ فیوز ہو چکی تھیں، لہٰذا اسے اندر اپنا پرس تو آسانی سے سیٹ پر پڑا مل گیا مگر موبائل کا کچھ پتا نہیں تھا کہ کہاں ہے، اسی تگ و دو میں مصروف وہ مایوس ہو کر جونہی اپنی گاڑی سے باہر نکلی۔ ایک دم سے آسمانی بجلی کی تیز لائٹ اس پر پڑی اور حلق کے بل چلاتے ہوئے عون کی طرف دوڑی جو ابھی اس کی پرابلم جاننے کے لیے اپنی گاڑی سے باہر نکلا تھا مگر اب وہ اس کے بازو سے ٹیک لگائے کھڑی سوکھے پتے کی مانند تھر تھر کانپ رہی تھی۔ ایک لمحے کے لیے تو وہ بھی ٹھٹک گیا تھا۔ لرزتا کانپتا نازک وجود، طوفانی موسم میں ایک امتحان ہی ثابت ہوا تھا اس کے لیے مگر اس نے اس امتحان میں اپنے کردار کی مضبوطی کو ڈوبنے نہیں دیا، تب ہی بازو سے تھام کر آہستگی سے خود علیحدہ کرتے ہوئے بولا۔

''کم آن پلیز...... میں ہوں نا آپ کے ساتھ۔ آپ گاڑی میں بیٹھیے، میں آپ کا

سامان دیکھتا ہوں۔'' یمنی رحمٰن کے دھڑ دھڑ کرتے دل کا شور اسے اب بھی اپنی سماعتوں میں اترتا محسوس ہو رہا تھا۔ تاہم اس نے سرعت سے قدم آگے بڑھاتے ہوئے اس احساس کو جھٹک دیا پھر تھوڑی سی کوشش کے بعد وہ اس کا موبائل ڈھونڈ کر گاڑی کو لاک کرتے ہوئے خود بھی اپنی سیٹ پر آ بیٹھا۔

''میرا خیال ہے اس وقت آپ کو گھر پہنچنا چاہئے، بچے کی پرابلم میں سنبھال لوں گا۔'' سرسری سی اک نگاہ اس کے بے حال سراپے پر ڈالتے ہوئے اس نے کہا تو یمنی کی آنکھیں مزید تشکر سے بھر آئیں۔

''تھینک یو سو مچ۔ میں آپ کا یہ احسان ہمیشہ یاد رکھوں گی۔''

''احسان کیسا محترمہ! مشکل میں انسان ہی انسان کے کام آتا ہے۔ بہرحال اس سفر کو میں ہمیشہ یاد رکھوں گا۔'' اس وقت عون، احمر جعفری کی آنکھوں میں کچھ ایسا تھا کہ وہ چونک کر ٹھٹک گئی تھی۔ پھر مختصر سی ڈرائیونگ کے بعد جب ان نے ''رحمٰن کاٹیج'' کے سامنے اپنی گاڑی روکی تو یمنی کا دل بے ساختہ ہی اس سے بچھڑنے کے احساس پر اداس ہوا تھا۔ کتنی عجیب بات تھی کہ اس جیسی پتھر دل، بے حس، خود سر لڑکی فقط چند گھنٹوں میں کسی سے اتنی متاثر ہوگئی تھی کہ اب وہ اسے چھوڑ کر جا رہا تھا تو اس کا دل پھر کبھی نہ ملنے کے احساس سے مچل رہا تھا۔

''اوکے میم۔ زندگی رہی تو پھر کہیں کسی موڑ پر دوبارہ ملیں گے۔ اپنا خیال رکھیے گا پلیز، اللہ حافظ۔'' جگمگاتی روشن نگاہوں والا وہ خوبصورت سا شخص نگاہوں سے اوجھل ہوگیا تھا، جب کہ وہ کتنی ہی دیر وہیں کھڑی بارش میں بھیگتی رہی تھی۔

☆......☆......☆

اگلے روز میران شاہ آسٹریلیا سے واپس آیا تو اسے ازحد مضطرب و اداس دیکھ کر جیسے کھل اٹھا۔

''تم آگئے مانی......'' اس پر نگاہ پڑتے ہی وہ بے قراری سے اس کی طرف بڑھی تھی۔

''ہاں لیکن لگتا ہے کچھ جلدی واپس آگیا ہوں۔''''

''کیوں؟'' بھنویں اچکا کر اس نے پوچھا۔ جب وہ سرد آہ بھر کر صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

''کیوں کا مطلب تو شاید تم بہتر جانتی ہو، زندگی میں پہلی بار یقیناً تم نے میری کمی کو محسوس نہیں کیا۔'' اس کے شکوے پر وہ کچھ لمحوں کے لیے ضرور گڑبڑا کر رہ گئی۔ فوراً ہی خود کو سنبھالتے ہوئے بولی۔

''طویل سفر نے یقیناً تمہارے اعصاب ٹھکانے پر نہیں چھوڑے۔ خیر تم بیٹھو، تب تک میں تمہارے لیے ایک گرماگرم چائے کا کپ بنالیتی ہوں۔ کچھ ہی دیر میں ہوسکتا ہے پاپا بھی اپنے دوست کے گھر سے آجائیں۔'' کہنے کے ساتھ ہی وہ کچن کی طرف بڑھ گئی۔ تو میران شان نے بھی دھیرے سے اثبات میں سر ہلا کر پلکیں موندلیں۔

''پچھلے دو روز سے میں تمہیں مس کررہا ہوں یمنی!'' پلکیں موندے موندے ہی اس نے باآواز بلند کہا تھا۔

''باتیں بنانا تو کوئی تم سے دیکھے مانی......''

''ہاں......لیکن اس کے جواب میں اپنے نظریات بھی میں کئی بار پیش کرچکا ہوں۔''

کچن میں کھٹ پٹ کے دوران بھی وہ اس کا جواب صاف سن سکتی تھی۔ تب ہی سر جھٹک کر مسکرائے بغیر نہ رہ سکی۔

''آسٹریلیا میں قیام کے دوران تم نے میری چائے کو تو یقیناً مس کیا ہوگا۔''

''بالکل......محض چائے ہی کیا تمہاری فون کال، تمہارے ایس ایم ایس، کس کس کو مس نہیں کیا میں نے اور ادھر تم جیسی بے حس لڑکی نے محض ایک مرتبہ بھی خود سے کال کرکے حال تک پوچھنا گوارا نہیں کیا۔''

اب کے وہ پلکیں موندے شکوہ کررہا تھا، تب ہی وہ بھاپ اڑاتی چائے کے گرم کپ تھام کر لاؤنج میں واپس آتے ہوئے بولی۔

''میں نے دو تین مرتبہ تمہارے سیل پر کال کرنے کی کوشش کی تھی مگر ہر بار تمہارا نمبر مصروف ملا۔ اب بتاؤ بھلا میں کیا کرتی۔''

اس نے چائے کا کپ میران شاہ کی طرف بڑھایا تو بے دھیانی سے تھامنے پر گرم گرم چائے کپ سے چھلک کر یمنی کے ہاتھوں اور پاؤں کو جلاگئی۔ بمشکل ایک ہلکی سی سسکاری اس کے لبوں سے نکلی تھی مگر میران شاہ پریشان ہوگیا۔

''اوگاڈ......! سوسوری یمنی......تمہیں زیادہ تکلیف تو نہیں ہورہی۔''

بجلی کی تیزی سے لپک کر وہ واش روم سے پیسٹ اٹھالایا تھا۔ یمنی تو اسے دیکھتی ہی رہ گئی تھی۔ معمولی سے پاؤں اور ہاتھ کے جلنے پر وہ جیسے تڑپ اٹھا تھا۔

''سوری یمنی! میری وجہ سے تمہیں اتنی تکلیف اٹھانا پڑی۔''

اپنے ہاتھوں سے اس کے زخم پر پیسٹ لگانے کے باوجود وہ اس سے شرمندہ دکھائی دے رہا تھا۔ حالانکہ جو کچھ بھی ہوا تھا، قطعی نادانستگی کے عالم میں ہوا تھا۔ مگر پھر بھی میران شاہ بے قرار ہوگیا تھا۔ محبت کا حصول اگر محبوب کی تکلیف، تڑپ سے مشروط ہوتا تو یقیناً

میران شاہ کی بے لوث محبت یمنی رحمٰن کے دل میں اپنا گھر ضرور کرلیتی مگر اس کی محبت کا حصول میران شاہ کی آنکھوں کے اضطراب اور اس کے دل کی تڑپ سے مشروط نہیں تھا۔ سو وہ خالی ہاتھ بے مراد رہا۔

☆......☆......☆

پیار کے سمندر میں ہر اترنے والے کو
کشتیاں نہیں ملتیں
دور دور تک جاناں دھوپ کی مسافت ہے
اور کہیں بھی پل بھر کو دھوپ کے مسافر پر
سائباں نہیں کھلتے
اس عجب سمندر میں عمر کی ریاضت کے
بعد ہم نے جانا ہے
جس طرح فضاؤں میں اڑنے والے پنچھی پر
برس ہا برس میں بھی بھید بھید رہتا ہے
رازداں نہیں ملتے، بام و در نہیں کھلتے
اس طرح محبت کے ہجر بیکراں میں بھی
ہر اترنے والے کو کشتیاں نہیں ملتیں
اور مل بھی جائیں تو بادباں نہیں کھلتے
پیار کے سمندر میں بھید، بھید رہتا ہے

رات دھیرے دھیرے بھیگ رہی تھی مگر یادوں کے سمندر سے اٹھتے تلاطم اسے نیند کی مہربان آغوش میں جانے سے روک رہے تھے۔ کھڑکی سے باہر برستی بارش کا شور سن کر آج بہت دنوں کے بعد اسے اپنا وطن، اپنے گھر والے شدت سے یاد آرہے تھے۔

''کہاں چلے گئے ہو میران شاہ! کبھی تو آکر میری آنکھوں سے برستے آنسوؤں کا نظارہ دیکھو۔ کبھی تو دیکھو کہ تم سے بچھڑ کر میں ہنسنا بھول گئی ہوں۔ کبھی تو آکر دیکھو میران شاہ......''

بہت آہستگی سے بڑبڑاتے ہوئے وہ سسکی تھی۔ آنسوؤں کے چند نمکین قطرے پھسل کر اس کے گال بھگو گئے تھے۔ بکھرتے آنسوؤں میں ہی ماضی کی یاد کا ایک اور چراغ روشن ہوا تھا۔

''یمنی......یار کہاں ہو تم......؟''

وہ بڑے مزے سے اپنے بیڈ پر لیٹی مووی دیکھ رہی تھی۔ جب میران شاہ اسے بلند آواز میں پکارتا ہوا وہیں اس کے کمرے میں چلا آیا تھا۔

''میں کب سے آوازیں دے رہا ہوں یمنی! اور تم ہو کہ اس میں گم ہو۔'' ہمیشہ کی طرح وہ اسے انڈین مووی میں گم دیکھ کر قدرے سٹپٹایا تھا۔ تب ہی وہ ریموٹ سے ٹی وی آف کر کے اس کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے بولی۔

''کیوں پکار رہے تھے مجھے؟''

''وہ...... میں مارکیٹ سے تمہارے لیے کچھ خرید کر لایا تھا۔''

''اور یئلی...... لیکن ابھی تو آسٹریلیا سے تم میرے لیے اتنا کچھ خرید کر لائے تھے۔'' وہ پل میں خاصی پرجوش ہوگئی تھی، تب ہی وہ اپنی مسکراہٹ کو چھپاتے ہوئے سنجیدگی سے بولا۔

''تحفہ دیتے رہنے سے محبت بڑھتی ہے یمنی! لیکن میری محبت کی گہرائی کا اندازہ لگانا تمہارے بس کی بات نہیں ہے۔'' کہنے کے ساتھ اس نے اپنے قدم واپس ہال کی طرف بڑھا دیے تو یمنی بھی اس کے پیچھے ہی کمرے سے باہر نکل آئی۔

''دکھاؤ نا، کیا تحفہ لائے ہو تم میرے لیے۔''

تحائف کی دلدادہ تو وہ بچپن سے ہی تھی، تب ہی قدرے بے تاب ہوئی تو میران نے تھوڑے سے انتظار کے بعد اپنی بند مٹھی اس کے سامنے کر دی۔

''یہ لو...... اس مٹھی میں جو چیز بھی ہے، وہ میں خلوص دل سے تمہارے سپرد کر رہا ہوں۔'' اس وقت وہ بے حد سیریس تھا، تب ہی یمنی رحمٰن نے چونک کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے اپنی گلابی ہتھیلی اس کے سامنے پھیلا دی مگر یہ کیا......؟ ہتھیلی پر بجائے کسی انمول گفٹ کے ایک زندہ موٹا تازہ کاکروچ رینگ رہا تھا جس کے لمس کو محسوس کر کے یمنی نے فوراً اپنے ہاتھ کی طرف دیکھا پھر ہتھیلی پر رینگتے زندہ کاکروچ کو دور پھینک کر زور سے چلا اٹھی۔ پہلو میں دھڑکتے نازک دل کی دھڑکنیں ایک دم سے منتشر ہوگئی تھیں۔

''یہ کیا یمنی...... کوئی خلوص سے تحفہ دے تو اس کو سنبھال کر رکھتے ہیں، دور نہیں پھینک دیتے۔''

میران اس وقت اسے ستانے کے موڈ میں تھا، لہٰذا مسکرا کر پھر سے زمین پر بے یارو مددگار چلتے زندہ کاکروچ کی طرف بڑھا تو یمنی رحمٰن فلک شگاف چیخ مارتی ہوئی قریبی صوفے پر چڑھ دوڑی۔

''خبردار مانی...... اگر تم نے یہ کاکروچ مجھ پر پھینکا تو میں تمہیں جان سے مار دوں گی۔''

بلند آواز میں چلاتے ہوئے اس نے وارننگ دی تھی۔ جواب میں تمام ملازمین بدحواس ہو کر لاؤنج کی طرف دوڑے آئے۔

''او مائی گاڈ یار......! عجیب چیز ہو تم بھی...... بھلا یہ چھوٹا سا کاکروچ تم جیسی اونچی لمبی دوشیزہ کو نگل سکتا ہے، خود ہی سوچو تم۔''

اسے روہانسی حالت میں رونے پر آمادہ پا کر وہ ذرا سا مسکرایا تھا۔

''یمنی...... تمہارے پاؤں میں کاکروچ......''

میران کے کہنے کی دیر تھی کہ وہ پھر سے چلاتے ہوئے قطعی بدحواسی کے عالم میں لاؤنج سے باہر لان کی طرف دوڑ گئی اور یہیں عون احمر جعفری سے اس کا تیسرا ٹکراؤ ہوا تھا۔ کاکروچ کے خوف سے لان کی طرف بھاگتے ہوئے وہ سامنے سے آتے عون احمر جعفری کو قطعی نہیں دیکھ پائی تھی، تب ہی اس سے بری طرح ٹکرا گئی تو عون کے ساتھ چلتے رحمٰن صاحب اپنی بیٹی کی اس درجہ بدحواسی پر ٹھٹک کر رک گئے۔

''یما...... کیا ہوا بیٹے...... آپ اتنی پریشان کیوں ہیں؟''

متوحش نگاہوں سے اپنی بیٹی کے سرخ چہرے کی جانب دیکھتے ہوئے انہوں نے پوچھا۔ عون احمر جعفری کو اپنے گھر میں اپنی آنکھوں کے سامنے کھڑا دیکھ کر شاکڈ رہ جانے والی یمنی رحمٰن نے بمشکل چونکتے ہوئے گم صم سے انداز میں جواب دیا۔

''وہ...... مانی مجھے تنگ کر رہا تھا پاپا......''

''او گاڈ...... پتا نہیں کب سدھرو گے تم دونوں۔ میں یہاں کیا کیا پلان کر رہا ہوں لیکن تم دونوں کا بچپنا ہے کہ رخصت ہونے کا نام نہیں لے رہا۔''

قدرے جھنجھلاتے ہوئے وہ لان سے لاؤنج کی طرف بڑھ گئے تھے جب عون احمر جعفری اپنی ستارہ سی روشن نگاہیں اس کے سرخ چہرے پر بغور جمائے عین اس کے مقابل آرکا۔

''لگتا ہے ایڈونچرز کی بہت دلدادہ ہیں آپ؟ لیکن یہ ہر بار مجھ سے ہی ٹکرانا کیوں فرض کر لیا ہے آپ نے؟''

''محض اتفاق کہہ لیجئے اسے، وگرنہ میں ایسا کوئی شوق نہیں رکھتی۔''

دل کی منتشر دھڑکنوں کا عکس اس نے اپنے چہرے پر پڑنے نہیں دیا تھا، تب ہی سہولت سے کہہ کر واپس لاؤنج کی طرف بڑھ گئی تو عون احمر جعفری بھی بے ساختہ مسکراتے ہوئے اس کے پیچھے ہی چلا آیا۔

''میران...... ان سے ملو بیٹے، عون احمر جعفری نام ہے ان کا۔ ابھی حال ہی میں اپنی

تعلیم مکمل کرکے لوٹے ہیں۔ میرے قریبی دوست رضا جعفری کو تو جانتے ہو تم، انہی کے بیٹے ہیں یہ۔''

''پاپا، میران شاہ سے اس کا تعارف کرواتے ہوئے بہت مسرور دکھائی دے رہے تھے۔ تب ہی نا جانے کیوں ایک ہلکے سے سرور کی لہر یمنی رحمٰن کے دل میں بھی سرائیت کرگئی۔ ابھی تھوڑی دیر قبل ''اپنے کارنامے'' کی روداد سنانے کا جو خوف اسے عون کو اچانک دیکھ کر لاحق ہوا تھا، وہ بھی جاتا رہا۔ رضا انکل کو وہ جانتی تھی۔ وہ ان کا بیٹا ہوگا، یمنی کے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا۔

''ہیلو...... مجھے میران کہتے ہیں، انکل نے یقیناً میرے بارے میں آپ کو بتایا ہوگا۔''

عون احمر جعفری سے ہاتھ ملاتے ہوئے اس نے مسکرا کر کہا۔ جواب میں وہ دل کشی سے مسکراتے ہوئے اثبات میں سر ہلا کر بولا۔

''جی ہاں...... جہاں تک میرا خیال ہے، انکل کی ہر بات آپ کے ذکر کے بغیر ادھوری ہے۔'' یمنی دیکھ سکتی تھی کہ اس کے الفاظ نے میران شاہ کے چہرے پر کیسے خوبصورت رنگ بکھیر دیے تھے۔

''اور عون! یہ میری بیٹی ہیں یمنی! انگلش میں ماسٹرز کیا ہے، آج کل فارغ ہے۔''

''نائس ٹو میٹ یو مس یمنی!''

سنجیدہ نگاہیں بغور اس کے خوبصورت چہرے پر جمائے وہ گمبھیر لہجے میں کہتا اس کی طرف متوجہ ہوا تو ناچار یمنی رحمٰن کو بھی خوش دلی سے مسکرا کر اس کی طرف دیکھنا پڑا۔

''تھینکس۔ مجھے بھی آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔ بہر حال میرا خیال ہے اب مجھے آپ لوگوں کے لیے گرما گرم چائے لے آنا چاہیے۔''

وہ اس ساحر کے سامنے کمزور پڑنا نہیں چاہتی تھی، تب ہی سرعت سے کہہ کر کچن کی طرف بڑھ گئی تو رحمٰن صاحب بولے۔

''میری یما بہت سمجھ دار بچی ہے۔''

''جی میں آل ریڈی ان کی سمجھ داری کے مظاہرے دیکھ چکا ہوں۔'' اپنے پیچھے عون احمر کے ان الفاظ پر اس نے فوراً پلٹ کر دیکھا تھا۔ وہ بھی با آواز بلند کہتے ہوئے اسی کی طرف مسکرا کر دیکھ رہا تھا۔

رحمٰن صاحب یا میران شاہ نے اس کے الفاظ پر زیادہ توجہ نہیں دی تھی، تب ہی وہ اطمینان کا سانس بھرتے ہوئے سرعت سے کچن میں گھس گئی۔

☆......☆......☆

اتوار کا دن تھا، لہٰذا میران شاہ کی آفس سے بھی چھٹی تھی، تب ہی یمنی نے ساحل سمندر پر چلنے کی فرمائش کردی تو بنا چون وچرا کیے ہمیشہ کی طرح وہ اس کی فرمائش پر فوراً اس کے ساتھ چلنے کو تیار ہوگیا۔

ٹھنڈی ٹھنڈی معطر ہواؤں کے ساتھ وسیع سمندر کی پرسکون موجوں کا رقص اعصاب پر اچھا اثر ڈال رہا تھا۔ یمنی رحمٰن گاڑی سے اپنا ضروری سامان نکال کر معطر آفندی سے بات کرنے کے بعد میران شاہ کی طرف آئی تو وہ کھویا کھویا سا ریت پر بیٹھا نجانے کیا لکھ رہا تھا۔

''کیا ہو رہا ہے مانی؟''

وہ اسے چونکہ کچھ لکھتے دیکھ چکی تھی، تب ہی اس کے مقابل بیٹھتے ہوئے پرشوق لہجے میں پوچھا تو جواب میں وہ ذرا سا رخ پھیر کر دھیمے سے بڑبڑایا۔

''ہو نہیں رہا یمنی! ہوگیا ہے......''

''کیا ہوگیا ہے؟'' اس کا اشتیاق مزید بڑھا تھا۔

''محبت ہوگئی ہے۔'' اب کے اس نے براہِ راست اس کی آنکھوں میں دیکھا تھا۔

''وہاٹ...... کس سے محبت ہوگئی ہے؟'' وہ واقعی بری طرح سے چونک اٹھی تھی، جب وہ پھر سے رخ پھیرتے ہوئے بولا۔

''ہے ایک حسین دوشیزہ، تم جان کر کیا کروگی؟''

''کچھ نہیں مگر اس حسین دوشیزہ کا کوئی نام بھی تو ہوگا کہ نہیں۔''

''نام تو بہت خوبصورت ہے اس کا لیکن تمہیں بتا دیا تو خوامخواہ جیلس ہوتی پھروگی۔''

''اگر ایسی بات ہے تو میں آج تم سے اس کا نام جانے بغیر تمہاری جان نہیں چھوڑوں گی۔'' اس کے الفاظ پر وہ بڑے محظوظ کن الفاظ میں دھیرے سے مسکرا دیا تھا۔

''بتاؤ نا مانی! کیا نام ہے اس کا۔''

باوجود اس کے کہ وہ میران شاہ سے دلی وابستگی نہیں رکھتی تھی، اس کے دل میں اضطراب نے گھر کرلیا تھا، تب ہی شاید وہ کچھ پل اس کے چہرے کی جانب بغور دیکھنے کے بعد آہستہ سے بولا۔

''یمنی...... یمنی رحمٰن نام ہے اس کا۔''

اپنی توقع کے عین مطابق میران شاہ کا جواب پا کر اس نے بے ساختہ اطمینان بھری گہری سانس فضا کے سپرد کی تھی۔ وہ اس سے ہٹ کر کسی اور کے لیے سوچتا، کسی اور کی جھولی میں چاہے جانے کا اعزاز پھینکتا، یمنی رحمٰن کی خود پسند فطرت کو یہ بات بھلا کب گوارا تھی،

تب ہی گہری سانس بھرنے کے بعد دھیمے سے مسکراتے ہوئے بولی۔
''میرا اور تمہارا جو تعلق ہے اسے محبت کے سہارے کی ضرورت نہیں ہے مانی!''
''یہ محض تمہارا نظریہ ہے، میں اس سے متفق نہیں ہوں۔'' میران شاہ نے بھی اپنی رائے پیش کرنے میں ایک لمحہ نہیں لگایا تھا۔
''تمہارے کہنے کا مطلب ہے کہ تم مجھ سے محبت کرنے لگے ہو۔''
''ہاں...... ہو بھی سکتا ہے......'' اس کی نگاہیں اب بھی پرسکون سمندر کی لہروں پر جمی تھیں۔
''جواب میں مجھ سے کیا چاہتے ہو میران؟''
''کیا دے سکتی ہو تم مجھے۔'' یمنی کے سوال کا جواب دینے کی بجائے اپنا سوال اس کے سامنے رکھ دیا۔
''جو بھی تم مجھ سے چاہو، ماسوائے محبت کے......'' بہت دھیما لہجہ تھا اس کا مگر میران شاہ نے چونک کر اس کی طرف دیکھا تھا۔
''محبت کا حق کسے دان کرو گی یمنی!'' وہ پوچھنا نہیں چاہتا تھا مگر پوچھ بیٹھا تھا۔ جواب میں وہ قدرے مضطرب ہوتے ہوئے بولی۔
''محبت دانش مندوں کا ورثہ نہیں ہے میران! اور نہ ہی اسے باقاعدہ پلاننگ کے بعد خوب سوچ سمجھ کر کسی کے سپرد کیا جاتا ہے۔ یہ تو بس ایک نظر کا سوال ہے کب، کہاں، کس نظر کی بھینٹ چڑھ جائے کیا خبر۔'' وہ اس وقت غالباً اپنے حواس میں نہیں تھی۔
تاہم اس سے پہلے کہ میران شاہ جواب میں اس سے کچھ کہتا، یمنی رحمٰن کی نگاہیں قطعی بے ساختگی کے عالم میں کچھ ہی فاصلے پر اکیلے بیٹھے عون احمر جعفری کے خوبصورت سراپے پر جا پڑیں۔ اس وقت وہاں اچانک عون احمر جعفری کو دیکھ کر جس طرح سے وہ مسرور ہوئی تھی، اس کی نگاہوں کے تعاقب میں نظریں اٹھاتے میران شاہ پر بہت کچھ منکشف ہو چکا تھا۔ صرف ایک پل لگا تھا، اسے مسمار ہونے میں۔ عرش سے فرش پر آنے میں۔ ابھی چند سیکنڈ قبل جو ٹھنڈی ہوائیں اسے کپکپانے پہ مجبور کر رہی تھیں۔ انہی ہواؤں میں ایکدم سے گویا آگ بھر آئی تھی۔

میرا شام سلونا شاہ پیا
سانوں مار گئی تیری چاہ پیا

بہت دھیمے سے یمنی کے لبوں نے جنبش کی تھی۔ جواب میں میران شاہ کی سانسیں جیسے سینے میں اٹکنے لگیں۔ عون احمر جعفری ان کی طرف متوجہ نہیں تھا۔ مگر پھر بھی اس لمحے یمنی کی

آنکھوں کی چمک نے اس کی پلکوں کو بھگو ڈالا تھا۔ اسے رہ رہ کر سوچنے پر بھی یاد نہیں آ رہا تھا کہ اس کی محبتوں میں کہاں کمی رہ گئی تھی کہ اس نے اپنا راستہ بدل لیا۔ اس کے بے لوث جذبوں سے منہ پھیر کر کسی اور کے لیے سوچنا شروع کر دیا۔ دل کا اضطراب حد سے سوا ہوا تو ایکدم سے وہ اٹھ کھڑا ہوا۔
''تم یہیں بیٹھو یمنی! میں آئس کریم لے کر آتا ہوں۔''
بجھے بجھے سے لہجے میں کہنے کے ساتھ ہی وہ تیز تیز قدم اٹھاتا نگاہوں سے اوجھل ہوا تو یمنی ایک دم سے اپنے حواس میں واپس لوٹ آئی۔ عون احمر جعفری موبائل پر کسی سے بات کر رہا تھا۔
اسی اثناء میں یمنی کے عقب میں بیٹھے دو نوجوان لڑکے آپس میں کسی بات پر جھگڑ پڑے۔ بات غصے و اشتعال اور گالی گلوچ سے بڑھ کر مار کٹائی تک آ پہنچی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے نوجوان نے اپنی جینز کی پاکٹ سے پسٹل نکال لیا۔ کراچی جیسے شہر میں اس طرح کے معاملات معمول کا حصہ تھے مگر یمنی رحمٰن کے لیے یہ صورت حال قطعی غیر متوقع اور نئی تھی۔ لہٰذا وہ بدحواس ہو کر چلا اٹھی تھی تب ہی عون احمر جعفری نے موبائل آف کر کے اس کی طرف دیکھا۔ اپنی جگہ پر ساکت بیٹھی وہ خوف سے زرد پڑ رہی تھی جب کہ اس کے قریب بیٹھے نوجوان نے شدید مشتعل ہو کر اپنے ساتھی لڑکے پر فائر کر دیا تھا۔
اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے وہ چلا رہی تھی، جب عون احمر جعفری تیزی سے اس کی طرف لپکا۔
جب اچانک پسٹل والے لڑکے نے ان کی پشت پر کھڑے اپنی ساتھی کو پسٹل کی زد میں لے لیا اور پھر اس سے پہلے کہ یمنی اسے اس بات سے آگاہ کرتی اس لڑکے کے پسٹل سے نکلتی گولی پشت پر کھڑے لڑکے کے بھاگ جانے پر سیدھی عون احمر جعفری کے کندھے کو چیر گئی۔
یقیناً اس وقت اگر وہ اس کے سامنے نہ آتا تو یہ گولی یمنی رحمٰن کے دماغ میں گھس کر اپنا کام دکھا چکی ہوتی۔ ایک دم پتھر ہوئی بصارتوں کے ساتھ اس نے عون کے کندھے سے نکلتے خون کی سرخی کو دیکھا۔ لوگ خاصے بدحواس ہو رہے تھے جب کہ وہ دونوں لڑکے لمحوں میں وہاں سے بھاگ گئے تھے مگر یمنی کے حواس جیسے سن ہو گئے اور پھر اس سے پہلے کہ وہ اسے سنبھالتا وہ ہوش و حواس سے بے گانہ ہو کر نیچے زمین پر گر پڑی تھی۔
وہ دوبارہ اپنے حواس میں واپس لوٹی تو اس کے لبوں پر سب سے پہلا ذکر عون احمر جعفری کا تھا۔

''پاپا...... پاپا......عون کیسا ہے، اسے زیادہ چوٹ تو نہیں آئی؟''

اپنی حالت سے یکسر بے خبر وہ عون احمر جعفری کے لیے رو رہی تھی اور اس کے یہ آنسو سیدھے میران شاہ کے دل پہ گر رہے تھے، تب ہی وہ لپک کر اس کی سمت بڑھا۔

''عون ٹھیک ہے یمنی! ابھی یہاں سے گیا ہے۔ تم اپنا حال دیکھو، کتنی دیر کے بعد ہوش میں آئی ہو۔'' پریشان کھڑے رحمٰن صاحب کی جگہ میران شاہ نے اسے جواب دیا تھا۔

وہ اس کے لیے متفکر ہو رہا تھا اور ادھر یمنی رحمٰن کے آنسو اس کے رقیب کے لیے بہہ رہے تھے۔

ساحل سمندر پر ہوئے اس چھوٹے سے واقعہ نے یمنی رحمٰن کے دل کو دنیا کی اتھل پتھل کر کے رکھ دیا تھا۔ وہ نہ بھی سوچنا چاہتی، تب بھی عون احمر جعفری کا تصور رہ رہ اسے بے قرار کرتا رہتا تھا۔ دل کی شوریدہ سری نے محض چند ہی دنوں میں خاصا نڈھال کر چھوڑا تھا اسے۔ رحمٰن صاحب اس کی وجہ سے خاصے پریشان تھے جب کہ میران شاہ تو جیسے جینا ہی بھول گیا تھا۔

رات رات بھر جاگنے سے اس کی سرخ سوجی ہوئی آنکھوں کے نیچے حلقے پڑ گئے تھے، وہ جو ہر روز لباس تبدیل کرنے کا عادی تھا، اب پچھلے تین چار روز سے ایک ہی سوٹ میں ملبوس دکھائی دے رہا تھا۔ بزنس کی طرف سے بھی اس کی توجہ ہٹ گئی تھی۔ گھر سے بھی زیادہ وقت باہر ہی گزارتا تھا۔ خوبصورت ''رحمٰن کاٹیج'' میں اچانک سناٹے در آئے تھے۔

اس تمام صورت حال سے گھبرا کر ہی رحمٰن صاحب نے ان دونوں کی جلد شادی کرنے کا فیصلہ کیا تھا اور آج کل وہ اپنی سرگرمیوں میں بری طرح مصروف دکھائی دے رہے تھے۔

☆......☆......☆

اس روز بہت دنوں کے بعد یمنی اپنے سلوٹوں سے پر کپڑوں کی شکنیں ہاتھ سے درست کرتی، منہ ہاتھ دھو کر لان کی طرف آئی تو وہاں میران شاہ کو موجود پا کر ٹھٹک گئی۔ کئی دنوں کی بڑھی ہوئی شیو، میلے لباس اور بکھرے اعصاب کے ساتھ بیٹھا وہ شخص میران شاہ نہیں ہوسکتا تھا۔

''آؤ یمنی! پلیز بیٹھو نا۔''

میران کی نظر جونہی اس پر پڑی، وہ فوراً پکار اٹھا، وہ تھکے تھکے سے قدم اٹھاتی عین اس کے مقابل جا بیٹھی۔

''ایک سوال پوچھوں یمنی! سچ سچ جواب دو گی۔'' عجیب بکھرا ہوا لہجہ تھا اس کا وہ بے اختیار ہی نگاہیں چرانے پر مجبور ہوگئی۔

''تمہیں یاد ہے یمنی! ابھی چند روز قبل تم نے مجھ سے کہا تھا کہ میں تم سے کچھ بھی مانگوں تو تم دو گی۔ ماسوائے محبت کے، کہا تھا نا تم نے۔''

''ہاں۔'' چہرے کا رخ پھیر کر عجیب شکستہ سے انداز میں اس نے اقرار کیا تھا۔

''تو ٹھیک ہے، میں تم سے تمہارا عمر بھر کا ساتھ مانگتا ہوں یمنی! دے دو اپنا ساتھ مجھے۔'' میران کے سوال پر اس نے تڑپ کر اس کی سمت دیکھا۔

''میری محبت کے بغیر میرا ساتھ پانا چاہتے ہو تم۔''

''آئی ڈونٹ نو۔ میں بس تمہیں کھونا نہیں چاہتا یمنی! مجھ سے اتنا حوصلہ نہیں کہ اپنے ہاتھوں سے تمہیں کسی اور کے سپرد کر دوں۔''

چیختے لہجے میں احتجاج کیا تھا اس نے۔ جواب میں وہ دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔

''میرا دل میرے اختیار میں نہیں ہے مانی! میں اگر اسے حاصل نہ کر پائی تو مر جاؤں گی۔''

''اور تمہیں نہ پا کر میں مر جاؤں گا یمنی!''

اب کے میران شاہ کا لہجہ بھیگ گیا تھا، آنسو چھلکاتی آنکھیں سراپا سوال بن کر اس کے چہرے پر مرکوز ہوگئی تھیں۔

''تم اعلا ظرف ہو مانی! مضبوط دل ہے تمہارا۔ تم یہ درد اٹھا سکتے ہو مگر مجھ میں اتنی سکت نہیں ہے۔'' آنسوؤں نے اس کے پورے چہرے کو بھگو ڈالا تھا۔ وہ سسک رہی تھی۔

''میری آدھی ادھوری ذات کا کیا کرو گے میران! مت آزمائش میں ڈالو مجھے، پلیز۔''

میران شاہ کا رہا سہا بھرم بھی مٹی میں مل گیا تھا۔ ذرا سی خوش فہمی کے ٹمٹماتے چراغ کو یمنی رحمٰن کی آنکھوں سے عون احمر جعفری کے لیے بہتے آنسوؤں نے ایکدم سے بجھا ڈالا تھا۔

''میں نے کبھی تمہارے بغیر اکیلے جینے کا تصور نہیں کیا یمنی! تمہیں خود سے الگ رکھ کر جینے کی عادت نہیں ہے مجھے۔''

''تمہیں یہ عادت اب ڈالنا ہوگی میران! کیونکہ عون احمر جعفری کو بھلانے کا اختیار اب میرے پاس نہیں رہا ہے۔''

میران شاہ کی سرخ نگاہوں کی طرف دیکھے بغیر اس نے کہا۔ جب اس نے نڈھال لہجے میں سوال کیا۔

''جس سے پیار کرتی ہو، کیا وہ، مجھ سے زیادہ خیال رکھتا ہے تمہارا؟''

''میں کچھ نہیں جانتی میران! لیکن میں اسے اپنے دل اور اپنی زندگی سے نکال نہیں سکتی۔'' قدرے چلا کر کہتے ہوئے وہ اٹھ کھڑی ہوئی، جب اس نے پھر سے شکستہ لہجہ میں سوال کیا۔

''انکل اس بات کے لیے نہیں مانیں گے یمنی! ان سے کیا کہو گی۔''

میران شاہ کے سوال پر فوراً پلٹتے ہوئے وہ خاصی بے دردی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولی۔

''ان سے میں نہیں تم کہو گے مانی! اور یاد رکھنا، اگر مجھے عون احمر جعفری نہیں ملا تو میں اپنی جان پر کھیل جاؤں گی پھر کسی کے پاس سوچنے اور پچھتانے کا موقع بھی نہیں رہے گا۔''

محبت دشت فرقت میں
بنا رخت سفر چلتے، کسی مجذوب کے دل سے نکلتا ایک نوحہ ہے
محبت راستوں کے جال میں بھٹکا ہوا راہی
کسی کے بام پر ٹھہرا ہوا اک اجنبی چہرہ
محبت خواب بن جائے تو تعبیریں نہیں ملتیں
محبت ایک بارش ہے
جو اک بوند کر کے تن سے من میں جب اترتی ہے
سریلے ساز بجتے ہیں۔ انوکھے باب کھلتے ہیں
کسی فنکار کے ہاتھوں سے چھڑتا بے خودی کا راگ
محبت بارش کے موسموں میں یاد کی کایا۔
محبت اک اداسی ہے، بلا کی خاموشی بھی ہے۔
محبت پت جھڑوں کا نام، محبت اک سلگتی شام۔

شب آہستہ آہستہ بھیگتے ہوئے۔ آدھے سے زیادہ سفر طے کر چکی تھی۔ مگر آج بھی نیند یمنی رحمٰن کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ قطار در قطار آنسوؤں کے پھسلنے کا سلسلہ تا حال جاری تھا۔

نظر کے کینوس پر اس وقت تین سال کا وہ سین ابھر رہا تھا۔ جب وہ عون احمد جعفری کو پانے کے لیے ہسٹریک ہوئی تھی۔ رحمٰن صاحب اس کی اور میران شاہ کی شادی کے بارے میں بہت سنجیدہ تھے وہ جلد از جلد اس فریضے کو سرانجام دے کر پرسکون ہونا چاہتے تھے۔

جب عین وقت پر اس نے بغاوت کر ڈالی۔

''میں مانی سے شادی نہیں کر سکتی پاپا۔''

''کیوں؟'' ان کی آنکھیں از حد حیرانی سے سکڑی تھیں۔ جب کہ قریبی صوفے پر بیٹھے میران شاہ کا دل جیسے دھڑکنا بھول گیا تھا۔

''کیونکہ۔ میں مانی کو صرف اپنا اچھا دوست اور کزن سمجھتی ہوں۔ اس کے علاوہ کچھ نہیں۔'' خودسری انتہا پر تھی۔

''میران ایک دوست اور ایک کزن کے علاوہ تمہارا فیانسی بھی ہے یما۔ اس بات کو مت بھولو تم۔''

''میں اس بات کو سرے سے مانتی ہی نہیں ہوں، پاپا، بھلانے یا نہ بھلانے کا سوال تو بعد میں اٹھتا ہے...... وہ اس وقت بے حسی کی ہر انتہا کو پھلانگتی۔ میران شاہ کی ذات کو پستیوں میں دھکیل رہی تھی۔

''تم بے وقوفی کر رہی ہو یما، میں نے اگر آج تک تمہاری ہر خواہش پوری کی ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ کہ تمہارے دل میں جو آئے، تم وہی کرو۔ ابھی میں تمہارا برا بھلا سوچنے کے لیے زندہ ہوں، جس دن مر جاؤں اس دن کرتی رہنا اپنی من مانیاں۔'' جلال آیا رحمٰن صاحب کو، یمنی رحمٰن نے ان کے کسی لفظ کی پروا نہیں کی۔

''پاپا، آپ نے آج تک اگر میری ہر خواہش کو پورا کر کے۔ میری ذات پہ احسان کیا ہے۔ تو اس احساس کا شکریہ لیکن میں اپنی زندگی کا اتنا بڑا فیصلہ اپنی مرضی کے خلاف ہونے نہیں دوں گی۔ میں نے مانی سے بات کر لی ہے جب اسے اس فیصلے پر کوئی اعتراض نہیں ہے تو آپ اس بات کو اتنی اہمیت کیوں دے رہے ہیں۔''

''اپنی آواز نیچی رکھو یمنی، مت بھولو کہ اس وقت تم اپنے باپ سے مخاطب ہو۔ جہاں تک میران کا سوال ہے تو اس پاگل لڑکے کے ظرف پر سوال مت اٹھاؤ۔ اپنی جان سے بڑھ کر چاہتا ہے یہ تمہیں۔ کفران نعمت مت کرو بیٹے۔ بہت پچھتاؤ گی۔''

شکستہ لہجہ تھا ان کا۔ شاید اولاد خودسر ہو جائے تو والدین کے لہجے ان کے مان کے ساتھ یونہی بکھر جایا کرتے ہیں۔

اس کی آنکھوں میں واضح آنسو چھلک آئے تھے تبھی رحمٰن صاحب نے نڈھال لہجے میں پوچھا تھا۔

''کون ہے وہ؟''

''آپ اسے جانتے ہیں پاپا، بہت پسند بھی کرتے ہیں اسے۔''

''عون...... عون کی بات کر رہی ہو تم؟'' ایک مرتبہ پھر وہ از حد حیران رہ گئے۔

جواب میں یمنی رحمٰن نے پلکیں جھکا کر چپ چاپ اثبات میں سر ہلا دیا۔

''میں اسے تمہارا اٹل فیصلہ سمجھوں یا محض جذباتیت۔''

''زندگی میں پہلی بار میں نے جذبات سے ہٹ کر کوئی فیصلہ کیا ہے پاپا، مجھے لگتا ہے میں عون کے ساتھ بہت خوش رہوں گی۔''

اس کے پاس گویا ہر سوال کا جواب موجود تھا۔ تبھی رحمٰن صاحب نے تھکے تھکے سے انداز میں خود کو صوفے پر گراتے ہوئے ہاتھ کے اشارے سے اسے وہاں سے چلے جانے کا حکم دیا۔ جانے کیوں اس وقت ان کا دل درد سے بوجھل ہو رہا تھا۔ اعصاب جیسے لمحوں میں شل ہو گئے تھے۔ آج انہیں خود اپنے آپ پر غصہ آ رہا تھا۔ شرمندگی محسوس ہو رہی تھی۔ اپنی تربیت پر۔ اکلوتی بیٹی کی ہٹ دھرمی پر، ایک لمحے میں جیسے وہ صدیوں کا سفر طے کر آئے تھے۔ آج انہیں پچھتاوا ہو رہا تھا کاش وہ اپنی بیٹی کو اتنی آزادی نہ دیتے۔ اس کی ہر جائز و ناجائز خواہش پوری نہ کرتے تو آج یہ دن دیکھنا نصیب نہ ہوتا۔

محض یمنی کی ضد و اصرار۔ پر انہوں نے نجانے کس دل سے اپنے دوست رضا جعفری کے سامنے اپنا سوال رکھا تھا۔ جواب میں انہوں نے نہایت محبت کے ساتھ، انہیں رشتہ پکا سمجھنے کی یقین دہانی کروا دی۔ یمنی تو انہیں بھی دل سے بے حد پسند تھی۔ دوسرا انہیں اپنے بیٹے کی فرماں برداری پر بڑا مان تھا، لہٰذا اپنی طرف سے انہوں نے بات کو تقریباً پکا کر دیا تھا۔

☆......☆......☆

رحمٰن صاحب کے کہنے پر رضا جعفری صاحب نے عون سے بات کی تو شاکڈ رہ گیا۔ یمنی رحمٰن جیسی لڑکی کے بارے میں سوچنا اسے خواب میں بھی گوارا نہیں تھا۔ اس نے لحاظ کیے بغیر صاف انکار کر دیا۔ دل کے اندر اگر کسی لڑکی کو ہم سفر بنانے کی خواہش پنپ بھی رہی تھی تو وہ صرف دانیہ خان تھی۔ اس کی یونیورسٹی فیلو، جو یورپ میں تعلیم کے دوران اس سے ملی تھی۔ دھیما مزاج رکھنے والی سادہ سی دانیہ فقط تھوڑے سے عرصہ میں ہی اس کی روح و اعصاب پر، بری طرح قابض ہو چکی تھی۔ تاہم ابھی وہ یہ بات اپنے ڈیڈ کے سامنے نہیں کر سکا تھا۔ لہٰذا تعلیم کی آڑ لے کر اس جھنجھٹ سے جان چھڑانے کی بھرپور کوشش کی۔ مگر زبان پر قائم رہنے والے رضا احمد جعفری صاحب کے سامنے اس کی ایک نہ چلی۔ زبردستی کی صورت میں جہاں اس نے گھر چھوڑنے کی دھمکی دی۔ وہیں رحمٰن رضا نے اس کی نافرمانی پر اپنی جان سے گزر جانے کا فیصلہ سنا دیا۔ نتیجتاً وہ بے بسی کے عالم میں، پنجرے میں قید پنچھی کی مانند، محض پھڑپھڑا کر رہ گیا۔

دانیہ خان کی جگہ کسی اور کو زندگی کا حصہ بنانا گویا موت کے مترادف تھا۔

اس کے ذہن میں ڈائریکٹ یمنی رحمٰن سے بات کرنے کا خیال آیا تھا۔ اگر وہ اس پر تمام حقیقت کھول کر رکھ دیتا تو یقیناً وہ خود اس رشتے سے انکار کر کے اس کا مسئلہ حل کر سکتی تھی۔ یہی سوچ کر اس نے یمنی رحمٰن سے اس کے پرسنل سیل پر بات کر کے اسے قریبی ریسٹورنٹ میں ملنے کی دعوت دی تھی۔

☆......☆......☆

وہ اگلے روز شام میں، شاندار ریسٹورنٹ کے پرسکون ماحول میں، ایک دوسرے کے مقابل تھے۔

''مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے یمنی......!''

ٹیبل پر موجود اپنے سامنے رکھے مشروب کے گلاس کے کنارے پر انگلی پھیرتے ہوئے بالآخر اس نے بولنے میں پہل کی تھی۔ جب وہ اپنا گلاس ہاتھ کی گرفت میں لیتے ہوئے دلکشی سے مسکرا کر بولی۔

''تو کہہ ڈالیے نا عون، میں یہاں آپ کی بات سننے ہی تو آئی ہوں۔''

اس وقت سج سنور کر عون احمر جعفری کی قربت میں، اس کے مقابل بیٹھنا، اسے کتنی بڑی خوشی سے ہمکنار کر رہا تھا، یہ صرف اس کا دل جانتا تھا، بلیک جینز پر لائٹ گرے شرٹ میں ملبوس اس کے عین مقابل بیٹھا وہ تیکھے نقوش والا خوبصورت شہزادہ آنکھوں کے راستے سیدھا اس کے دل میں اتر رہا تھا۔

''آج میں آپ سے جو کچھ بھی کہنے جا رہا ہوں، سمجھ لیجیے کہ بے حد مجبور ہو کر کہہ رہا ہوں۔''

عون نے ایک مرتبہ پھر سرسری سی اک نگاہ، اس کے سجے سنورے سراپے پر ڈالتے ہوئے جیسے تمہید باندھی تھی۔

''میں اچھی طرح جانتی ہوں عون کہ آپ آج مجھ سے کیا کہنا چاہ رہے ہیں۔''

وہ چونک کر استفہامیہ نگاہوں سے اس کی طرف متوجہ ہوا۔ تو وہ اپنی لانبی پلکیں جھکا کر مدھم لہجے میں بولی۔

''آپ مجھ سے یہی کہنا چاہتے ہیں نا کہ میری طرح آپ کو بھی مجھ سے محبت ہو گئی ہے۔ آپ بھی رات رات بھر مجھے سوچ کر جاگتے رہتے ہیں۔ آپ کے دل میں بھی اضطراب نے گھر کر لیا ہے۔ آپ بھی جلد از جلد مجھے اپنی زندگی میں شامل کرنا چاہتے ہیں، ہے نا......؟''

کتنے رسان سے رخساروں پر جھکی پلکیں اٹھا کر اس نے پوچھا تھا۔ جواب میں عون احمر جعفری کے سر پر جیسے ساتوں آسمان ایک دم سے گر پڑے۔ پھٹی پھٹی نگاہوں سے اس نے یمنی رحمٰن کے خوبصورت چہرے پر دل کش رنگوں کو دیکھا تھا۔

''آپ ضرور کسی بہت بڑی غلط فہمی، بلکہ خوش فہمی کا شکار ہیں مس یمنی!''

چند پل ضبط کے کڑے مراحل سے گزرنے کے بعد اس نے بے حد سرد انداز میں کہا۔ وہ جیسے ساکت رہ گئی تھی۔

''میں نے کبھی ایک لمحے کے لیے بھی آپ کے بارے میں اس انداز سے نہیں سوچا مس یمنی۔ میں نے آج یہی بات کلیئر کرنے کے لیے آپ کو یہاں بلایا ہے۔'' قطعی سرد انداز میں بنا اس کی طرف دیکھے وہ کہہ رہا تھا اور ادھر اس کے مقابل بیٹھی یمنی رحمٰن گویا مٹی کا بت بن کر رہ گئی تھی۔

''پلیز مائینڈ اٹ، میں اس زبردستی کے بندھن کا قائل نہیں ہوں۔ میرے نزدیک شادی جیسے مقدس اور مضبوط بندھن کا تعلق محض دو جسموں کا ملاپ نہیں ہے۔ بلکہ اس میں دو انسانوں کی دلی خوشی، ذہنی آسودگی اور روح کا قرار بھی شامل ہونا ضروری ہے۔ لہٰذا میں آپ کے سامنے یہ اعتراف کرنے میں قطعی کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتا کہ میں کسی اور لڑکی کو پوری ایمانداری کے ساتھ چاہتا ہوں۔ اور زندگی بھر چاہتا رہوں گا۔ میری زندگی میں کسی دوسری لڑکی کی گنجائش نہیں ہے میرے ساتھ اگر آپ کی شادی ہو بھی گئی تو میں آپ کو کچھ نہیں دے سکوں گا۔ نہ محبت، نہ عزت و احترام، نہ کوئی مقام اور...... نہ ہی آپ کا حق...... لہٰذا بہتر یہی ہے کہ آپ دانش مندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس یکطرفہ محبت کے سلسلے کو یہیں ختم کر کے، اس شادی سے انکار کر دیں۔ بصورت دیگر آپ اپنی دشوار ترین زندگی کی ذمہ دار خود ہوں گی۔''

اپنے دل کا غبار اس کی سماعتوں میں انڈیلنے کے بعد وہ وہاں ٹھہرا نہیں تھا۔ سرعت سے کرسی کھسکا کر تیز تیز قدم اٹھاتا باہر نکل گیا تھا، جب کہ وہ ساکت بیٹھی پھٹی پھٹی نگاہوں سے اسے دور جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔

خالی ذہن خالی روح اور خالی نگاہوں کے ساتھ ساکت بیٹھی وہ جیسے کچھ بھی سننے اور سمجھنے کی صلاحیت سے بے بہرہ ہو گئی تھی۔

میرا شام سلونا شاہ پیا
سانوں مار گئی تیری چاہ پیا

زندگی میں پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ اس نے کسی چیز کی خواہش کی اور وہ چیز اس کی

دسترس سے دور تھی۔ اپنے ٹھکرائے جانے پر اس کا دل جیسے غم و غصے کا الاؤ بن کر رہ گیا تھا۔ نڈھال قدموں کے ساتھ گم سم سی وہ گھر واپس آ گئی۔

وہ اس وقت اپنے بستر پر لیٹی، اسی کے متعلق سوچ رہی تھی۔

''ہیلو مس یمنی...... پھر آپ نے کیا سوچا؟''

رسمی دعا سلام کے بعد اس نے خاصے بے تاب لہجے میں پوچھا تھا۔ جب وہ قطعی انجان بنتے ہوئے بولی۔

''کس بارے میں؟''

''میں نے آپ پر جو حقیقت کھولی تھی اس کے بارے میں......'' قدرے چبا چبا کر اس نے کہا تھا۔ وہ قدرے بے نیازی سے بولی۔

''مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا عون۔ ویسے بھی آج کل ہر کوئی شادی سے پہلے ایسی سرگرمیوں میں مصروف دکھائی دے رہا ہے۔ آپ نے اگر کسی کو پسندیدگی کی نظر دیکھ لیا۔ تو کیا ہوا۔ نصیب تو میرا ہی بنیں گے آپ؟''

''جسٹ شٹ اپ مس یمنی! میں دل کی گہرائیوں سے دانیہ خان کو چاہتا ہوں۔ اس سے ہٹ کر کسی اور لڑکی کے ساتھ زندگی بتانے کا تصور بھی نہیں کیا ہے میں نے۔''

''یمنی رحمٰن کے ہٹیلے پن کی انتہا پر تپتے ہوئے اس نے کہا تھا۔ جب وہ دل میں اٹھتی ٹیسوں کو دباتے ہوئے بولی۔

''آئی ڈونٹ کیئر، میں آپ سے اتنی محبت کروں گی کہ آپ دانیہ خان تو کیا، خود اپنے آپ کو بھی بھول جائیں گے۔''

''بکواس بن کرو اپنی، کیوں میرے ساتھ ساتھ اپنی زندگی کو بھی عذاب بنانے پر تلی ہوئی ہو تم۔''

''میں آپ سے پیار کرتی ہوں عون، بے حد، بے تحاشا۔''

''جسٹ شٹ اپ! میں زبردستی کے رشتے کا قائل نہیں ہوں۔ نہیں دے سکتا تمہیں کوئی خوشی، پھر اتنی سی بات کیوں سمجھ میں نہیں آ رہی ہے تمہارے۔'' عون احمر جعفری کا ضبط جیسے جواب دے گیا تھا۔ تاہم یمنی رحمٰن کے جنون میں قطعی کوئی کمی نہیں آئی۔

''اتنی ہی نفرت تھی مجھ سے، تو میری بجائے خود اپنے کندھوں پر گولی کیوں کھائی تھی آپ نے؟ کیوں اس حادثے کا شکار ہونے والے، بے یار و مددگار بچے کی ذمہ داری خود اٹھائی تھی۔ بولیے، کیوں کیا تھا یہ سب کچھ آپ نے۔'' اپنی دانست میں اس نے عون احمر جعفری کو لاجواب کرنا چاہا تھا۔ جب وہ قطعی روکھے لہجے میں بولا۔

"میں نے یہ سب محض انسانی ہمدردی کے تحت کیا تھا۔ معلوم نہیں تھا کہ صلے میں خود میری زندگی داؤ پر لگ جائے گی۔" یمنی نے اس کا جواب بہت صبر سے سنا تھا۔ پھر اسی طرح ٹھہرے ہوئے مدھم لہجے میں بولی۔

"محض انسانی ہمدردی میں مجھ سے محبت بھی کرلیں ناعون پلیز......"

التجا پر وہ ایک مرتبہ پھر ضبط کھونے لگا۔ مگر سنبھل گیا۔ تبھی چبھتے ہوئے کٹیلے لہجے میں بولا۔

"محبت اگر کوئی بھیک ہوتی تو میں اسے ضرور آپ کی جھولی میں ڈال دیتا، مس یمنی! مگر اس وقت سوال میرے دل، میری زندگی کا ہے۔ آپ میں اگر ذرا سی بھی عزت نفس ہے تو اپنے ڈیڈی کو اس رشتے سے منع کر دیجیے۔ بصورت دیگر میں ان پر ساری حقیقت کھول کر رکھ دوں گا۔ کیونکہ میں محض آپ کی خوشی کے لیے اپنی پوری زندگی کو داؤ پر نہیں لگا سکتا۔"

"اگر یہ آپ کی نفرت ہے تو میں اسے شہد سمجھ کر گھونٹ گھونٹ پی جاؤں گی عون! لیکن اگر یہ آپ کا چیلنج ہے تو جائیے، جو کر سکتے ہیں کرلیں۔ آپ کو میرا نصیب بننے سے دنیا کی کوئی طاقت نہیں روک سکتی۔" کہنے کے ساتھ ہی اس نے موبائل آف کر ڈالا تھا۔

میران شاہ کے متفکر انداز نے بالآخر اس کے ضبط کے سارے بند توڑ ڈالے تھے۔ وہ بے اختیار ہوکر اس کے کندھے سے سر ٹکاتے ہوئے سسک پڑی۔

"مانی...... مانی وہ مجھ سے پیار نہیں کرتا۔ وہ کسی اور کو چاہتا ہے مانی، وہ کسی اور کو چاہتا ہے۔" ایک وہی تو غمگسار تھا اس کا، اس کی خوشیوں میں ہنسنے والا۔ اور دکھوں میں رونے والا۔

"پلیز یمنی! روؤ مت، تم جانتی ہو نا، میران شاہ کو تمہارے آنسو بہت تکلیف دیتے ہیں۔" محبت سے اس کے بال سنوارتے ہوئے اس نے التجا کی تھی۔ وہ نڈھال سے انداز میں نیچے زمین پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

"میں اسے کھونا نہیں چاہتی مانی، مرجاؤں گی میں اس کے بغیر۔"

اس کا لہجہ بھرایا ہوا تھا۔ مگر کوئی اس وقت میران شاہ کی آنکھوں میں تیرتے درد کا نظارہ کرتا تو شاید یہ جان لیتا کہ اس کے دل میں پلنے والا درد یمنی رحمٰن کے اندر موجود درد سے کتنا بڑھ کر ہے۔

"ایک بات کہوں یمنی، مائنڈ تو نہیں کروگی؟"

برا ماننے کے لیے اس کے پاس رہ ہی کیا گیا تھا۔ لہٰذا سن دماغ کے ساتھ بھیگی پلکیں اٹھا کر خاموشی سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

"پتا ہے یمنی! یہ جو محبت ہے نا، یہ اس شخص کے ساتھ کبھی نہیں کرنی چاہیے جسے محض آپ ٹوٹ کر چاہتے ہوں، مگر اسے آپ کی کوئی پروا نہ ہو۔ آپ کے جذبات و احساسات آپ کے آنسو، اس پر کوئی اثر نہ کرتے ہوں۔ یہاں تک کہ ایک دن اس کے موم ہونے کا انتظار کرتے کرتے آپ خود پتھر کے ہو جائیں۔ ایسی یکطرفہ محبت سے کیا حاصل یمنی، کیا یہ بہتر نہیں کہ ہم دل کا رشتہ اسی شخص کے ساتھ جوڑ لیں۔ جو ہم سے پیار کرتا ہو، چاہے ہم اسے چاہیں نہ چاہیں۔ وہ ہماری فکر کرتا ہو۔ ہمارا خیال رکھتا ہو۔ ہمارے آنسو اسے تکلیف پہنچاتے ہوں۔ ہماری ذرا سی توجہ اسے خوشی سے بے حال کر دیتی ہو۔ جو ہمارے مزاج کے ہر موسم سے آشنا ہو......"

وہ خود غرض نہیں تھا۔ محض اپنے دل کی خوشی کے لیے یمنی رحمٰن کو آزمائش میں ڈالنا اسے پسند نہیں تھا۔ مگر اس وقت سوال اس کے دل کی خوشی کے ساتھ ساتھ یمنی کے بہتر مستقبل کا تھا۔ اس کی مستقل خوشیوں کا تھا۔ سو اس نے تھوڑا سا خود غرض بن کر اسے سمجھانے میں قطعی کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کی تھی۔ تاہم جواب میں یمنی رحمٰن کے الفاظ نے اسے دکھی ضرور کر ڈالا تھا۔

"میں اس وقت کچھ بھی سوچنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں مانی! مجھے ہر قیمت پر عون احمر جعفری کو حاصل کرنا ہے۔ اس کے لیے چاہے مجھے اپنی جان سے ہی کیوں نہ گزرنا پڑے۔ میں پیچھے ہٹنے والوں میں سے نہیں ہوں۔"

"تم پچھتاؤ گی یمنی!" میران نے اسے اس فیصلے سے باز رکھنے کی کوشش کی۔

"پروا نہیں مانی، ایک بار وہ میری دسترس میں آجائے۔ پھر اس کا دل اپنی طرف مائل کرنا۔ میرے لیے کچھ مشکل نہیں ہے۔"

عجیب ضدی لہجے میں کہنے کے ساتھ ہی وہ اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی آئی تھی۔

☆......☆......☆

پورے وجود میں عجیب سی آگ دہک رہی تھی۔ اس وقت وہ کسی کے بارے میں نہیں سوچ رہی تھی۔

اس وقت وہ نہیں جانتی تھی کہ بعض خوشنما نظر آنے والی چیزیں، زندگی کا حصہ بن جائیں تو جینا دشوار کر دیا کرتی ہیں۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ وہ خیر کی بجائے شر کو طلب کر رہی ہے۔ وہ بھی ایسی ہی تھی۔ خیر کی بجائے شر کو مانگنے والی۔ اندھا دھند اندھی محبت کی دلدل میں دھنسنے والی۔ نفس کی منہ زور آندھی میں بہہ کر، خود کو سلگتے لمحوں کی آگ کے سپرد کرنے والی۔ یہ سمجھ کر خود کو مطمئن رکھنے والی کہ دنیا میں محبت سے بڑھ کر کچھ نہیں ہے۔ دل کی خوشی

سے بڑھ کر دنیا کی کوئی راحت نہیں، کوئی دولت نہیں۔ رحمٰن صاحب جانتے بوجھتے ایک ایسے شخص کے ہاتھ میں اپنی بیٹی کا ہاتھ نہیں دینا چاہتے تھے جو اس کی خوشیوں کی ضمانت بھی نہیں دے سکتا تھا۔

عون احمر جعفری نے انہیں ساری بات بتادی تھی اور اس کی صاف گوئی انہیں اچھی لگی تھی۔ مگر اس سے پہلے کہ وہ کوئی حتمی فیصلہ کر پاتے اچانک یمنیٰ رحمٰن وہاں چلی آئی۔ رحمٰن صاحب نے، عون کے سامنے ہی اس سے تمام بات کلیئر کرنے کا ارادہ کیا تھا۔ مگر وہ تو جیسے کچھ سننے کو تیار ہی نہیں تھی۔ مسلسل ایک ہی رٹ لگائے ہوئے تھی کہ اسے ہر قیمت پر عون احمر جعفری کا ساتھ چاہئے۔ خواہ کچھ ہو جائے۔ وہ اپنی خواہش سے پیچھے نہیں ہٹے گی۔ اس کی اس درجہ ہٹ دھرمی پر، جہاں عون احمر جعفری طیش میں آیا تھا۔ وہیں رحمٰن صاحب کا چہرہ بھی غصے سے سرخ ہو گیا تھا۔ تب اس موقع پر روایت کے مطابق اپنی بیٹی کو سرکشی سے روکنے کے لیے انہوں نے بھی وہی داؤ آزمایا تھا، جو اس موقع پر اکثر والدین آزمایا کرتے ہیں۔

''یار رکھو یمنی! اگر تم نے اس سلسلے میں ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کرتے ہوئے میرے فیصلے سے انحراف کیا تو میں اپنی جان سے گزر جاؤں گا۔ میں اپنے جیتے جی، تمہیں یہ احمقانہ فیصلہ کرنے کا اختیار قطعی نہیں دوں گا۔''

وہ جانتی تھی کہ رحمٰن صاحب انہیں اس طریقے سے بلیک میل ضرور کریں گے۔ تبھی اس نے پہلے سے ہی اس کا جواب سوچ لیا تھا۔

''اوکے پاپا! اگر آپ ایسا چاہتے ہیں تو میں ہرگز کوئی ایسا قدم نہیں اٹھاؤں گی۔ جو محض میری وجہ سے آپ کو کسی بھی قسم کی تکلیف سے دوچار کرے۔''

اتنی جلدی ہتھیار پھینک دینے پر، جہاں رحمٰن صاحب حیران ہوئے تھے، وہیں عون احمر جعفری بھی اپنی جگہ گویا شاکڈ رہ گیا تھا۔ مگر وہ محض ایک لمحے کے لیے سانس لینے کو رکی تھی۔

''میں سرکش نہیں ہوں پاپا! لیکن عون کو حاصل کرنا۔ اب میرا جنون بن گیا ہے اب یہ تو طے ہے کہ میں انہیں کھو کر زندہ نہیں رہ سکتی۔ پھر جب یہ طے ہے تو یہ زندگی بھی کس لیے پاپا......؟''

اپنا جملہ مکمل کرنے کے فوراً بعد اس نے صوفے کی سائیڈ پر دھرے ٹیبل پر سے پھل کاٹنے والی چھری اٹھا کر سرعت سے اپنی بائیں کلائی کو کاٹ ڈالا تھا۔ اس سے قبل کہ رحمٰن صاحب یا عون احمر جعفری کچھ کر پاتے، وہ لہو میں نہا گئی تھی۔
آناً فاناً ہی وہ بات ہو گئی تھی کہ جس کا ان دونوں نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔ اس

معاملے میں وہ اس حد تک جذباتی واقع ہو گی، رحمٰن صاحب کے ساتھ عون احمر جعفری کو بھی اس کا اندازہ نہیں تھا۔ تبھی دونوں بدحواس ہو کر اس کی طرف لپکے تھے۔ لمحوں میں وہ ہوش و حواس سے بے گانہ ہو گئی تھی۔ میران شاہ کو اس واقعے کی بابت علم ہوا۔ تو وہ رحمٰن صاحب اور عون احمر جعفری کے ساتھ الجھ پڑا۔
یمنیٰ رحمٰن کی خوشی، اس کی زندگی، اسے دنیا کی ہر چیز سے زیادہ عزیز اور قیمتی تھی۔ اس کی خوشی کے لیے وہ ہر امتحان سے گزر سکتا تھا۔ لہٰذا اس وقت بھی صرف اس کی خوشی کے لیے اس نے اپنے دل کی قطعی پروانہ کرتے ہوئے ان دونوں کے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے تھے۔

دو دن ہوش و حواس سے بے گانہ رہنے کے بعد تیسرے دن وہ ہوش میں واپس آئی، تو میران شاہ اس کے بستر کے قریب دھری کرسی پر الرٹ بیٹھا یک ٹک اس کی طرف دیکھے جا رہا تھا۔ کتنی وحشت تھی اس وقت اس کی آنکھوں میں، سرخ سرخ سوجی ہوئی آنکھوں میں تیرتا پانی، عجیب سے درد کی کہانی سنا رہا تھا تبھی وہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے بچوں کی مانند پھر سے رو پڑی۔
''مانی...... مانی...... مجھے عون احمر جعفری چاہئے۔ پلیز ہیلپ می مانی، پلیز۔''
''یمنی...... پلیز روؤ مت...... میں ہوں نا، میں کرواؤں گا عون سے تمہاری شادی۔''
اس وقت اس کا ہر لفظ رو رہا تھا۔ مگر وہ اسے تسلی دے رہا تھا۔
''پرامس......''
''ہاں پرامس...... لیکن آئندہ ایسی حرکت مت کرنا یمنی! جانتی ہو نا۔ میران شاہ کی زندگی کا محور صرف تمہاری ذات ہے کیوں بار بار آزمائش میں ڈالتی ہو تم مجھے۔''
بھرائے ہوئے زخمی لہجے میں کہتا۔ وہ اس کے پہلو سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

☆......☆......☆

بعض رشتے ایسے ہوتے ہیں، جنہیں مضبوط کرتے کرتے انسان خود ٹوٹ جاتا ہے۔
یمنی رحمٰن کے ساتھ میران شاہ کا رشتہ بھی ایسا ہی تھا۔ اس کی ذات سے وابستہ وفا کے بندھن کو مضبوط کرتے کرتے۔ وہ خود ٹوٹ رہا تھا۔ یمنی رحمٰن کو ''رحمٰن کاٹیج'' سے رخصت کرتے وقت بظاہر مختلف کاموں میں مصروف دکھائی دینے کے باوجود وہ بار بار اپنی بھیگتی آنکھوں کو رگڑ رہا تھا۔ پرپل کلر کے نہایت دیدہ زیب لہنگا کرتی میں ملبوس، زیورات سے لدی پھندی۔ گہرا میک اپ کیے۔ وہ اسے دنیا کی سب سے حسین ترین لڑکی دکھائی دے رہی تھی۔ آنسوؤں کے جس ریلے پر وہ کب سے بند باندھے ہوئے تھا۔ اس وقت اسے

اپنے مقابل پاکر وہ ضبط کھو بیٹھا۔

"تھینک یو مانی، مجھے معلوم ہے کہ تم مجھ سے بہت پیار کرتے ہو، شاید اس پیار سے بھی زیادہ، جو میں عون سے کرتی ہوں۔ لیکن آئی ایم سوری مانی، میں تمہارا ساتھ نہیں دے سکی۔ ہو سکے تو میری اس خودغرضی کو معاف کر دینا۔ اور پاپا کے ساتھ ساتھ اپنا بھی خیال رکھنا پلیز......"

خوبصورت بلوری آنکھوں سے آنسو چھلکاتی، سرگوشیانہ لہجے میں وہ اس سے التجا کر رہی تھی۔ بنا کچھ کہے وہ تیزی سے پلٹ کر اپنے کمرے کی جانب بڑھ گیا۔

☆......☆......☆

"رحمٰن کا میچ!" سے وہ بڑی دھوم دھام سے رخصت ہوئی تھی۔ اور ادھر "احمر پیلس" میں اس کا استقبال یوں کیا گیا تھا۔ گویا کسی ریاست کی راج کماری ہو۔ رضا احمر جعفری صاحب کے پاؤں تو، مارے خوشی کے زمین پر نہیں ٹک رہے تھے۔ سب یمنی رحمٰن کے حسن کو دیکھ کر مبہوت رہ گئے تھے۔ ہر ایک کی زبان پر اس کی خوبصورتی کا ذکر تھا۔ سب ان دونوں کو چاند سورج کی جوڑی سے تشبیہ دے رہے تھے۔

"احمر پیلس......" میں ہونے والے اس شاندار استقبال نے یمنی رحمٰن کا مزاج مزید ساتویں آسمان پر پہنچا دیا تھا۔ دل ہی دل میں، وہ عون احمر جعفری کو اپنے حسن سے شکست دینے کا سوچ کر۔ مسرور ہو رہی تھی۔ آنے والی ساعتوں کے بارے میں سوچ کر اس کا دل اتھل پتھل ہو رہا تھا۔ چہرے پر ان گنت رنگ بکھر رہے تھے لرزتی پلکیں اس کے اندر کا حال بخوبی عیاں کر رہی تھیں۔ "احمر پیلس" میں بے شمار، رسومات کی ادائیگی نے اسے بری طرح تھکا ڈالا تھا۔ عون احمر جعفری کے سراپے کو محض تصور میں لا کر ہی اس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ ٹک ٹک سیکنڈز گراتی گھڑی اس کے دل کی دھڑکنوں پر چل رہی تھی۔ ایک ایک لمحہ انتظار بنا ہوا تھا، مگر...... ساڑھے گیارہ سے بارہ۔ اور دو سے ڈھائی بج گئے تھے۔ جب بھی وہ بیڈ روم میں نہیں آیا تھا۔

مسلسل بیٹھے بیٹھے یمنی رحمٰن کی کمر تختہ بن چکی تھی۔ کسی کو اس کا احساس نہیں تھا۔ شب کے ڈھائی بجے عون کی کسی کزن نے آ کر اطلاع دی تھی کہ عون کے ایک قریبی دوست کی اچانک طبیعت خراب ہو جانے کے باعث، عون ابھی تک ہسپتال سے گھر نہیں آیا ہے، وہ اس سے معذرت کر رہی تھی۔ اور ادھر یمنی رحمٰن کی دھڑکنیں جو دروازہ کھلنے کی آہٹ پر، بری طرح منتشر ہو گئی تھیں۔ ایک دم سے تھم گئیں۔ آنکھوں میں بے ساختہ ساون امڈ آیا تھا۔

"پذیرائی" کے حوالے سے کوئی خاص امید اسے بھی نہیں تھی۔ مگر اتنی تذلیل، اس

قدر اہانت کہ لمحوں میں ہی اس کے رخسار جیسے تپ اٹھے تھے۔

وہ رونا نہیں چاہتی تھی۔ مگر بلک بلک کر رو پڑی تھی۔

عین اسی پل شب کے تقریباً ساڑھے تین بجے۔ عون احمر جعفری نے اپنے کمرے میں قدم رکھا تھا۔ بظاہر خوب ٹک سک سا تیار ہوا۔ وہ خوبرو مرد، اس وقت بہت نڈھال دکھائی دے رہا تھا۔

یمنی رحمٰن اسے دیکھ کر اپنی جذباتی فطرت پر قابو نہیں رکھ سکی تھی۔ تبھی اسے صوفے پر سکون سے بیٹھتے ہوئے دیکھ کر۔ وہ بنا اپنی پوزیشن کا لحاظ کیے، بھاری بھرکم لباس سنبھالتی۔ اگلے ہی پل اس کے عین مقابل جا کھڑی ہوئی تھی۔

"کہاں تھے آپ اب تک؟"

بھرپور استحقاق کے ساتھ قطعی درشت لہجے میں اس نے پوچھا تھا۔ وہ ایک اچٹتی سی نگاہ، اس کے شاندار سراپے پر ڈالتے ہوئے آہستگی سے پلکیں موند کر بولا۔

"میں اپنے کسی عمل کے لیے تمہارے سامنے جواب دہ نہیں ہوں۔"

"کیوں نہیں ہیں؟ میں بیوی ہوں آپ کی، میرے حقوق کی پاسداری آپ کا فرض ہے۔"

"شٹ اپ...... کس حق کی بات کر رہی ہو تم؟ بولو...... کیا میں نے وارن نہیں کیا تھا کہ میں، تمہیں اپنی ذات سے کچھ نہیں دے سکوں گا۔ پھر کس منہ سے حق کی بات کر رہی ہو تم؟" اس کے ہٹیلے انداز پر، لمحوں میں جیسے وہ سلگ اٹھا تھا۔

دانیہ خان کی اچانک طبیعت خراب ہو گئی تھی......

وہ بدحواسی کے عالم میں سارے فنکشنز کو چھوڑ کر...... ہسپتال بھاگا تھا۔ پچھلے تین چار گھنٹوں سے، وہ اس کے پاس ہی تھا۔ اس وقت اسے کسی کی کوئی پروا نہیں تھی۔ رضا احمر جعفری صاحب کے بھرپور اصرار اور سختی کے باوجود وہ اسے خطرے سے باہر پا کر الگ روم میں منتقل کروانے کے بعد ہی گھر واپس لوٹا تھا۔

اسے اپنی ضد میں اٹل پا کر، وہ نرم پڑی۔ تبھی لہجے میں ترشی کی بجائے عاجزی سمٹ آئی تھی۔ جواب میں وہ فوراً اس کے سامنے سے اٹھتے ہوئے بے نیازی سے بولا۔

"آئی ڈونٹ کیئر، مجھے اس قصے سے دلچسپی نہیں ہے۔ اور ویسے بھی۔ میں بہت زیادہ تھک چکا ہوں لہٰذا پلیز، مجھے مزید ڈسٹرب مت کرو۔"

سنگدلی سے کہنے کے ساتھ وہ وارڈ روب سے اپنے کپڑے نکال کر، واش روم میں گھس گیا، تو یمنی رحمٰن بھی ایک دم سے جیسے ہوش کی دنیا میں واپس آ گئی۔ سارا جسم، جیسے

لمحوں میں تھکن کا شکار ہو چکا تھا۔ قدم گھسیٹتی وہ آئینے کے سامنے کھڑی ہوگئی، قدرت نے اسے حسن کی دولت سے مالا مال کیا تھا۔ مگر آج اس کا سارا حسن بے کار گیا تھا۔

''نہیں ...... یمنی رحمٰن نے زندگی میں کبھی ہارنا نہیں سیکھا عون، تمہیں اگر میں نے اپنا سب کچھ قربان کر کے حاصل کرلیا ہے۔ تو اب تمہارے دل تک رسائی بھی حاصل کر کے رہوں گی میں، خواہ اس کے لیے مجھے اپنی زندگی کو ہی داؤ پر کیوں نہ لگانا پڑے۔ میں تم سے ہار نہیں مانوں گی عون۔ نہیں روؤں گی میں اب۔''

بے دردی سے آنسو رگڑ کر، وہ آئینے کے سامنے سے ہٹ گئی تھی۔

☆......☆......☆

اگلے روز ہی صبح رحمٰن صاحب اور میران شاہ اس سے ملنے چلے آئے تھے۔ یمنی انہیں دیکھ کر بے تابی سے رحمٰن صاحب کے کشادہ سینے میں جا چھپی تھی۔

''آئی مس یو پاپا۔'' رحمٰن صاحب اس کی دیوانگی پر...... بے بسی سے مسکرائے تھے۔

''مس یو ٹو بیٹے! کیسی ہیں آپ؟'' پدرانہ شفقت سے مغلوب ہو کر انہوں نے اس کی پیشانی کا بوسہ لیا تھا۔

''ٹھیک ہوں پاپا! آپ کیسے ہیں اور مانی تم کیسے ہو؟''

رحمٰن صاحب سے فوراً نظریں چراتے ہوئے وہ میران شاہ کی طرف متوجہ ہوئی جو اپنی اداس نگاہوں سے اس کی طرف ہی دیکھ رہا تھا۔

''تمہیں کیسا لگ رہا ہوں؟'' کسی قدر بجھے ہوئے لہجے میں اس نے پوچھا تھا۔ جواب میں وہ ایک مرتبہ پھر نگاہیں چرانے پر مجبور ہوگئی تھی۔ تاہم اس سے پہلے کہ وہ اس سے مزید کوئی سوال کرتی، آسمانی کرتا شلوار میں ملبوس نکھرا نکھرا سا عون احمر جعفری اپنے بیڈروم سے نکل کر ان سے ملنے چلا آیا۔

''کیسے ہو عون بیٹا!''

بھرپور محبت کے ساتھ اسے بانہوں میں بھر کر انہوں نے پوچھا۔ وہ رسمی سی مسکراہٹ لبوں پر پھیلاتے ہوئے بولا۔

''فائن انکل! آپ کیسے ہیں؟''

''ٹھیک ہوں بیٹے! لیکن یمنی کے بغیر پورا گھر جیسے سونا سونا دکھائی دے رہا تھا تو صبح ہی صبح ہم دونوں ملنے چلے آئے۔ اصل میں اسے کبھی نظروں سے دور کیا نہیں ہے نا، خیر اب تو اپنے جگر کا ٹکڑا تمہارے سپرد کر ہی چکا ہوں، کہنے کی ضرورت تو نہیں ہے مگر پھر بھی اس کا بہت خیال رکھنا عون! پلیز......''

یمنی نے آج دوسری مرتبہ اپنے پاپا کی پلکیں بھیگی ہوئی دیکھی تھیں۔ کیا سوچا تھا انہوں نے مگر کیا ہو کر رہ گیا تھا ان کے ساتھ وہ جسے انہوں نے کبھی ایک پل کے لیے خود سے الگ کرنے کا نہیں سوچا تھا، آج ان کی وہی اکلوتی لخت جگر ایک ہی شہر میں ہوتے ہوئے بھی ان سے فاصلے پر تھی۔

''رحمٰن...... کم آن یار! یمنی اب میری بیٹی ہے اور تم دیکھنا، میں اپنی بیٹی کا خیال تم سے زیادہ رکھوں گا۔ یہ یہاں اتنی خوشیاں پائے گی کہ تمہارا گھر اسے کبھی بھولے سے بھی یاد نہیں آئے گا۔'' رضا احمر نے اپنا بازو ان کے شانوں کے گرد پھیلاتے ہوئے اطمینان سے کہا تو ان کے لبوں نے بے ساختہ ''آمین'' کہا۔

''پاپا...... مجھے اس وقت ذرا اسپتال تک جانا ہے۔ آپ تو جانتے ہیں کل میرے ایک عزیز دوست کی طبیعت خراب تھی۔ لہٰذا ابھی میں اس کی عیادت کرنے جا رہا ہوں۔ ہسپتال سے واپس آ کر آپ لوگوں کو جوائن کروں گا۔ اوکے، بائے۔'' مروت، لحاظ رکھے بغیر دوٹوک لہجے میں کہتا، وہ تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا گھر سے باہر نکل گیا تھا۔ عین اسی پل رحمٰن صاحب اور میران شاہ کی نگاہیں ایک ساتھ یمنی رحمٰن کے چہرے کی طرف اٹھی تھیں۔ جواب میں اس نے ذرا سا گڑبڑاتے ہوئے فوراً نگاہیں جھکا لیں۔

وہ پورا دن یمنی کی فرمائش پر رحمٰن صاحب اور میران شاہ نے ''احمر پیلس'' میں اس کے ساتھ ہی بتایا تھا اور اس دوران انہوں نے ہر ممکن طریقے سے عون کی فرمانبرداری اور اسے خوش رکھنے کی ہزار نصیحتیں اس کے پلو سے باندھ دی تھیں۔

عون کی واپسی کے انتظار میں شام ڈھلے وہ لوگ واپس چلے گئے۔

☆......☆......☆

ادھوری باتیں ہی زندگی ہیں
وہ گزری باتیں ہی زندگی ہیں
اگرچہ دل کی اداس اجڑی ہوئی رتوں میں بکھر گئی ہیں
کئی زمانوں سے ساری باتیں
سلگتی شاموں کے جلتے بجھتے الاؤ میں ہی پگھل گئی ہیں
ادھوری باتیں، ضروری باتیں

عون احمر جعفری سے اس کی شادی کو یہ دوسرا ہفتہ تھا اور اس دوسرے ہفتے میں اس نے ہر ممکن طریقے سے اسے اپنی طرف راغب کرنے کی کوشش کی تھی۔ ہر طریقے سے خود کو بنا سنوار کر دیکھ لیا تھا مگر وہ ایسا پتھر کا بت ثابت ہوا تھا کہ سرسری سی ایک غیر اتفاقی نگاہ بھی

اس پر ڈالنا گوارا نہیں کرتا تھا۔ رات کو دیر سے آنا اور صبح ناشتا کیے بغیر گھر سے نکل جانا اس نے اپنا روز کا معمول بنالیا تھا۔ اپنی اپنی جگہ جیسے دونوں ہی ہار ماننے کو تیار نہیں تھے۔

یمنی رحمٰن کو اس کی بے حسی نے خاصا ہرٹ کیا تھا مگر وہ چہرے پر ''خوش ہوں'' کا لیبل چپکا کر سارے آنسو اندر ہی اندر گراتی رہی، زبردستی خوش نظر آنے کی کوشش میں اب جیسے وہ خود بے زار ہوگئی تھی۔ رضا احمر جعفری، رحمٰن صاحب اور میران کی خوشی کے لیے اس نے اپنے آپ کو ''صبر وضبط'' کا چلتا پھرتا اشتہار بنالیا تھا۔ وہ ان لوگوں میں سے تھی جو ٹوٹ جاتے ہیں مگر کبھی جھکنا گوارا نہیں کرتے۔

وہ بھی میران کے سامنے شکستگی کا بوجھ اٹھانا نہیں چاہتی تھی، لہٰذا جب بھی ''رحمٰن کاٹیج'' کا چکر لگاتی، بات بے بات مسکراتی رہتی تھی۔

اس روز وہ دن ڈھلے میران شاہ کے ساتھ واپس ''احمر پیلس'' آئی تو ایک نیا شاک اس کا منتظر تھا۔ میران شاہ اس کے ہزار اصرار کے باوجود اسے گھر سے باہر ہی اتار کر واپس پلٹ چکا تھا، لہٰذا وہ تھکے تھکے قدم اٹھاتی طویل راہداری عبور کرکے وسیع ہال میں داخل ہوئی تو سامنے ہی صوفے پر رضا احمر اور عون کو بحث کرتے دیکھ کر ٹھٹک گئی۔

''تم اپنی حد سے بڑھ رہے ہو عون! مت بھولا کہ میں تمہارا باپ ہوں۔ یمنی بیٹی کے ساتھ جو سلوک تم کر رہے ہو، میں اس سے ہرگز غافل نہیں ہوں۔''

رضا احمر کو اتنے شدید غصے میں دیکھنے کا اتفاق اسے پہلی مرتبہ ہو رہا تھا۔ تب ہی اسے عون کو بلند آواز سنائی دی تھی۔

''سو واٹ پاپا!..... میری زندگی پر میرا اپنا کوئی اختیار ہے کہ نہیں۔ میں جس لڑکی کو ایک نظر دیکھنا بھی پسند نہیں کرتا، آپ نے بلاوجہ ضد کرکے اسے میری زندگی کا حصہ بنا دیا۔ اب آپ مزید مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟ میں اپنی مرضی سے سانس بھی نہ لوں، یونہی گھٹ گھٹ کر مرجاؤں۔''

اس سے زیادہ اہانت کیا ہوسکتی تھی اس کے لیے، یکدم ہی دل جیسے بوجھل ہو کر رہ گیا تھا۔

''یمنی! میں کس چیز کی کمی ہے عون! خوبصورت ہے، پڑھی لکھی باشعور لڑکی ہے، ویل آف فیملی سے تعلق رکھتی ہے اور کیا چاہیے تمہیں؟'' رضا احمر جعفری..... بھی اس کے جواب سے جیسے ہرٹ ہوئے تھے۔

''میں اسے پسند نہیں کرتا پاپا! اور اس ناپسندیدگی کی میرے پاس کوئی خاص وجہ نہیں ہے۔''

وہ مرد ہو کر بھی اپنے دل کی حکایت اپنے باپ پر نہیں کھول پا رہا تھا اور ادھر اس نے ایک عورت ہو کر اپنا وقار اپنے باپ کی نظروں میں گرا ڈالا تھا۔

''او کے لیکن اس کے باوجود میں تمہیں اکیلے باہر نہیں بھیج سکتا۔'' اب کے رضا صاحب کے جملے نے ساکت کھڑی یمنی رحمٰن کو چونکا دیا تھا۔

''میں وہاں اسٹڈی کے سلسلے میں جا رہا ہوں پاپا! ہنی مون منانے نہیں جا رہا جو اس دم چھلے کو ساتھ رکھوں۔'' رضا جعفری کے اٹل لہجے کے جواب میں اس نے صدائے احتجاج بلند کی تھی۔ جب وہ سختی سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولے۔

''میں یمنی کے لیے ایسے الفاظ پسند نہیں کرتا عون! مت بھولو کہ وہ میرے انتہائی قریبی دوست کی بیٹی ہونے کے ساتھ ساتھ میری بہو بھی ہے۔ لہٰذا یورپ جانے کی اجازت اب تمہیں محض اس صورت میں مل سکتی ہے کہ تم اسے بھی ساتھ لے کر جاؤ۔ بصورت دیگر کہیں جانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔''

قطعی دوٹوک لہجے میں اپنی بات کہنے کے بعد وہ وہاں رکے نہیں تھے جب کہ عون احمر جعفری شدید بے بسی کے عالم میں قریبی صوفے کو ٹھوکر مار کر رہ گیا تھا۔

☆......☆......☆

زندگی کے اس موڑ پر یمنی رحمٰن نے ایک اور امتحان کا سامنا کیا تھا۔ ایک طرف اگر عون احمر جعفری تھا۔ تو دوسری طرف اس کے پاپا رحمٰن صاحب اور میران شاہ تھے۔ اگر وہ عون احمر جعفری کے ساتھ یورپ جانے سے انکار کر دیتی تو یہ جان بوجھ کر سب کچھ اپنے ہاتھوں گنوا دینے والا معاملہ ہوتا کیونکہ وہ اچھی طرح جان گئی تھی کہ عون اسٹیٹس کیوں جانا چاہ رہا ہے۔

دوسری طرف اگر وہ اس کی ساتھ چلی جاتی تو پھر اپنے نہایت مشفق پاپا اور بے حد مہربان دوست میران شاہ کو دیکھنے کے لیے ترس جاتی۔ وہ الجھ کر رہ گئی تھی۔ کتنے ہی دنوں تک وہ اللہ سے دعا مانگتی رہی تھی کہ عون احمر جعفری اپنے اسٹیٹس جانے کا ارادہ ترک کر دے مگر اس کی دعائیں مستجاب نہیں ہوئی تھیں۔ دل کے ہزار نہ چاہنے کے باوجود صرف عون احمر جعفری کے دل تک رسائی پانے کی لگن میں اسے اس کی ناپسندیدگی کے باوجود اپنوں کو چھوڑ کر اس کے ساتھ شکاگو آنے کی تیاری کرنا پڑی تھی۔

وقت رخصت جب وہ ''رحمٰن کاٹیج'' سے نکل رہی تھی تو جانے کس احساس سے مغلوب ہو کر میران شاہ نے اس کے آنچل کا کونا تھام لیا تھا۔ ضبط گریہ سے سرخ آنکھیں آج باقاعدہ آنسو لٹا رہی تھیں۔

''میران شاہ کے گھر سے تو دور چلی گئی ہو یمنی! اب اس کا شہر چھوڑ کر تو مت جاؤ۔ پلیز۔''

ضبط کے سارے بند جیسے ٹوٹ گئے تھے۔ رحمٰن صاحب کا حال بھی دیکھنے لائق تھا، مگر اس نے ان جذباتی لمحوں میں خود کو کمزور پڑنے نہیں دیا، تب ہی دل کو مضبوط کرتے ہوئے بولی۔

''میں مجبور ہوں مانی! کہ یہاں رکنے کا کوئی اختیار اب میرے پاس نہیں ہے۔''

''اختیار تھا بھی تو تم کب رک گئی تھیں۔''

جواب میں یمنی رحمٰن کی ساری ہمتیں بھی جیسے ریت کی بھربھری دیوار کی مانند ڈھے گئیں۔

''مجھے معاف کر دو مانی! پلیز......'' اس کے سامنے زمین پر گھٹنے ٹیک کر بیٹھتی ہوئی وہ دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر رو پڑی تو نڈھال سے میران شاہ نے التجا کی۔

''یمنی...... پلیز ایسے مت روؤ...... تم جانتی ہو نا کہ میران شاہ کو تمہارے آنسو کتنی تکلیف دیتے ہیں۔'' دو زانو ہو کر اس کے مقابل بیٹھتے ہوئے وہ جیسے گڑگڑایا تھا۔ جواب میں یمنی نے فوراً اپنی آنکھیں رگڑ ڈالیں۔

کتنے ظرف کا حامل شخص تھا وہ مگر غلط دل سے لو لگا بیٹھا تھا۔ تب ہی تو ہر قدم پر ضبط کے کڑے مراحل سے گزرنا پڑ رہا تھا اسے۔

''او کے...... میں اب نہیں روؤں گی مگر پاکستان واپسی پر مجھے تم کمزور یا دکھی ملے تو میں تمہارا یہ قصور کبھی معاف نہیں کروں گی۔''

دونوں طرف برسات ہو رہی تھی اور اس برسات میں بھیگتے ان کے دل ایک دوسرے سے عہد لے رہے تھے۔

شکاگو میں ایک دردناک اور روکھی زندگی بانہیں پھیلائے جیسے اس کی منتظر کھڑی تھی۔

عون احمر جعفری کا دل اپنی ''محبت'' سے جیتنے کی ضد میں وہ سرتاپا بدل کر رہ گئی تھی مگر دانیہ خان کی محبت میں مدہوش وہ اپنی عادتوں میں ایک انچ بھی فرق نہیں کر پایا تھا۔ ایک اچھی بیوی ہونے کا ہر فرض وہ بخوبی نبھا رہی تھی مگر اس کے باوجود وہ اس کی ''بیوی'' نہیں بن سکی تھی۔ شادی کی پہلی رات سے لے کر اب تک عون احمر جعفری نے اس سے خود کو ایسے دور رکھا تھا جیسے وہ کوئی اچھوت ہو۔

پاکستان میں اسے جو عون احمر جعفری کے ساتھ ایک کمرے میں رہنے کا شاندار اعزاز حاصل تھا، یہاں آ کر وہ اعزاز بھی اس سے چھن چکا تھا۔ عون احمر جعفری نے اسے اپنے دل کے ساتھ ساتھ اپنے کمرے اور آنکھوں سے بھی دور کر دیا تھا۔ پورا دن وہ مختلف کاموں میں جتی رہتی اور رات میں بستر پر جیسے کانٹے اگ آتے تھے۔ صبر و ضبط کے کڑے مراحل سے گزرتے گزرتے وہ اب جیسے تھکنے لگتی تھی۔

عون کی نظروں کے حصار میں رہنے کے لیے اس نے اپنا سراپا ہی بدل ڈالا تھا۔ لمبے گھنے بالوں کو کٹوا کر شولڈر تک لے آئی تھی۔ مشرقی سوٹ کی جگہ اب اس نے زیادہ تر ٹراؤزر، جینز اور سیلولیس شرٹس کو زیب تن کرنا شروع کر دیا تھا۔

فقط تھوڑے ہی عرصے میں وہ ایک مشرقی دوشیزہ سے مغربی حسینہ کے روپ میں ڈھل گئی تھی، مگر عون احمر جعفری نجانے کس مٹی سے بنا تھا کہ اس کا دل اب بھی یمنی رحمٰن کی طرف راغب نہیں ہوا تھا۔ گزرتے ہر دن کے ساتھ ان کے رشتے میں وہی فاصلہ، وہی سرد مہری اور وہی اجنبیت قائم تھی جو کہ پہلے روز ان کے درمیان حائل ہو گئی تھی۔ دانیہ کے شکاگو آنے کے بعد تو اس کے رویے میں اور اجنبیت آ گئی تھی۔

ایسا نہیں تھا کہ عون کو یمنی رحمٰن کے ساتھ اپنائے گئے اپنے سنگ دلانہ رویے کا احساس نہیں تھا یا اسے تکلیف دے کر وہ خوشی محسوس کرتا تھا۔ ظلم ڈھانے کا وہ ہرگز شوقین نہیں تھا مگر پھر بھی وہ یمنی کے ساتھ ایسا سلوک کرنے پر مجبور تھا۔ جب بھی یمنی کی طرف اس کی نگاہ اٹھتی تھی، بے ساختہ وہ لمحات اسے یاد آ جاتے تھے کہ جب وہ زبردستی اس کی زندگی کا حصہ بننے کے لیے بضد ہو گئی تھی۔

انسانی فطرت ہے کہ جو چیز زبردستی جھولی میں آ گرے، قابل توجہ نہیں لگتی۔ یمنی رحمٰن بھی اس کی جھولی میں پکے ہوئے پھل کی مانند زبردستی آ گری تھی۔ لہٰذا اسے اس کی شخصیت سے ایک عجیب قسم کی چڑ ہو گئی تھی۔ جب بھی وہ اس کے سامنے آتی تھی، اس کے اعصاب تن جاتے تھے۔ ایک بھاری بوجھ کی مانند وہ اسے اپنی روح پر مسلط محسوس ہوتی تھی۔ اس کا ہوش ربا حسن، سلیقہ، وفا شعاری، دیوانگی، سب ناپسندیدگی کی بھینٹ چڑھ کر رہ گیا تھا۔ دل ہی دل میں، وہ بہت کوشش کرتا تھا کہ اگر اسے محبت کے جواب میں محبت نہیں دے سکتا تو نفرت بھی نہ دے مگر چاہ کر بھی ایسا کرنا اس کے اختیار میں نہیں رہا تھا۔ بے باک، بولڈ لڑکیوں سے وہ ہمیشہ خار کھاتا تھا اور اس کی سب سے بڑی وجہ اس کی اپنی ماں کا کردار تھا۔ بچپن ہی میں اپنی ماں کی حد سے زیادہ بولڈنیس اور آزاد روش نے اسے شدید حساس بنا دیا تھا۔ پھر کچھ عرصے بعد جب وہ اس کے پاپا سے ڈائیورس لے کر اپنے بچے کی پروا کیے بغیر چلی گئیں تو اسے ایسی عورتوں کے تصور سے بھی گھن آنے لگی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے زندگی میں کبھی اپنی ماں کو یاد نہیں کیا تھا۔ باہر کے آزاد ماحول میں رہ کر بھی اس نے اپنا

دامن صاف رکھا تھا۔ دانیہ خان کی ذات سے اس کی بے تحاشا محبت کی وجہ اس کی سادگی اور مضبوط کردار ہی تھا۔ ان دونوں کو ایک دوسرے کے علاوہ کسی تیسرے فرد سے قطعی کوئی دلچسپی نہیں تھی جب کہ یمنیٰ رحمٰن نے تو کچھ ہی عرصے میں اپنے آپ کھول کر اس کے سامنے رکھ دیا تھا۔ اپنے کزن کے سامنے انگیج ہونے کے باوجود وہ اسے پانے کے لیے ہر حد سے گزر گئی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اپنے دل میں تا حال اسے کوئی باعزت مقام دینے پر خود کو تیار نہیں کر پا رہا تھا۔

سفر آسان لگتا تھا
دل برباد تجھ کو یہ سفر آسان لگتا تھا
ادھر تو سوچتا تھا اور ادھر
آنکھوں سے کوئی خواب چہرہ آن لگتا تھا
دل برباد ہم نے تو کہا تھا
یہ سفر آسان لگتا ہے
مگر......
آنکھیں بدن سے چھین لیتا ہے

اس وقت بھی وہ اس پر سرسری سی نگاہ ڈال کر آگے بڑھ جانا چاہتا تھا کہ وہ اس کے قدموں کی آہٹ پر فوراً بے دار ہو کر اس کی طرف لپک آئی۔

''آج پھر آپ لیٹ ہوگئے عون! میں نے کتنی محنت سے آپ کے لیے پاستا بنایا تھا۔''

خالص بیویوں والے انداز میں اس کی بے نیازیوں سے قطع نظر وہ کتنے مان سے گلہ کر رہی تھی مگر عون کا دل چونکہ دانیہ خان کی وجہ سے پریشان تھا، لہٰذا وہ اپنے قدم آگے بڑھاتا لاپروائی سے بولا۔

''کتنی بار کہوں تم سے کہ مت انتظار کیا کرو میرا، مت بنایا کرو کوئی چیز میرے لیے مگر تم نجانے کب سمجھوگی۔''

''میں آپ کی بیوی ہوں عون!''

اس کے بیڈ روم کی طرف اٹھتے قدموں کو دھندلائی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے قدرے گھٹے گھٹے انداز میں اس نے کہا تھا۔ جب وہ فوراً پلٹ کر ایک استہزائیہ نظر اس کے بکھرے سراپے پر ڈالتے ہوئے حیرانی سے بولا۔

''تمہیں...... اب بھی یہ گمان ہے کہ تم میری بیوی ہو؟''

''کتنی گہری چوٹ کی تھی اس نے کہ وہ بلبلا کر رہ گئی تھی۔ پچھلے تین سال سے جو

''کردار'' وہ نبھا رہی تھی، اس کے جواب میں جو ''حق'' اسے مل رہا تھا، وہ ایک بیوی کا تو ہرگز نہیں تھا۔ عون احمر جعفری کے عشق میں وہ دیوانگی کی حدوں سے نکل کر جنونیت کے دائرے میں داخل ہوگئی تھی۔ اپنا آپ مٹا کر اس پر قربان ہوگئی تھی۔ ''میں'' سے نکل کر ''تم'' ہوگئی تھی۔ وہ جو اپنے لیے چائے بھی ملازمین سے بنوا کر پیتی تھی، پچھلے تین سال سے خود کسی ملازمہ کی طرح اس کے آگے پیچھے پھر رہی تھی، صرف اس کی محبت اور دل کے حصول کے لیے کیا سے کیا ہو کر رہ گئی تھی وہ مگر پھر بھی عون نے اسے اس کے ''حق'' سے نہیں نوازا تھا۔ اس کے دل و دماغ پر تا حال دانیہ خان کا قبضہ تھا۔ اسی کے ساتھ آفس میں بریک فاسٹ کرنا، دوپہر میں لنچ اور شام میں ڈنر کرنا دل کی ہر بات، ہر مسئلہ اسی کے ساتھ شیئر کرنا، اسی کی تعریف میں رطب اللسان رہنا، اسی کے لیے شاپنگ کرنا۔ غرضیکہ اس کی شب و روز کی ہر مصروفیت کا محور دانیہ خان کی ذات بن کر رہ گئی تھی۔

پچھلے تین سال میں اس نے ایک مرتبہ بھی یہ جاننے کی کوشش نہیں کی تھی کہ جس عورت نے اس کے لیے اپنا سب کچھ قربان کر دیا ہے، اس کی اب کیا فیلنگز ہیں۔ وہ کیا سوچتی ہے؟ کیا چاہتی ہے؟ اسے کس چیز کی ضرورت ہے؟ وہ ٹائم پر کھانا بھی کھاتی ہے یا نہیں؟ اسے سکون سے نیند بھی آتی ہے یا نہیں؟ کبھی کچھ جاننے کی کوشش نہیں کی تھی اس نے۔

آسان لفظوں میں اس نے جیسے ''قید تنہائی'' دے رکھی تھی۔

ہر روز معمول کی مانند، صبح سویرے جاگ کر واش روم میں عون کے پریس شدہ کپڑے رکھنا، اس کے بوٹ پالش کر کے رکھنا، اس کا بریف کیس تیار کرنا، پرفیوم، ٹائی، برش، سنگھار میز پر نکال کر رکھنا، مختلف مریضوں کی پیچیدہ بیماریوں سے متعلق ضروری رپورٹس اور فائلز سنبھال کر رکھنا۔ ہر روز ہی اس کا بنا ناشتا کیے گھر سے نکل جانا، لنچ پر اور ڈنر کے لیے بھی اس کا لاحاصل انتظار کرنا۔ گو لمحہ بہ لمحہ اسے تھکا رہا تھا۔ اندر سے دیمک کی مانند کھاتے ہوئے کھوکھلا کر رہا تھا۔ مگر وہ بنا آنسو بہائے پوری تندہی کے ساتھ اپنے فرائض کی بجا آوری میں مصروف تھی۔

میران شاہ اور رحمٰن صاحب پچھلے دو سال سے پاکستان چھوڑ کر دوحہ جا بسے تھے۔ عون احمر جعفری شکاگو آ کر اپنی مصروفیات میں اس قدر گم ہو کر رہ گیا تھا کہ اسے پیچھے رہ جانے والوں کی کوئی فکر ہی نہیں رہی تھی مگر وہ اندر ہی اندر کڑھ رہی تھی، ختم ہو رہی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ دنیا میں پیار سے بڑھ کر کچھ نہیں ہوتا، محبت میں وہ طاقت ہے کہ بڑے سے بڑا سورما بھی پگھل کر موم ہو جائے مگر عون احمر جعفری اس کے بے تحاشا پیار پر بھی موم نہیں ہوا تھا۔

''آج میں آپ سے کچھ بات کرنا چاہتی ہوں عون!''

ہمیشہ کی طرح اپنی عزت نفس کو کچل کر آنسوؤں کے گولے کو حلق میں اتڈیلتے ہوئے وہ اس کے پیچھے ہی روم میں چلی آئی تھی۔ جواب میں وارڈ روب کی طرف بڑھتے عون نے پیچھے پلٹ کر قدرے حیرانی سے اس کی طرف دیکھا۔

''ہم پاکستان کب واپس چلیں گے؟''

عون کی خاموشی استفہامیہ نگاہوں کے جواب میں اس نے جواب تھا۔ جب وہ پھر سے اپنے کام میں مشغول ہو گیا۔

''آئی ڈونٹ نو۔ دانیہ کی خواہش ہے کہ اس سے شادی کے بعد میں یہیں سیٹل ہو جاؤں۔ ہاں البتہ تم پاکستان جانا چاہتی ہو تو میں تمہیں بھجوا دیتا ہوں۔''

اس کے دل کو زخم زخم کر کے وہ کس قدر اطمینان کا مظاہرہ کر رہا تھا، تب ہی وہ آگے بڑھ آئی۔

''آپ...... میرے ساتھ پاکستان واپس چلیں گے، کبھی کوئی دانیہ نہین آئے گی ہمارے بیچ۔ سنا آپ نے؟'' اب کے اس کے لہجے میں کرختگی پر وہ واقعی شاکڈ رہ گیا تھا۔ تب ہی تو گردن گھما کر کس قدر حیرانی سے اس کے چہرے کی طرف دیکھا، جہاں اب گلابیوں کی جگہ زردیاں بکھر کر رہ گئی تھیں۔

''کس مٹی کے بنے ہیں آپ...... کہ آپ پر میرے آنسو، میرا صبر، میری وفا، کچھ بھی اثر نہیں کر رہا؟ مانا کہ میں نے غلط قدم اٹھایا ہے، اپنی ہی منہ زور خواہشات کے ریلے میں بہہ کر اپنے اصل سے بھٹک گئی ہوں میں لیکن اس کی اتنی کڑی سزا تو نہیں دیں عون! صرف ایک آپ کی محبت پانے کے لیے میں کیا سے کیا ہو کر رہ گئی ہوں۔ ایک محض آپ کو پانے کی چاہ میں اپنے پیچھے کتنی پر خلوص محبتوں کے دروازے بند کر آئی ہوں میں۔ آپ کا دیا ہوا دکھ اٹھا کر بھی کبھی اف تک نہیں کیا میں نے۔ ہر پل، ہر لمحے آپ کو سوچا۔ آپ کو چاہا ہے عون! آپ کے تصور سے پیار کیا ہے مگر پھر بھی آپ کے لیے قابل توجہ نہ بن سکی۔ کیوں عون......؟ لوگ اپنے گھر میں کسی جانور کو پالیں تو اس سے پیار کرنے لگتے ہیں پھر میں تو ایک انسان ہوں...... اپنی بیوی نہ سہی، ایک انسان سمجھ کر ہی مجھ پر نگاہ ڈال لیجئے اپنے دل میں نہ سہی، اپنے قدموں میں ہی تھوڑی سی جگہ دیجئے۔ پلیز......''

آج اس نے اپنی خودداری، اپنی عزت نفس، اپنا وقار سب اس کے قدموں میں ڈھیر کر دیا تھا۔ عون احمر جعفری کی غلافی آنکھوں میں تا حال حیرانی ہچکولے لے رہی تھی۔

''لگتا ہے تم آج اپنے حواس میں نہیں ہو۔''

اس کے زرد چہرے سے نگاہیں ہٹا کر رخ پھیرتے ہوئے اس نے کہا، جب وہ سرعت

سے اس کے مقابل آ کر بولی۔

''ہاں...... نہیں ہوں میں اپنے حواس میں کیونکہ میرے حواس پچھلے تین سالوں کے دوران سن ہو چکے ہیں عون! تھک گئی ہوں میں تمہارے واپس پلٹنے کا انتظار کرتے کرتے۔ کب سزا ختم کرو گے میری، کب میری طرف آؤ گے عون......'' درد چھلکاتی نگاہیں عجیب پیاسے انداز میں اس کے چہرے پر دوڑاتے ہوئے اس نے عون کا بازو تھاما، جب وہ اسے پرے دھکیلتے ہوئے بولا۔

''اس خوش فہمی میں جینا چھوڑ دو یمنی رحمٰن کہ میں کبھی پلٹ کر تمہاری طرف واپس آؤں گا۔ یہ سزا جو آج تمہاری سانسوں کو الجھا رہی ہے، یہ سزا میں نے تمہیں نہیں دی بلکہ تم نے خود اسے اپنے لیے منتخب کیا ہے۔ خود چنا ہے یہ راستہ تم نے پھر اب روح لہولہان ہو رہی ہے تو گلہ کیسا، مس یمنی رحمٰن...... میں نے تو سب کچھ واضح کر دیا تھا آپ پر۔ کچھ بھی نہیں چھپایا تھا آپ سے مگر پھر بھی آپ نے مجھے پانے کی ضد کی۔ میرے دل کی بجائے جسم کو حاصل کرنا، آخری خواہش بن گیا تھا آپ کی پھر اب مجھے الزام کیوں دے رہی ہیں۔ جب مجھے آپ سے کوئی دلچسپی ہی نہیں تو آپ خواہ میرے لیے کچھ بھی کریں، آئی ڈونٹ کیئر۔ اب پلیز جاؤ یہاں سے، میں آل ریڈی بہت ڈسٹرب ہوں۔''

قطعی روڈ لہجے میں کہنے کے ساتھ ہی وہ وارڈ روب سے اپنے کپڑے نکال کر واش روم میں گھس گیا جب کہ وہ ایک مرتبہ پھر اپنے بکھرے وجود کی کرچیاں سمیٹتی اس کے کمرے سے باہر نکل آئی۔

محبت کب سمجھتی ہے۔
محبت کب سمجھتی ہے کہ کوئی دشت وحشت ہے
جو خوابوں میں بسی آنکھوں کو، جانے کب کہاں جھنجھوڑ ڈالے گا
''محبت کب سمجھتی ہے کہ ان شفاف رستوں سے
کوئی دکھ درد کی جانب اسے نہ موڑ ڈالے گا
محبت کب سمجھتی ہے کہ کوئی توڑ ڈالے گا

بیڈ کی پٹی سے ٹکرانے کے باعث یمنی رحمٰن کی پیشانی بری طرح زخمی ہوئی تھی۔ لمحوں میں اس کا چہرہ خون سے بھیگ چکا تھا۔ مگر اس وقت اسے اپنے دل کی تکلیف اپنے چہرے کی تکلیف سے بڑھ کر محسوس ہو رہی تھی۔ قطعی لٹے پٹے نڈھال سراپے کو بمشکل گھسیٹتی وہ آئینے کے سامنے آ کھڑی ہوئی تھی، جہاں اس کا اپنا ہی عکس آئینے سے نکل کر اس کے سامنے آ کھڑا ہوا تھا۔

میک اپ سے لتھڑا چہرہ ترشی ہوئی بھنویں، لپ لائنر اور لپ اسٹک سے سجے ہونٹ، ترشے ہوئے شولڈر کٹ بال، سیلولیس عریاں بازو، ٹائٹ شرٹ، ٹراؤزر، دوپٹے کی حرمت سے بے نیاز وجود بڑھے ہوئے لمبے ناخنوں پر لگی کیوٹکس۔ یہ یمنی رحمٰن تو نہیں تھی۔ یہ تو کوئی اور لڑکی تھی۔ عشق میں نڈھال کوئی دیوانی لڑکی جس نے محض ایک انسان کی محبت میں اپنا آپ بھلا ڈالا تھا۔

سن اعصاب کے ساتھ آئینے کے سامنے کھڑی وہ ٹکر ٹکر اپنا سراپا دیکھ رہی تھی۔ کپکپاتے ہوئے ہاتھوں کو بے ساختہ چہرے پر پھیرتے ہوئے ہراساں ہو رہی تھی۔ فقط چند ہی سالوں میں کیا سے کیا ہو کر رہ گئی تھی۔ وہ......؟ ایک دم ہی اسے یوں محسوس ہوا، گویا آئینے سے اس کا عکس نکل کر اس پر ہنس رہا ہو۔ اس سے پوچھ رہا ہو۔

''اب کہو یمنی رحمٰن...... یکطرفہ محبت کے اس جنونی کھیل میں تم نے کیا پایا......؟''

اور جواب میں وہ اپنے سراپے کو دیکھتی رہ گئی تھی۔

کس قدر نا آشنا تھی وہ محبت کے حقیقی مفہوم سے۔ قطعی مدہوشی کے عالم میں صرف ایک سراب کے پیچھے اندھا دھند بھاگتی رہی، صرف ایک بار ملنے والی زندگی کے انمول دن ضائع کرتی رہی۔ محض اپنی خواہش، اپنی ضد، اپنے جنون سے اس دل میں زبردستی گھسنے کی کوشش کرتی رہی کہ جہاں پہلے ہی کسی اور کا قیام تھا۔ زندگی میں اس نے کبھی اپنے کسی معاملے میں کمپرومائز نہیں کیا تھا۔ مگر یہاں زندگی کے اس موڑ پر وہ اپنے دل سے ہار گئی تھی۔ اندھی محبت کی بھینٹ چڑھ کر غلط راہ گزر پر بھٹک گئی تھی۔

محبت تو وہ تھی، جسے وہ سسکتے ہوئے پاکستان میں اپنے پیچھے چھوڑ آئی تھی۔

پیشانی سے خون تیزی سے بہہ رہا تھا۔ مگر وہ دل کے خون پر سسکتے ہوئے بلک رہی تھی۔ پورے کمرے کا سامان اس نے تہس نہس کر دیا تھا۔ اپنی شادی کی تمام تصاویر، مووی، شادی کے ملبوسات، عون احمر جعفری سے جڑا اپنا ہر احساس وہ وہیں کمرے میں آگ کی نذر کر چکی تھی۔

زندگی میں غالباً آخری بار وہ بچوں کی مانند پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔ اپنی شکست کا ماتم منا رہی تھی۔ آج اسے یقین ہو گیا تھا کہ وہ چاہے کچھ بھی کرے، عون احمر جعفری پلٹ کر اس کی طرف نہیں آئے گا۔ اسی احساس کے زیر اثر اس نے ہسٹریکل ہو کر آئینہ پاش پاش کر ڈالا تھا مگر اس کا اپنا ہی عکس برہنہ ہو کر اب بھی اس پر ہنس رہا تھا۔ ہنسی کی اس بازگشت میں اب میران شاہ کے قہقہے بھی شامل ہو گئے تھے تب بے ساختہ اس نے دوپٹے کی تلاش میں اپنی نگاہیں ادھر ادھر دوڑائی تھیں مگر وہاں عون احمر جعفری کے بیڈ روم میں اس کا

آنچل کہیں نہیں تھا۔ زخمی، متوحش نگاہیں، تھک کر ناکام واپس پلٹ آئی تھیں۔

برسوں پہلے اس نے میران شاہ سے کہا تھا۔

''میں اسے کھو کر نہیں جی سکتی مانی! مر جاؤں گی میں اس کے بغیر......''

لیکن آج وہ بظاہر اس کے ساتھ ہو کر بھی اسے ہمیشہ کے لیے کھو چکی تھی اور پھر بھی زندہ تھی۔

روح برہنہ ہو رہی تھی، نازک پاؤں جیسے صدیوں کی مسافت طے کر کے لمحوں میں آبلہ پائی کا درد سمیٹ لائے تھے۔ مدہوشی کا خول جیسے ٹوٹ چکا تھا۔ آنکھوں پر بندھی محبت کی اندھی پٹی اتر چکی تھی۔ اب اسے سب کچھ صاف صاف دکھائی دے رہا تھا۔

آج اسے یہ احساس تڑپا رہا تھا کہ وہ محض ایک انسان کے عشق میں مدہوش ہو کر گمراہ ہو گئی تھی مگر صلے میں اسے سوائے آنسوؤں کے اور کچھ بھی نہیں ملا تھا۔ جتنی شدت سے اس نے عون احمر جعفری کو چاہا تھا، اگر اتنی ہی شدت سے وہ اپنے پاک پروردگار سے محبت کرتی تو کیا وہ اسے ٹھکرا دیتا؟

جس انسان کی رضا اور محبت کے لیے وہ اپنے اصل سے بھٹک گئی تھی جس کے حصول کے لیے اس نے خدا کے احکامات کو یکسر فراموش کر دیا تھا، آج اسی انسان کی محبت میں وہ اوندھے منہ زمین پر آ گری تھی۔ روح کے ساتھ ساتھ سارا جسم تھکن سے چور ہو رہا تھا۔ محبت کے حقیقی مفہوم سے قطعی نا آشنا وہ اندھا دھند جس راستے پر نکل کھڑی ہوئی تھی، اس راستے کی منزل کیا تھی......؟ محض دکھ......؟''

لہولہو احساس اور برہنہ روح کے ساتھ سسکتے ہوئے وہ نیچے زمین پر بیٹھتی چلی گئی۔ اس کا عکس اب بھی اس پر طنز کر رہا تھا۔ اس کے اعصاب میں توڑ پھوڑ مچا رہا تھا۔

''اب کہو یمنی رحمٰن...... اس ''لا حاصل محبت'' کے سودے میں کیا حاصل کیا تم نے؟ عشق کے اس خاردار راستے پر ننگے پاؤں چل کر بھی کیا فتح کر لیا تم نے؟ کیا تم اس حقیقت کو جھٹلا سکتی ہو کہ محبت خدا کی دین ہے، کوئی بھی ذی روح اسے زبردستی اپنی میراث نہیں بنا سکتا۔ حسین سے حسین تر چہرے رل کر رہ جاتے ہیں۔ آنکھوں میں حسن نہ ہو تو چہرے کی خوبصورتی یا دلکش سراپا کیا معنی رکھتا ہے۔ تم نے اپنے حسن اور ضد کی بنا پر عون احمر جعفری کو اپنی طرف مائل کرنا چاہا تھا نا۔ دیکھ لو تم اپنے تکبر میں خود منہ کے بل آ گریں۔ خیر کی بجائے شر کو پا لیا تم نے۔ کبھی خدا کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلائے، اس سے اپنی بھلائی نہیں مانگی۔ اس نے تمہارے لیے خیر لکھا تھا مگر تم خود اس کی قائم کردہ حدود سے نکل کر جلتے ہوئے شعلوں کو ہاتھ میں لے بیٹھیں۔ اپنے نصیب کے لکھے پر صبر نہیں کیا تم نے پھر اب یہ آنسو کیوں یمنی

رحمٰن......؟ اب یہ تھکن کا احساس کیوں......؟''

بکھرے اعصاب اور نڈھال سراپے کے ساتھ وہ زمین پر بیٹھی ہچکیاں لے رہی تھی اور اس کا ضمیر اس سے کہہ رہا تھا۔

''تم اب بھی محض ایک انسان کی محبت پانے کے دکھ میں نڈھال ہو یمنیٰ رحمٰن! کیا تمہیں یہ احساس تکلیف نہیں پہنچا تا کہ جس بزرگ و برتر نے تمہیں اپنے محبوب محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی امت میں پیدا فرمایا کہ تم پر احسان عظیم فرمایا۔ تم برسوں اسی کے وجود سے غافل رہیں۔ کیا اس کے پیدا کردہ ایک عام سے انسان کی محبت تمہیں دنیا و آخرت میں سرخروئی سے ہمکنار کرسکتی ہے؟ کیا اس شخص کا پیار تمہیں قبر کے عذابوں سے نجات دلاسکتا ہے؟ کیا اس کا ساتھ تمہیں پل صراط کی مشکل سے گزار سکتا ہے؟ نہیں یمنیٰ رحمٰن! جس شخص کی چاہ میں تم اپنا آپ بھلا بیٹھی ہو، اس کا پیار، اس کی محبت، اس کا ساتھ تمہارے کسی کام نہیں آسکتا۔ ہر انسان کو اگر کوئی چیز فائدہ پہنچاسکتی ہے تو وہ اللہ اور اس کے پیارے رسول محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبت ہے جو قدم قدم پر روشنی بن کر اسے دنیا و آخرت میں سرخرو کرے گی۔

خدا کی تخلیق کردہ اس دنیا میں، ہزاروں کم صورت انسان، چاہے جانے کی حسرت لیے، ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرجاتے، مگر ایسا نہیں ہے۔ کیونکہ حسن وہ نہیں جو ظاہری طور پر دکھائی دے۔ حقیقی حسن وہ ہے جو اپنے محبوب کے لیے آنکھوں میں چھپ کر رہے۔ عون کی آنکھوں میں بھی دانیہ خان کا حسن ہے یمنیٰ! تم چاہے کچھ بھی کرلو، اسے حسین دکھائی نہیں دے سکتیں۔ محبت تو اللہ کی دین ہے۔ وہ جب جسے چاہے سرخرو کردے۔ اور جسے چاہے بھٹکا کر پستیوں میں گرادے۔''

اپنے ہی ضمیر کی عدالت میں ساکت بیٹھی، وہ گویا ایک عکس کی مانند تحلیل ہو رہی تھی۔

آج ضمیر اسے آئینہ دکھا رہا تھا۔ دل کی گرفت سے چھڑا کر نفع و نقصان کے کٹہرے میں کھڑا کر رہا تھا، زندگی میں آگہی کا دکھ۔ سب سے زیادہ تکلیف دہ ہوتا ہے۔ انسان جب تک بے خبر رہتا ہے، خوش اور مطمئن رہتا ہے۔ مگر جیسے ہی اس پر حقیقتوں کے در وا ہوتے ہیں وہ جیسے ہی اپنے اصل سے آگاہی حاصل کرتا ہے بکھر کر رہ جاتا ہے۔ طبیعت میں اضطراب در آتا ہے۔ اسے رہ رہ کر اپنا ہر عمل تکلیف سے دوچار کرتا ہے۔ یمنیٰ رحمٰن بھی اس وقت اسی تکلیف کے مرحلے سے گزر رہی تھی۔

پچھلے کتنے سالوں سے وہ تڑپ تڑپ کر عون احمر جعفری سے کہہ رہی تھی کہ وہ اس سے محبت کرتی ہے۔ مگر عون احمر جعفری نے اس کی صدا پر کان نہیں دھرے تھے۔ وہ ہر لمحہ اسے

دھتکارتا رہا تھا۔ جب کہ یہ بات وہ اگر اپنے اللہ سے کہتی تو کیا وہ اس کی پکار نہیں سنتا۔؟ اسے دھتکار دیتا۔؟

بات سوچنے کی تھی مگر سوچنے سمجھنے کی صلاحیت تو وہ کھو چکی تھی، بمشکل اپنے نڈھال وجود کو گھسیٹتی واش روم تک چلی آئی ٹھنڈے ٹھنڈے تازہ پانی سے پیشانی کا زخم دھویا، وضو کیا تو ایک عجیب سا درد روح میں اتر آیا، جائے نماز پر نیت باندھ کی کھڑی ہوئی تو جانے کب سے جمع کیے ہوئے آنسو پھر سے رواں ہوگئے تھے۔

وہ بہت چھوٹی سی تھی جب اس کی مما نے اسے نماز سکھائی تھی اب تو اسے نماز ادا کرنے کا صحیح طریقہ بھی یاد نہیں آرہا تھا۔

بہت زیادہ زیاں کرچکی تھی وہ اپنا ایک انسان ایک حقیر انسان جسے محض ''علم'' کی بدولت تمام مخلوقات پر فوقیت کی گئی۔ جب وہ انسان اسی ''علم'' سے لاعلم ہو تو کیسی برتری' کیسی بڑائی ؟ اس وقت یمنیٰ رحمٰن کو اپنا وجود بھی گندگی میں لتھڑا ہوا دکھائی دے رہا تھا زندگی میں اس نے کبھی سوچا ہی نہیں تھا، کہ فیشن کرتے ہوئے ٹی وی سے دل بہلاتے ہوئے، میوزک سے لطف اندوز ہوتے ہوئے وہ اپنے اللہ سے، اس کے احکامات سے کتنی دور ہورہی ہے؟

کسی بھی انسان سے محبت، محض رسوائی کے سوا اور کچھ نہیں دیتی۔ جب کہ اللہ کی پاک و بے نیاز ذات سے محبت اس کے بندے کو دنیا و آخرت میں سرخرو کردیتی ہے۔ وہ خود سے محبت کرنے والے کو کبھی بے آسرا نہیں کرتا۔ اس کی دعا رد نہیں کرتا۔ تو پھر کیوں انسان، عشق مجازی کی گمراہی میں بھٹکتا رہے؟

اس روز اس نے جائے نماز پر بیٹھ کر، خدا کے حضور گڑگڑاتے ہوئے۔ بہت دیر تک توبہ استغفار کی تھی۔ دل کا ہر درد جیسے آنسوؤں میں بہہ کر، دامن دل کو خالی کرچکا تھا، ڈبڈبائی آنکھوں اور کپکپاتے لبوں پر، نہایت عاجزی سے یہی دعا جاری وساری تھی۔

''اے اللہ! اے میرے مالک، اے کل جہانوں کے پالنے والے۔ اے سب کی حاجتیں پوری کرنے والے۔ میں گنہگار، تیری عاجز بندی خالی ذہن، خالی ہاتھ، خالی دامن لیے تیرے حضور اپنے دل کی راحت کے لیے حاضر ہوں، میرے مالک، اپنی رحمت کے صدقے، میرے گناہوں کو بخش دے، اے اللہ بے شک تو بے حساب نوازنے والا ہے تیرے رحم و کرم کی کوئی حد نہیں۔ اپنی اسی رحمت کے صدقے، مجھے اپنے قرب سے سرفراز فرما۔ صبر کی دولت سے مالا مال فرمادے، میرے مالک، وہ ایک شخص جو میرا نہیں ہے۔ تو اپنی رحمت کے صدقے، اسے میرا...... بنادے پروردگار! اگر وہ میرا نہیں ہوسکتا۔ تو میرے

دل کو اس سے پھیر دے اے اللہ مجھے آسانیوں سے ہمکنار فرما، دربدر بھٹکنے سے بچالے۔
گمراہ ہونے سے بچالے، میرے پاپا ان کو سکون و صبر کی دولت عطا فرما میرے مالک،
میرے دکھوں کا ازالہ کر دے۔"

با آواز بلند بڑبڑاتے ہوئے، دعا میں دونوں ہاتھ اٹھائے۔ وہ اپنے اللہ سے اپنے
دل کا حال کہہ رہی تھی۔ جواب میں اس کا تڑپتا، مچلتا دل، جیسے ٹھہر گیا تھا۔ اعصاب لمحوں میں
پرسکون ہو چکے تھے۔

☆......☆......☆

ایک ہفتے کے بعد عون احمر جعفری کی واپسی ہوئی تو اس کا سامنا، ایک یکسر بدلی ہوئی
یمنی رحمٰن سے ہوا تھا۔ صاف ستھرے کپڑوں میں ملبوس، سر کو دوپٹے سے اچھی طرح ڈھانپے
ہوئے۔ شفاف چہرے پر سنجیدگی کا لبادہ اوڑھے وہ کہیں سے بھی پہلے والی یمنی رحمٰن دکھائی
نہیں دے رہی تھی۔ وہ محض چونکا نہیں تھا۔ شاکڈ رہ گیا تھا۔ کہاں تو اس کی اس قدر دیوانگی
کہ رات میں ذرا سا لیٹ ہو جانے پر، طوفان اٹھا دیتی تھی۔ اور کہاں اب اس کے اتنے
دنوں کی جدائی پر، اف تک نہیں کی تھی۔ فارمل لہجے میں اس کا حال احوال دریافت کرنے
کے بعد، وہ نماز عصر کے لیے اٹھ گئی تھی۔

اگلے پندرہ بیس دنوں میں بھی اس کا یہی معمول رہا تھا، اس کی شاندار پرسنالٹی کو یکسر
نظرانداز کیے۔ وہ اپنے ہی حال میں مست ہو کر رہ گئی تھی۔ گو اب بھی اس نے اپنے فرائض
سے منہ نہیں موڑا تھا۔ ہر طرح سے اس کے ہر حکم کی تعمیل بجا لا رہی تھی۔ مگر پھر بھی، وہ سر سے
پیر تک بدل گئی تھی۔ اب اس نے چھوٹی چھوٹی باتوں پر رونا دھونا، گلہ شکوہ کرنا چھوڑ دیا تھا۔
رات میں کسی ایمرجنسی کی وجہ سے اسے دیر ہو جاتی۔ تو وہ اسے آرام سے اپنے کمرے میں
مقید ملتی تھی۔ کہیں کوئی اضطراب، کوئی تڑپ، اس کی آنکھوں میں نہیں ہوتا تھا۔

دانیہ خان پر آج کل اس کے گھر والوں کی طرف سے شادی کے لیے دباؤ بڑھ رہا
تھا۔

اس کی خواہش تھی کہ اس سے شادی سے قبل عون، یمنی رحمٰن کا فیصلہ کر دے ان دونوں
میں سے ایک کو ہم سفر رکھ لے اور عون نے اس کی خواہش پر، بنا ایک پل بھی سوچے۔ اس
کے حق میں فیصلہ کر دیا تھا۔ اس نے دانیہ خان کو یہ یقین تھما دیا تھا کہ وہ بہت جلد یمنی رحمٰن
سے چھٹکارا حاصل کر لے گا۔

آج کل وہ اسی کشمکش کا شکار تھا کہ کیسے یمنی سے علیحدگی کے موضوع پر بات کرے۔
اس نے تو جیسے نظروں کے حصار میں ایک منٹ سے زیادہ نہ رہنے کی قسم کھالی تھی۔ پہلے جو

اس سے بات کرنے کے بہانے تلاشتی تھی۔ اب اس کے پکارنے پر بھی۔ مشکل سے کوئی
بات سننے پر تیار ہوتی تھی۔

بہت زیادہ بدل گئی تھی وہ۔ عشق مجازی سے عشق حقیقی کی طرف آ کر بہت زیادہ میچور
ہو گئی تھی۔ اس روز نائٹ ڈیوٹی نہ ہونے کے باعث وہ اسپتال سے جلد گھر چلا آیا تھا۔ تب
ہی مغرب کی نماز سے فارغ ہو کر سلیقے سے جائے نماز سمیٹتی وہ اس کے قریب چلی آئی تھی۔

"مجھے آپ سے کچھ بات کرنی تھی۔"

بہت دنوں کے بعد اسے خود سے مخاطب ہوتے دیکھ کر وہ بری طرح چونکا تھا۔ تبھی اس
کے سامنے صوفے پر ٹکتے ہوئے متانت سے بولا۔

"بات تو مجھے بھی بہت ضروری کرنی تھی تم سے۔ بہر حال تم کہو کیا کہنا چاہتی ہو؟"

"میں...... پاکستان جانا چاہتی ہوں۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے۔"

نظریں جھکا کر بہت دھیمے لہجے میں اس نے اپنا مدعا بیان کیا تھا۔ جب وہ کچھ لمحوں
کے لیے حیرانی سے اس کی طرف تکتے ہوئے صوفے کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے بولا۔

"ایز یو وش...... میں نے کبھی تمہارے کسی معاملے میں دخل نہیں دیا۔ لیکن جانے سے
پہلے، پلیز مجھ پر ایک احسان کرتی جاؤ۔"

"فرمایئے۔" اس کے چہرے پر عجیب سا ٹھہراؤ تھا۔ لگ بھگ ایسا ہی ٹھہراؤ اس کی
آنکھوں اور لہجے میں بھی تھا۔

"میں دانیہ کو اپنانا چاہتا ہوں یمنی، لہٰذا جانے سے پہلے پلیز ڈائیورس پیپرز پر سائن
ضرور کرتی جانا۔"

دھڑ، دھڑ، دھڑ...... ساتوں آسمان ایک ساتھ اس کے سر پر آ گرے تھے۔ ساعتیں
لمحوں میں بے جان ہوئی تھی۔ رخسار جیسے تپ اٹھے تھے۔ بہت ضبط کے باوجود بھی آنکھیں
آنسو چھلکانے سے باز نہیں رہیں۔

اتنے سالوں کی کڑی مسافت کا صلہ۔

"اوکے......"

جانے کس ضبط کے عالم میں کہنے کے ساتھ ہی، وہ آنسوؤں کو پیتے ہوئے وہاں سے
اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ عون احمر جعفری نے بہت غور سے اس کے چہرے کی طرف دیکھا تھا۔
جہاں کرب کی ابھری داستان، ان بھیگتی آنکھوں میں بخوبی پڑھی جا سکتی تھی۔ تبھی شاید وہ
بہت دیر تلک وہیں بیٹھا، پلکیں موندے نجانے کیا سوچتا رہا تھا۔

☆......☆......☆

میران شاہ اور رحمٰن صاحب پاکستان واپس پلٹ آئے تھے۔ آج کل وہ پاکستان جانے کی تیاریوں میں، مصروف دکھائی دے رہی تھی۔ عون احمر جعفری نے ڈائیورس پیپرز تیار کروالیے تھے۔ ان کے مابین قائم تین سالہ رفاقت کا بندھن ٹوٹنے کے لئے محض، چند جگہوں پر ان دونوں کے سائن کا محتاج تھا۔

زندگی یمنی رحمٰن کے اندر جیسے تھکنے لگی تھی۔

اس نے بہت خاموشی کے ساتھ محض چند لمحوں تک بھرائی آنکھوں سے چپ چاپ اس کی طرف دیکھنے کے بعد، کپکپاتی انگلیوں میں پین تھام کر، بنا کوئی شکوہ، گلہ کئے مطلوبہ جگہوں پر تیزی کے ساتھ اپنے سائن کر دیئے تھے۔

آج وہ آخری تصویر جلا دی ہم نے۔

جس سے اس شہر کے پھولوں کی مہک آتی تھی۔

آج وہ نکہت آسودہ لٹا دی ہم نے

آج اس نے خود اپنے آپ کو، ڈائیورس پیپرز کے ان کاغذوں میں دفن کر کے ہمیشہ کے لیے اپنی روح عون احمر جعفری کے سپرد کر دی تھی۔ ''محبت محبت ڈاٹ کام'' کے اس کھیل میں بالآخر شکست اس کا مقدر بن گئی تھی۔ جس محاذ پر نہ فتح کا امکان ہو، نہ ہار کی توقع وہاں انسان اندر سے تھک جاتا ہے۔ وہ بھی تھک گئی تھی۔ زبردستی اور یکطرفہ محبت کے اس رشتے کو مضبوط کرنے کی لگن میں خود ٹوٹ گئی تھی۔ دل درد سے بوجھل ہو رہا تھا۔ مگر زندگی میں پہلی بار اس نے دل کے درد پر توجہ نہیں دی تھی۔ ضبط کا پہاڑ بنی، سرخ آنکھوں میں مچلتے آنسوؤں کے سمندر کو پیتے ہوئے وہ اس کے سامنے اعتماد سے کھڑی تھی۔ جو اس کے سائن کئے ہوئے ڈائیورس پیپرز کو ہاتھ میں لے کر کافی دیر تک سگنیچرز کو غور سے دیکھتا رہا۔

ضبط کی آخری سیڑھی پر کھڑی وہ دھان پان سی لڑکی اتنی آسانی سے اس کی محبت سے دستبردار ہو کر، اسے مزید شاکڈ کر گئی تھی، بہت گہری نگاہوں سے کچھ پل بغور اس کی طرف دیکھنے کے بعد، وہ پیپرز کو مٹھی میں دبائے گھر سے باہر نکل گیا تھا۔ یمنی کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ اپنی بربادی پر پھوٹ پھوٹ کر رو دے۔ یہ اعتراف کرے کہ دنیا میں محبت سے سب کچھ جیتا جا سکتا ہے۔ مگر کسی بے حس شخص کا دل نہیں، آج اسے خود اپنے آپ سے ندامت محسوس ہو رہی تھی۔ آج وہ اپنا سب کچھ لٹا کر اپنے دیس واپس جا رہی تھی۔ سلگتی آنکھوں سے بہتے آنسوؤں کے قافلے کو روکنا اس کے اختیار میں نہیں رہا تھا۔ تاہم اس سے پہلے کہ پاکستان کے لیے فلائی کرتی۔ عون احمر جعفری کے روڈ ایکسیڈنٹ کی خبر نے اس کا دل جیسے اپنی مٹھی میں جکڑ لیا۔

گو وہ اس سے اپنا ہر ناتا توڑ کر نئے سفر پر گامزن ہو رہا تھا۔ مگر پھر بھی وہ اس کے لیے تڑپ کر رہ گئی تھی۔ تبھی بدحواسی کے عالم میں مطلوبہ ہسپتال پہنچی تھی۔ مگر وہاں عون احمر جعفری کے قریب دانیہ خان کو دیکھ کر انہی قدموں پر واپس لوٹ آئی۔

مگر خدا کے حضور عون احمر جعفری کی لمبی عمر اور مکمل صحت مندی کی دعائیں ضرور مانگی تھیں۔

خدا کے حضور نہایت عاجزی سے گڑگڑاتے ہوئے وہ عون احمر جعفری کا ہر ستم بھلا چکی تھی۔ جب کہ دوسری طرف دانیہ خان، جو عون کو دل کی گہرائیوں سے چاہتی تھی۔ وہ ڈاکٹرز سے اس کے سر پر لگنے والی گہری چوٹ کے متعلق سن کر، ازحد متفکر ہو گئی تھی۔ دل کے کسی کونے میں تھوڑی سی آس باقی تھی کہ شاید عون آنکھوں پر بندھی پٹی کے اترنے کے بعد، دیکھنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ مگر اس کی آس کا یہ چراغ بھی اس وقت گل ہو گیا کہ جب پٹی کھلنے کے بعد، عون نے اسے بتایا کہ وہ کچھ بھی دیکھ نہیں پا رہا ہے۔ تب بہت مجبور ہو کر ٹپ ٹپ آنسو بہاتے ہوئے، وہ سامنے پڑی اپنی اس ''اندھی محبت'' سے دامن چھڑانے پر مجبور ہو گئی تھی۔ گو اس کا پیار مطلبی نہیں تھا۔ وہ واقعی عون احمر جعفری کے ساتھ اپنی زندگی بتانے کی خواہش مند تھی۔ مگر اس عون احمر جعفری کے ساتھ، جو مکمل صحت مند تھا۔ ایک اندھے شخص کا ہاتھ تھام کر، محض محبت کے سہارے، وہ اپنی پوری زندگی کو بے رنگ کرنا نہیں چاہتی تھی۔

''مجھے غلط مت سمجھنا عون، تمہارے ساتھ ہونے والے اس المناک سانحے کا مجھے بے حد افسوس ہے۔ مگر...... کاش مشکل کے اس وقت میں، میں تمہارا ساتھ نبھا سکتی۔ میں نے واقعی تم سے محبت کی ہے۔ لیکن...... میں بہت مجبور ہوں، عون پہلے کی بات اور تھی۔ مگر اب...... اب میرے گھر والے کبھی ہمارے رشتے کے لیے نہیں مانیں گے۔ وہ ہرگز مجھے اس بات کی اجازت نہیں دیں گے کہ میں ایک نابینا شخص سے شادی کروں۔ اس لیے ہو سکے تو پلیز مجھے معاف کر دینا۔ سمجھ لینا کہ میں تمہارے مقدر میں ہی نہیں تھی۔ وگرنہ تمہیں ضرور مل جاتی یہ بھی شاید اللہ کا کرم ہی ہے کہ ہماری شادی سے پہلے ہی یہ حادثہ ہو گیا۔ وگرنہ بعد میں، پتا نہیں کتنی مشکلات پیش آتیں۔ بہر حال شاید اب زندگی میں دوبارہ ہم کبھی نہ ملیں۔ اس لیے ہو سکے تو اپنے دل کی کتاب سے میری محبت کا ورق پھاڑ دینا عون پلیز......'' عون اس کے بھاری لہجے میں آنسوؤں کی نمی محسوس کر سکتا تھا۔ تبھی شاید اس نے جواب میں ایک لفظ بھی نہیں کہا تھا۔ چپ چاپ پلکیں موندے گہرے کرب کے احساس کو، دل پر گزرتے ہوئے محسوس کرتا رہا تھا۔ آج اس نے اندھے ہو کر، اپنی، لولی لنگڑی، مجبور محبت کی گہرائی کو

جانچا تھا۔ کیا واقعی محبت ''مجبور'' ہوتی ہے؟ بہت دیر تک وہ اس سوال میں الجھا رہا تھا۔

دانیہ خان وہاں سے اٹھ کر چلی گئی تھی۔ مگر اسے دیر تک، اپنے مان کے ٹوٹنے کے غم کو محسوس کرتے رہنا تھا۔ یہ لفظ جو ابھی دانیہ خان کی زبان سے ادا ہوئے تھے۔ یہ لفظ تو وہ یمنی رحمٰن کی زبان سے سننا چاہتا تھا۔ اس یمنی رحمٰن کی زبان سے جو پچھلے تین چار سالوں سے کرب کے گھونٹ پیتی رہی تھی۔ اس کی طرف سے ہونے والے ہر ظلم، ہر زیادتی کو، چپ چاپ سہہ کر اس سے دیوانہ وار محبت کرتی رہی تھی۔ ہر طرح سے اس کا خیال رکھتی رہی تھی۔

یکلخت ہی اس کی آنسوؤں سے بھیگی سرخ نگاہیں، تصور میں آئیں تو وہ پہلو بدل گیا۔

''نہیں...... میں تمہیں نہیں سوچوں گا یمنی رحمٰن، پچھلے تین سالوں میں تم میرے مقام سے بہت اوپر چلی گئی ہو۔ اب یہی سزا ہے میری کہ میں زندگی بھر تمہارے قرب کو ترستا رہوں۔ تمہیں گنوا کر بھی تمہاری خوشبو کو محسوس کرتا رہوں۔ ہاں یمنی...... اب میں خود تمہیں وہ خوشیاں دوں گا کہ جن پر تمہارا پورا حق ہے۔''

کتنی عجیب بات تھی کہ وہ اس وقت دانیہ خان کے لیے نہیں، یمنی رحمٰن کے لئے رو رہا تھا۔ اس یمنی رحمٰن کے لیے کہ جو پچھلے چند دنوں میں اسے اپنی طرف متوجہ کر گئی تھی۔ ابھی وہ اس کے متعلق سوچ ہی رہا تھا کہ وہ اس کے کمرے کا دروازہ کھول کر تھکے تھکے سے قدم گھسیٹتی اس کے قریب آ بیٹھی۔ آنکھوں پر چشمہ پہننے کے باوجود وہ اس کی خوبصورت آنکھوں میں تیرتے آنسوؤں کا نظارہ بخوبی دیکھ سکتا تھا۔

''مم...... میں پاکستان جا رہی ہوں، ہمیشہ ہمیشہ کے لیے......''

انگلیاں چٹخاتے ہوئے رندھے ہوئے لہجے میں بمشکل وہ کہہ پائی تھی۔ جواب میں وہ محض اسے دیکھتا رہا تھا۔

''میں جانتی ہوں کہ اس وقت آپ کو سہارے کی ضرورت ہے مم...... مگر مجھ سے تو یہ اختیار آپ چھین چکے ہیں۔ دانیہ بتا رہی تھی کہ اب آپ کبھی دیکھ نہیں سکیں گے، اس لیے پلیز آپ بھی میرے ساتھ پاکستان واپس چلیے......''

''نہیں...... میں اب پاکستان جانے کے قابل نہیں رہا۔ تم جاؤ یمنی! مجھے تم سے کوئی گلہ نہیں ہے۔'' جان بوجھ کر اس نے اپنا لہجہ روڈ کیا تھا، مگر یمنی رحمٰن نے اس کے لہجے کو محسوس نہیں کیا۔

''چلی جاؤں گی...... آج ہی چلی جاؤں گی، مگر...... مم...... میں آپ سے اب بھی پیار کرتی ہوں عون! بہت پیار کرتی ہوں آپ سے۔ مانتی ہوں کہ محبت کے اس کھیل میں ہار میری ہوئی ہے مگر...... میرا پیار آپ کے لیے کبھی کم نہیں ہوگا۔''

یہ وہ الفاظ تھے جو سننے کی توقع وہ ہرگز نہیں کر رہا تھا، تب ہی حیران رہ گیا تھا۔

''کیوں پیار کرتی ہو مجھ سے، جب میں تم سے پیار نہیں کرتا، تمہاری پروا نہیں کرتا اور اب تو تمہاری کیئر بھی نہیں کر سکتا پھر بھی تم مجھ سے پیار کرتی ہو، کیوں؟''

''پتا نہیں۔''

اس کے سخت لہجے کے جواب میں وہ پھر آہستہ سے رو پڑی تھی، تب ہی عون نے خاموشی سے پلکیں موند کر سر تکیے سے ٹکا دیا تھا۔

''تو آج تم سب کچھ چھوڑ کر پاکستان واپس چلی جاؤ گی۔''

''ہاں۔''

''سب کچھ چھوڑ کر۔''

''ہاں۔'' نظریں بدستور آنسو لٹاتے ہوئے جھکی ہوئی تھیں اور سر اثبات میں ہل رہا تھا۔

''اپنے عون...... کو بھی چھوڑ کر۔''

اب کے یمنی نے چونک کر سر اٹھایا تھا پھر اس کی طرف دیکھتے ہوئے گلوگیر لہجے میں بولی۔

''عون احمر جعفری تو میرا کبھی تھا ہی نہیں۔''

''لیکن پھر بھی اسے تمہاری ضرورت ہے یمنی!'' وہ اب بھی بغور اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

''میں اپنا ہر اختیار کھو چکی ہوں عون! آپ نے خود مجھے خالی ہاتھ کر دیا ہے۔'' اب کے وہ بلک بلک کر رو پڑی تھی۔ تب ہی شاید عون احمر جعفری کو اس پر رحم آ گیا تھا۔ پل میں اس کا ارادہ بدلا تھا۔ یمنی رحمٰن کے آنسو دیکھ کر دل پھر سے اپنی ضد پر اڑ گیا تھا۔ ہمک ہمک کر پوچھ رہا تھا۔

''کیا تم یمنی رحمٰن کو کھو کر خوش رہو گے عون؟ کیا تم اس کے بغیر اب خوش رہ سکتے ہو؟'' اس کے سوال پر بہت بے دردی سے اپنے لب کچلتے ہوئے اس نے پھر سے یمنی رحمٰن کی طرف دیکھا۔

''نہیں...... میں تمہیں کھو کر خوش نہیں رہ سکتا یمنی! کیونکہ تم نے مجھے اپنا عادی کر دیا ہے۔ اب اس ڈگر سے ہٹ کر کہاں چلوں میں، کوئی راستہ ہی نہیں رہا۔ کہاں جاؤں اب تمہیں چھوڑ کر، کیسے کہوں کہ میں خود غرض نہیں ہوں مگر...... تمہارے بغیر زندہ رہ کر ہنسی خوشی زندگی بتانا بھی اب ممکن نہیں رہا ہے میرے لیے۔'' خود سے یہ اعتراف کرنے میں صرف

ایک پل لگا تھا اسے اور وہ جیسے محض ایک پل میں اس دیوانی سے ہار کر رہ گیا تھا۔

''تمہیں اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ میں اب معذور ہوگیا ہوں، تمہارے ان بہتے ہوئے آنسوؤں کو دیکھ بھی نہیں سکتا۔'' ایک اور امتحان ایک اور آزمائش مگر اس کے ہر پلان سے بے خبر یمنی رحمٰن نے اب بھی اس کے ہر شک کو باطل ثابت کر دیا تھا۔

''نہیں...... میں صرف اتنا جانتی ہوں کہ میں نے آپ کو دل کی گہرائیوں سے چاہا ہے۔ چاہے کچھ ہو جائے، یہ محبت اب میرے دل کا مکان خالی کرنے والی نہیں ہے۔ میری وجہ سے آپ کی زندگی برباد ہوئی، مجھے اس کا بہت دکھ ہے عون! ہو سکے تو پلیز مجھے معاف کر دیجئے گا۔''

اس کے گلوگیر لہجے میں وہ سچائی تھی جسے عون احمر جعفری نے دانیہ خان کے پیار میں تلاشنا چاہا تھا مگر بازی الٹ ہو گئی تھی۔ تاہم کتنی عجیب بات تھی کہ وہ اس پر مضطرب نہیں تھا۔ دل کے اندر دور تلک کسی کسک، کسی تڑپ کا نام و نشان تک نہیں تھا۔ تب ہی ایک گہری سانس فضا کے سپرد کرتے ہوئے اس نے اپنی آنکھوں سے بلیک چشمہ اتار کر سائیڈ پر رکھ دیا۔

''یمنی...... ادھر میری آنکھوں میں دیکھو اور بتاؤ، کیا ان آنکھوں میں دانیہ خان کو کھو دینے کا کوئی درد تمہیں بکھرتا دکھائی دے رہا ہے۔'' گزشتہ چار سالوں میں اس نے پہلی بار یمنی رحمٰن کا ہاتھ تھاما تھا۔ جواب میں وہ حیران ہو کر اس کی طرف دیکھتی رہ گئی تھی۔

''ایسے کیا دیکھ رہیٰ ہو، الحمد للہ میں دیکھ سکتا ہوں اور تمہیں یہ ڈائیورس پیپرز بھی دکھا سکتا ہوں کہ جن پر تم نے میرے سائن دیکھے بغیر بڑی تیزی سے اپنے دستخط کر دیے تھے۔ بتاؤ اب اس آدھی ادھوری طلاق سے کیا مطلب اخذ کروں میں؟''

ڈائیورس پیپرز نکال کر اسے دکھاتے ہوئے وہ قدرے مسرور لہجے میں بولا تو یمنی رحمٰن سے خود کو سنبھالنا خاصا دشوار ہو گیا۔ تب ہی عون احمر جعفری نے ہاتھ بڑھا کر اسے اپنے قریب بیڈ پر بٹھایا۔

''پلیز بے ہوش مت ہو جانا کیونکہ ابھی میں چلنے پھرنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔''

اس نے مختصراً تمام حقیقت یمنی رحمٰن پر کھول دی کہ کیسے اس کا بدلا ہوا سراپا دیکھ کر وہ اس کی طرف متوجہ ہوا پھر یونہی اپنے لیے دانیہ خان اور اس کے پیار کی سچائی جاننے کی غرض سے ایکسیڈنٹ کے بعد بینائی کھو دینے کا ڈرامہ کیا۔ اسے زیاں کے درد سے بچانے کے لیے نابینا کا خیال محض ایکسیڈنٹ کے بعد اس کے ذہن میں آیا تھا تاکہ وہ دانیہ خان سے اس کی شادی کے بعد اکیلی پاکستان واپس جائے تو درد سے نڈھال نہ ہو۔ کم از کم یہ احساس تو

ہمراہ ہو کہ جسے وہ کھو چکی ہے، وہ اب اس کے قابل بھی نہیں رہا مگر سارا کھیل الٹا ہو گیا تھا۔ عون کو ڈائیورس پیپرز پر سائن کر کے اسے اپنی زندگی سے دور کر دینے کی نوبت ہی درپیش نہیں آئی تھی جس کے لیے یہ سب کھیل رچایا تھا، وہ چھوڑ کر چلی گئی تھی اور جسے اس نے ہار جانے کے درد سے بچانا چاہا تھا، اس نے ایک مرتبہ پھر اس پر اپنا بے لوث پیار ثابت کر دیا تھا۔

''مجھے معاف کر دو یمنی...... میں صرف تمہیں اس تکلیف سے بچانا چاہتا تھا جو مجھے کھو دینے کے بعد تمہیں محسوس ہوتی۔ میں خود کو تمہارے قابل نہیں سمجھ رہا تھا۔ پچھلے تین سالوں سے جو سلوک میں نے تمہارے ساتھ روا رکھا تھا، اس کے بعد میں اس انعام کا مستحق نہیں تھا کہ تم میرے لیے مزید یہاں ٹھہرتیں، زندگی میں پہلی بار میں تمہیں خود سے دور کر دینے کے احساس سے نگاہیں چرا رہا تھا۔ سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ میں دانیہ خان کو حاصل کر کے خوش ہونا چاہ رہا ہوں یا تمہیں اپنی زندگی میں روک کر...... پہلی بار میں تم سے دستبردار ہونا نہیں چاہ رہا تھا یمنی اور اپنی یہ کیفیت میں خود سمجھنے سے قاصر تھا۔ اسی کشمکش میں ٹریفک رولز کی خلاف ورزی کرتے ہوئے ایکسیڈنٹ کروا بیٹھا۔ ایکسیڈنٹ کے بعد میں نے اپنے لیے تمہارے اور دانیہ خان کے پیار کو جانچنے کا پلان سوچا تھا۔ دل میں تھا کہ تم مجھے چھوڑ کر چلی جاؤ گی تو میں ان پیپرز پر اپنے سائن کر کے تمہیں اپنی خود ساختہ قید سے رہا کر دوں گا۔ تاکہ تم اس کے بعد اپنی مرضی سے ہنسی خوشی زندگی گزار سکو مگر ایسا نہیں ہوا، یمنی تمہاری دیوانگی پختہ رہی اور میں اپنی لولی لنگڑی محبت سے محروم ہو گیا۔ وہ جو ہر مشکل میں ساتھ نبھانے کی دعویدار تھی، پہلے ہی امتحان میں گھبرا کر ساتھ چھوڑ گئی۔ جانتی ہو کیوں......؟ کیونکہ اسے جس عون احمر جعفری سے محبت کا دعوا تھا، وہ نابینا نہیں تھا مگر تم نے......تم نے میرے نابینا پن کو بھی اہمیت نہیں دی۔ تم اپنی دیوانگی میں مجھ سے میری بے نیازیوں سے میرے اصولوں سے جیت گئیں یمنی! تم نے ثابت کر دیا کہ تمہارا پیار بے لوث ہے۔''

وہ ساکت بیٹھی ٹکر ٹکر اس کی روشن نگاہوں کی طرف حیرانی سے دیکھ رہی تھی اور وہ اس کا سرد ہاتھ اپنے مضبوط ہاتھوں میں دبائے پرسکون انداز میں کہہ رہا تھا۔

''ہم پرسوں ہی پاکستان کے لیے روانہ ہو رہے ہیں یمنی! بابا مجھ سے بہت ناراض ہیں۔ ابھی کل ہی ان سے میری بات ہوئی ہے۔ ''رحمٰن کاٹیج'' میں جلد ہی میران اور معطر کی شادی کے شادیانے بجنے والے ہیں۔ تمہارے بعد معطر نے رحمٰن انکل اور میران کا بہت خیال رکھا ہے۔ بہت بے لوث خدمت کی ہے ان کی۔ میری طرح میران بھی معطر کی وفا

شعاری سے ہار گیا ہے۔''

آخری درد کا کانٹا بھی نکل گیا تھا، تب ہی شاید وہ بے اختیار ہو کر اپنا سر عون احمر جعفری کے مضبوط شانے پر ٹکاتے ہوئے سسک پڑی۔

''آپ نے مجھے بہت دکھ دیا ہے عون! ایک مسیحا ہو کر مجھے پل پل کانٹوں پر گھسیٹا ہے آپ نے۔'' یہ پہلا گلہ تھا جو اس سے شادی کے بعد اس کے لبوں سے پھسلا تھا۔ تب ہی وہ محبت سے اس کے بال سنوارتے ہوئے مدھم لہجے میں بولا۔

''جو ہو گیا اسے بھول جاؤ یمنی! کیونکہ جو درد میری وجہ سے تمہیں ملے ہیں، اب ان کا ازالہ بھی میں ہی کروں گا، مگر یہاں نہیں، پاکستان جا کر۔''

اس کے گمبھیر ذو معنی لہجے پر اودھم مچاتی دل کی بے قرار دھڑکنوں کو بمشکل سنبھالتے ہوئے اس نے آہستہ سے پلکیں موند لی تھیں۔ جسم کا ایک ایک عضو اس وقت اللہ کی پاک و بے نیاز ذات کا شکر ادا کر رہا تھا جس نے اپنی رحمت سے بالآخر اس کے دل کا قرار عون احمر جعفری کی محبت کی صورت اسے واپس لوٹا دیا تھا۔ یقیناً آنے والے دنوں میں اب خوشیوں کی بہت سی بہاریں شدت سے اس کی منتظر تھیں۔

دربار محبت

تو بول اٹھے تو لفظ خوشبو
تو سوچ لے تو خیال خوشبو
تیرے تعلق سے بن گیا ہے
سوال خوشبو، جواب خوشبو

وفا جب مصلحت کی شال اوڑھے
سر درت کا روپ دھارے، دل کے آنگن سے گزرتی ہے
تو پلکوں پہ ستاروں کی دھنک مسکانے لگتی ہے
کبھی خوابوں کے ان چھوئے ہیولوں سے بھی
ان دیکھی سی، انجانی سی خوشبو آنے لگتی ہے
کسی کے سنگ بیتے، ان گنت لمحوں کی زنجیریں اچانک ذہن میں جب گنگناتی ہیں
نفس کے تاروں میں سناٹا ایک دم چیخ اٹھتا ہے
تو یوں محسوس ہوتا ہے، ہوائیں آ کے سرگوشی سی کرتی ہیں
محبت کا تمہیں ادراک اب تو ہو گیا ہوگا
یہ جو بھی زخم دیتی ہے کبھی سینے نہیں دیتی
محبت روٹھ جائے تو کبھی جینے نہیں دیتی

رات بھر ٹھنڈی ہواؤں سے بے نیاز در بدر بھٹکنے کے بعد، بالآخر وہ ایک مسجد میں چلی آئی تھی۔

جوتوں سے بے نیاز ننگے پاؤں، شانوں پہ بکھرے بے ترتیب بال، کئی روز سے ان دھلا چہرہ، اور مٹی سے اٹا وجود، اس کی ابتر حالت کو بخوبی ظاہر کر رہا تھا۔ بھوک کی شدت کے باعث پیٹ جیسے کٹنے لگا تھا۔ احساسات منجمد ہو کر رہ گئے تھے، جلتی سلگتی دوپہر سر پر آن پہنچی تھی۔ لہٰذا مسجد میں اس وقت بمشکل ایک دو نمازی موجود تھے۔

تب ہی وہ جیسے نڈھال ہو کر، گھٹنوں کے بل بیٹھتے ہوئے اللہ کے حضور گڑگڑا اٹھی۔

''اے اللہ، اے میرے مالک، تو رحیم ہے رحمٰن ہے، اس ساری کائنات کے نظام کو چلانے والا ہے، بے شک تو ہی اپنے بندوں کی جان و مال کا محافظ ہے۔ پروردگار، میں مانتی ہوں کہ میں خطاوار ہوں، گناہ گار ہوں، مجھ سے بہت سنگین غلطی کا ارتکاب ہوا ہے، لیکن تو بخشنے والا ہے مولا، تیری رحمت کا دامن، بہت وسیع ہے۔ پاک پروردگار، یہ ملک جو میرا اپنا گھر ہے، مگر اس گھر میں، میرے اپنوں کے ہاتھوں، میری عزت محفوظ نہیں ہے، مالک میں بہت مایوس ہو کر، تیرے در پر آئی ہوں مولا، تجھے اپنے پیارے حبیب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا واسطہ، مجھے میری منزل پر پہنچادے، مجھے مزید دربدر بھٹکنے سے بچالے مالک، میرے ایمان و سکون کی حفاظت فرما۔''

دعا کے لیے ہاتھ پھیلائے، وہ بلک بلک کر رو پڑی تھی، جب کسی نے اچانک اس کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔ تب شدید چونک کر وہ پیچھے پلٹی تھی، ہرنی کی مانند پھیلی ہوئی بڑی بڑی آنکھوں میں پھیلا ہوا خوف صاف دکھائی دے رہا تھا۔

''ک......کون ہیں آپ......؟'' خشک حلق سے یہ چند الفاظ بھی بڑی مشکل سے برآمد ہوئے تھے۔ جب اس کے مقابل کھڑی شخصیت نے نہایت حلیمی سے کہا۔

''گھبراؤ نہیں بیٹی، تم اللہ کے گھر میں، اس کی امان میں ہو، اللہ کے گھر میں آنے والوں کو کسی کا خوف نہیں ہوتا۔'' سفید صاف ستھرے کپڑوں میں ملبوس کندھے پر بڑا رومال رکھے، ترشی ہوئی نفیس سی داڑھی والے وہ بزرگ بلاشبہ اس وقت اس کے لیے کوئی فرشتہ بن کر ہی وہاں تشریف لائے تھے۔

''بیٹی! تم یقیناً اپنے بابل کی دہلیز کو رات کے اندھیرے میں پار کرنے والی، نادان لڑکیوں میں شامل ہو کر یہاں تک پہنچی ہو، لیکن گھبراؤ مت، اب تمہاری عزت و جان کو قطعی کوئی خطرہ نہیں ہوگا، یہاں مسجد کے قریب ہی، میرا چھوٹا سا گھر ہے، تم چاہو تو میرے ساتھ، وہاں چل کر رہ سکتی ہو۔''

وہ پچھلے تین دنوں سے گھر سے باہر تھی۔ اور ان تین دنوں نے اسے انسانوں کی پہچان بہت اچھے طریقے سے کروادی تھی، تب ہی وہ اپنے آنسو پونچھ کر، فوراً ان کے ساتھ چلنے کو تیار ہوگئی، بھیڑیے نما انسانوں کے اس جنگل میں وہ واقعی اسے ایک فرشتے کی مانند لگے تھے۔

''چلو......''

''پھر سے کسی راہ چلتی کی انگلی تھام کر، لے آئے آپ، میں پوچھتا ہوں، یہ گھر ہے یا کوئی، ایدھی سینٹر، جو ساری مخلوق یہاں سمائی جارہی ہے۔''

چھوٹے سے گھر کی دہلیز پر قدم رکھتے ہی، کسی کا نہایت ترش لہجہ اس کی سماعتوں سے ٹکرایا تھا۔ نتیجتاً اس کے قدم جیسے وہیں جم کر رہ گئے۔

''ہونہہ! ایک تو سارے جہاں کا درد، اللہ نے آپ کے دل میں ڈال دیا ہے، گھر میں چاہے فاقے ہوں، مگر آپ اپنی ہمدردیوں سے باز نہیں آئیں گے......''

اب کے اس نے سہمی سہمی سی نگاہ اٹھا کر، سامنے صحن میں چارپائی پر بیٹھے اس اجنبی نوجوان کو دیکھا تھا، جو شدید برہمی کا اظہار کرتے ہوئے عام سے حلیے میں بھی بہت دلکش دکھائی دے رہا تھا۔

''مہمان اللہ کی رحمت ہوتے ہیں بیٹا اور پھر یہ بیٹی تو بہت مصیبت کی ماری ہوئی دکھائی دیتی ہے۔'' بابا کا لہجہ اس کے مقابلے میں بہت پست تھا۔ تب ہی شاید اسے مزید شہ ملی تھی۔

''اس دنیا میں سب ہی مصیبت کے مارے ہیں، بس ایک ہم ہی عیش کی زندگی گزار رہے ہیں، ناں۔''

شدید اہانت سے اس کا چہرہ سرخ ہوگیا تھا۔ بے بسی کے شدید احساس سے مغلوب ہو کر اس کی آنکھیں، لبالب آنسوؤں سے بھر آئی تھیں، تاہم اس سے پہلے کہ وہ اس نوجوان سے کچھ کہتی، وہ برہمی سے بڑبڑاتے ہوئے تیز تیز قدم اٹھاتا گھر سے باہر نکل گیا۔

''یہ میرا بیٹا ہے، زوہیب حسن، دل کا برا نہیں ہے، بس ذرا زندگی سے بدگمان ہے، خیر تم اس کی باتوں کو دل پر نہ لینا، یوں ہی فضول بولتا رہتا ہے یہ......''

بابا اسے اپنے ساتھ لئے، گھر کے چھوٹے سے صحن میں چلے آئے تھے، جہاں گرمی کا شدید احساس اپنے عروج پر تھا۔ صحن میں ہی رکھی ایک چارپائی کے ساتھ بندھے جھولے میں، کوئی چھوٹا سا بچہ، بے خبر سویا ہوا تھا۔ بچے پر اس کی سوالیہ نگاہیں مرکوز دیکھ کر بابا نے خود ہی اسے بتادیا تھا۔

''یہ یمنی ہے، میرے زوہیب کی بیٹی۔''

''اوہ تو موصوف شادی شدہ ہیں۔'' ابھی تھوڑی دیر پہلے وہ جس خوف کا شکار ہوئی تھی، بچی کے متعلق سن کر، اس خوف سے فوراً آزاد ہوگئی۔

''اب بتاؤ بیٹی، کیا نام ہے تمہارا......؟'' ظہر کی نماز میں ابھی خاصا وقت تھا، لہٰذا وہ اس کا تعارف جاننے کے لیے رک گئے۔

''نور...... نورالعین کہتے ہیں مجھے......'' اس تمام عرصے میں پہلی بار اس کے لبوں نے جنبش کی تھی۔ تب ہی بابا اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے شفیق لہجے میں بولے۔

''بس...... مجھے اور کچھ نہیں جاننا، بے شک اللہ نیکی کا صلہ ضرور دیتا ہے۔ آج سے تم میری بیٹی ہو، تمہیں یہاں کسی قسم کا کوئی خطرہ نہیں ہوگا، اسے اپنا ہی گھر سمجھنا بیٹی، گو یہاں زیادہ آبادی نہیں ہے، مگر پھر بھی میں آس پاس میں بسنے والے لوگوں سے تمہارا تعارف اپنی سگی بھانجی کی حیثیت سے کرواؤں گا، تاکہ کوئی بھی تمہارے متعلق غلط نہ سوچ سکے، اب تم اندر کمرے میں پنکھے کے نیچے جاکر آرام کرلو، میں نماز کی ادائیگی کے بعد دوپہر کا کھانا، رحمت بی کے تندور سے لیتا آؤں گا، پھر مل کر کھانا کھائیں گے، ٹھیک ہے؟''

نورالعین نے آج تک کبھی کسی مرد کی شفقت نہیں دیکھی تھی، لہٰذا مولوی عبداللہ عباسی کا مشفق لہجہ اس کی پلکیں بھگو گیا۔ تب ہی اس نے آہستہ سے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے، پلکیں جھکا دیں۔ مولوی صاحب اگلے ہی پل اسے آرام کی تلقین کرتے ہوئے نماز کی ادائیگی کے لیے گھر سے باہر نکل گئے تھے۔ تب وہ زوہیب کی چھوٹی سی بچی کو باہر پالنے سے اٹھا کر، اندر کمرے میں لے آئی، گھر چھوٹا ضرور تھا مگر سلیقے سے بنا ہوا تھا، اگر اس کو دل لگا کر سجایا سنوارا جاتا، تو یقیناً وہ بہت خوب صورت بھی دکھائی دے سکتا تھا۔ مارے تھکن کے اس کا وجود، بہت بری طرح سے دکھ رہا تھا، لہٰذا تمام طرح کی سوچوں کو پس پشت ڈال کر، وہ چارپائی پر لیٹ گئی، اور اگلے کچھ ہی لمحوں میں، نیند کی مہربان بانہوں نے اس کے نڈھال وجود کو خود میں سمیٹ لیا۔

☆......☆......☆

آج سے پندرہ سال قبل جب اس نے شعور کی دہلیز پر قدم رکھا تو گھر کے ماحول کو نہایت تنگ پایا تھا۔ اس سے بڑی دو بہنیں تھیں، لہٰذا اس کی پیدائش کے وقت اس کے اونچے شملے والے باپ نے اس کی ماں کو واضح دھمکی دے دی تھی کہ اگر اس بار بھی لڑکی پیدا ہوئی تو وہ فوراً دوسری شادی رچالے گا، اور پھر یہی ہوا، اس کی ماں کے آنسو، دعائیں کچھ کام نہیں آیا اور اس کے باپ نے اپنے کہے کے عین مطابق فوراً دوسری شادی رچالی۔ یوں اس کی ذات ماں کے لیے سخت امتحان کا باعث بن گئی، شعور کی سیڑھی پر قدم رکھتے ہی اس نے محسوس

کیا کہ وہ ایک ''انسان'' نہیں ہے، ایک ''عورت'' انسان ہو بھی کیسے سکتی ہے؟''

دنیا خواہ چاند پر پہنچے یا سورج پر، زمانہ ترقی کرتے کرتے خواہ آسمان کی بلندیوں کو چھو لے، مگر مردوں کے اس معاشرے میں ایک عورت کا مقام کبھی بلند نہیں ہوسکتا، عورت خواہ کسی بھی معاشرے سے تعلق رکھی ہو ''حقارت'' اس کا نصیب ہے، ہر درد ضبط کرنا اس کا مقدر ہے۔

دنیا کی بڑی سے بڑی قربانی، عورت سے مشروط کی جاتی ہے، وہ اپنے تمام عزیز رشتوں سے جدائی کا درد سہہ کر جس اجنبی گھر میں لاکھوں کی مالیت کا سامان لے کر جاتی ہے، وہاں اسے نوکرانی کا درجہ بھی ملے تو شکر ادا کرتی ہے، بس شوہر اس سے محبت کرتا ہو پھر اس محبت کے لیے وہ سسرال والوں کا ہر ستم ہنس کر سہنے سے بھی دریغ نہیں کرتی، شوہر کی اسی محبت کے لیے تن من دھن وارنے کے بعد وہ کفن سرہانے رکھ کر، نئی نسل کو خوشی خوشی وجود میں لاتی ہے زندگی اور موت کی اس جنگ میں، اگر وہ بیٹا جنے تو ٹھیک، لیکن اگر اپنے ہی جیسی ایک اور عورت کو وجود میں لے آئے تو زندگی اس کے لیے کسی عذاب سے کم نہیں ہوتی، جس عورت کے وجود سے کائنات کے حسن کی بقا ہے وہ عورت کسی بھی دور میں، مرد کے پاؤں کی جوتی سے بڑھ کر حیثیت اختیار نہیں کرسکی۔ کچھ یہی کہانی اس کی ماں کی بھی تھی، اس نے کبھی اپنی ماں کو بن سنور کر آرام کرتے نہیں دیکھا تھا، کولہو کے بیل کی مانند وہ ہر وقت کسی نہ کسی کام میں مشغول دکھائی دیتی تھی۔ اکثر کبھی رات کو اس کی آنکھ کھلتی تو وہ انہیں مصلے پر بیٹھ کر روتے ہوئے دیکھتی۔

ان دنوں اسے اپنی ماں بہت پر اسرار لگا کرتی تھی۔ دن بھر ان گنت کام سرانجام دینے کے بعد، وہ اکثر اس کے باپ کے ہاتھوں بہت بری طرح سے پٹ بھی جایا کرتی تھی مگر اس کے باوجود، اس نے کبھی اپنی ماں کو اف کرتے ہوئے بھی نہیں دیکھا تھا۔ رات گئے تک وہ مصلے پر بیٹھی خدا سے اپنے ایمان وسکون کی حفاظت کی دعائیں مانگتی رہتی تھی، گھر میں اس کی سوتیلی ماں کی آمد کے بعد تو، خدا سے ان کا لگاؤ مزید بڑھ گیا تھا۔ نورالعین کو کبھی کبھی ان کے اس قدر صبر پر بہت حیرانی ہوتی تھی، اسے واقعی وہ ایک جیتا جاگتا انسان نہیں لگتی تھی۔

اس کا باپ اپنی دوسری بیوی کے بہت ناز اٹھاتا تھا۔ وہ تینوں بہنیں اور اس کی ماں، اسے چارپائی پر بٹھا کر کھلاتی تھیں، پھر جس وقت اس نے ایک ساتھ دو بیٹوں کو جنم دیا، تب سے اس کا مقام مزید بلند ہوگیا تھا۔ اس کے باپ کا بس نہیں چلتا تھا کہ دنیا جہاں کی خوشیاں لاکر بیوی کے قدموں میں نچھاور کردیتا۔

اس کی اپنی سگی ماں اب بہت بیمار رہنے لگی تھی، مگر پھر بھی، جیسے ہی اس کا باپ گھر میں
اخل ہوتا، وہ تینوں بہنیں بھاگ کر ماں کے پیچھے چھپ جایا کرتی تھیں، اچھی خوراک، اچھے
اس اور اچھے ماحول سے ان کا دور کا بھی واسطہ نہیں رہا تھا۔ ان ہی دنوں گھر میں ایک بہت
بردست طوفان اٹھا۔

اس وقت اس کی عمر بمشکل دس گیارہ سال کی تھی، مگر پھر بھی وہ معاملے کی نوعیت کو کسی
د تک بھانپ گئی تھی۔ اس کی سب سے بڑی بہن روزینہ، محلے میں کسی کے گھر سلائی سیکھنے
اتی تھی، اسی دوران ان کے محلے کا ہی کوئی نوجوان، روزینہ کو پسند کرنے لگا، روزینہ چونکہ
پنے گھر کے ماحول سے واقف تھی لہٰذا اس نے لڑکے کی حوصلہ شکنی کرتے ہوئے اسے شدید
انٹ کر رکھ دیا۔ نتیجتاً اس نوجوان نے قطعی جذبات سے کام لیتے ہوئے اپنی اور روزینہ کی
حبت کی کہانی پورے محلے میں پھیلا دی۔ مقصد تھا کہ یوں روزینہ اس کے علاوہ کسی اور کی
ہیں ہو سکے گی، مگر کسی اور کے ہونے کی تو نوبت ہی نہیں آئی، غیرت کے اندھے قانون کے
حت، اس کے باپ نے، سوتیلی ماں کی شہ پر، چپ چاپ، بنا اس کی کوئی صفائی سنے روزینہ
کا گلا دبا کر اسے موت کے گھاٹ اتار دیا۔

نورالعین نے یہ سب اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ اپنی بڑی بہن کی باہر کو ابلی ہوئی
موٹی موٹی آنکھیں دیکھ کر وہ بہت بری طرح سے سہم گئی تھی۔ حلق سے ایک چیخ تک برآمد نہ
ہو سکی تھی۔ کچھ ہی دنوں میں ''قانون'' نے اس کے باپ کو رہا کر دیا تھا۔ نورالعین اور اس
سے بڑی حائفہ کو اب اپنے سگے باپ سے بے حد خوف آنے لگا تھا وہ رات میں ٹھیک سے سو
بھی نہ پاتی تھی، ان ہی دنوں ماں بھی چاپ چاپ ان کا ساتھ چھوڑ گئیں تو گویا وہ تپتے
سورج تلے ننگے پاؤں آ کھڑی ہوئیں۔ زندگی تو پہلے ہی کسی عذاب سے کم نہیں تھی، اب جیسے
ہر ہر سانس حلق میں اٹکنے لگا تھا۔

اسے پڑھنے کا بے حد شوق تھا، مگر اس کے باپ نے انہیں اسکول کا منہ تک نہیں دیکھنے
دیا تھا۔ اس کے خیال کے مطابق ایک عورت کو تعلیم ہی سب سے زیادہ بگاڑنے میں مدد دیتی
ہے۔ لہٰذا وہ اپنی اس خواہش سے بھی محروم رہی، ماں کے جانے کے بعد ان کی زندگی مزید
تلخ ہو کر رہ گئی تھی۔ کسی بھی پل مل جانے والی موت کا خوف ان کے اندر مزید بڑھ گیا تھا۔
اب وہ وجود نہیں رہا تھا کہ جس کے پیچھے وہ چھپ کر خود کو محفوظ تصور کرتیں۔ باپ گھر میں
داخل ہوتے ہی انہیں خونخوار نگاہوں سے گھورنا شروع کر دیتا تھا۔

زندگی کے اس بہاؤ میں بہتے ہوئے اپنے لیے کچھ سوچنا، قطعی ممکن نہیں تھا، مگر شاہد رحمٰن
نے اسے یہ راہ دکھائی تھی، وہ اس کی سوتیلی ماں کا سگا بھانجا تھا اور گاؤں سے تعلیم کے سلسلے

میں ان کے پاس ہی آ ٹھہرا تھا۔ نورالعین نے اس کی آنکھوں میں اپنے لیے محبت کا عکس
دیکھا، تو بہت گھبرا گئی تھی۔ مگر شاہد نے قدم قدم پر اس کی حوصلہ افزائی کی اور اس کی
معصومیت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے خوب عیش کیے۔

نورالعین اس کی اصل فطرت سے واقف نہیں تھی، لہٰذا اس کی دکھائی گئی راہ گزر پر چلتے
ہوئے اپنا برا بھلا سب فراموش کر بیٹھی، اس دوران حائفہ نے اسے سمجھانے کی بہت کوشش
کی، مگر اس کی آنکھیں خوشنما خواب دیکھنے سے باز نہیں آئیں۔ نتیجتاً ایک روز، وہ بنا کسی کو
کچھ بتائے، اپنی جان پر کھیل کر، گھر سے زیور کپڑے اور کچھ نقد رقم چوری کر کے، اپنی من
پسند زندگی بسر کرنے کے لالچ میں، شاہد کے ساتھ گھر سے بھاگ آئی۔ دل بے حد مسرور تھا
کہ اب کوئی اسے ستانے والا نہیں ہوگا، کسی کے ہاتھوں، کسی بھی پل مر جانے کا خوف، اس کی
نیندیں حرام نہیں کرے گا، مگر زندگی کوئی ٹرین تھوڑی ہے، جو ہماری خواہش کے مطابق جیسے
ہم چاہیں ویسے ہی چلے، یہ اپنے کھیل دکھاتی ہے اور ہار جانے والوں کا چپ چاپ
تماشا دیکھا کرتی ہے۔

وہ بھی ہار گئی تھی، پہلی محبت کے، پہلے ہی کھیل نے اسے تھکا ڈالا تھا۔ شاہد کی محبت،
حقیقت پر مبنی نہیں تھی، لہٰذا وہ اس سے زیور اور پیسہ ہتھیانے کے بعد پلیٹ فارم سے ہی
رفو چکر ہو گیا۔ رات بھر وہ اسٹیشن پر بیٹھی، بے کل دل کے ساتھ، اس کے لوٹ آنے کا انتظار
کرتی رہی تھی مگر وہ ابھی پانچ منٹ میں آیا کہہ کر جانے والا، اگلے چوبیس گھنٹوں میں بھی
پلٹ کر واپس نہیں آیا تو وہ ٹوٹ کر بکھر گئی۔

آج اسے بخوبی سمجھ میں آیا تھا کہ اس کی ماں ہر نماز میں اللہ سے، اپنے اور اپنی بچیوں
کے ایمان و سکون کی حفاظت کی دعا کیوں مانگا کرتی تھی۔ زندگی میں پہلی بار اسے اللہ یاد آیا
تھا، اپنی اندھی محبت کے چکر میں الجھ کر وہ اپنی معصوم بہن کے مستقبل کے متعلق سوچنا تو بھول
ہی گئی تھی۔ نہ جانے اس کے ساتھ کیا ہوا ہوگا؟ اس سوچ نے اسے مزید توڑ دیا۔ تب تین
دن بھوکے پیاسے، انسانوں کے جنگل میں دربدر بھٹکنے کے بعد بالآخر اللہ کو اس کے حال پر
رحم آ گیا تھا، لہٰذا وہ مولوی عبداللہ عباس کے گھر پہنچ گئی تھی۔

بچپن میں اکثر رات کو اس کی آنکھ کھل جاتی تو وہ اپنی ماں سے بڑی معصومیت کے
ساتھ پوچھا کرتی تھی۔

''امی...... آپ اتنی رات کو دیر تک جاگ کر اللہ سے کیا مانگتی ہیں؟''

جواب میں اس کی ماں ایک ٹھہری ہوئی اداس نگاہ اس کے معصوم چہرے پر ڈال کر
محبت سے جواب دیتی۔

"صبر......"

"صبر...... یہ صبر کیا ہوتا ہے امی۔"

اس وقت اسے واقعی بڑی حیرانی ہوتی تھی کہ اس کی ماں، محض صبر کے لیے اتنی رات کو دیر تک جاگ کر دعا کرتی ہے۔

"اللہ کی آزمائش، ہنسی خوشی سہہ کر اس کا شکر ادا کرنا صبر کہلاتا ہے بیٹی۔"

اس کی ماں محبت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے جواب دیتیں تو وہ مزید الجھ کر ان سے پوچھ بیٹھتی۔

"صبر کرنے سے کیا ہوتا ہے ماں، کیا صبر کر لینے سے آنسو نہیں آتے، اللہ خوش ہو جاتا ہے۔"

"ہاں، اللہ مصائب پر صبر کرنے والوں کو بہت پسند کرتا ہے۔"

"پر آپ تو اللہ سے بہت محبت کرتی ہیں، پھر اللہ آپ کی دعائیں کیوں نہیں سنتا......؟ کیوں آپ کو ایک بیٹا اور ہمیں ایک پیارا سا بھائی نہیں دے دیتا۔"

وہ گلہ کرنا نہیں چاہتی تھی پر کر بیٹھتی تھی۔ جواب میں اس کی ماں کچھ لمحوں کے لیے خاموش رہ کر، جیسے کھوئے کھوئے سے لہجے میں اسے بتاتیں۔

"اللہ کسی کو مایوس نہیں کرتا بیٹی، بے شک اللہ اپنے مومن بندوں کے ساتھ، کبھی کچھ غلط نہیں کرتا۔"

"کیا اللہ بہت پیار کرنے والا ہے امی......؟"

"ہاں...... بے شک اللہ اپنے بندوں پر بہت مہربان ہے۔"

"ماں اگر میں اللہ سے کچھ مانگوں تو کیا اللہ میری دعا قبول کرے گا؟"

"ہاں، اللہ تو سب کی دعا سنتا اور قبول کرتا ہے بیٹی، ان لوگوں کی بھی، جو اس کے وجود کو نہیں مانتے، جھوٹے معبودوں کو اس کا شریک ٹھہراتے ہیں۔"

اس کی ماں کے لہجے میں بے حد ٹھہراؤ اور ایک عجیب سا سکون ہوا کرتا تھا۔ تب ہی وہ پھر پوچھ بیٹھتی تھی۔

"امی، اللہ تو ایک ہے، پھر وہ اتنے سارے لوگوں کی دعائیں ایک ساتھ کیسے قبول کر لیتا ہے، کیا اللہ کو اپنے سب بندے دکھائی دیتے ہیں......؟"

"ہاں، اللہ سب کو دیکھتا ہے بیٹی، ہر جگہ ہر پل اس کے بندے اس کی نظر میں ہوتے ہیں۔"

اللہ کی پاک ذات کے بارے میں باتیں کرتے کرتے، وہ اپنی ماں کی آغوش میں ہی

سو جایا کرتی تھی۔ پہلے وہ اپنی ماں کی جامد خاموشی پر حیران ہوا کرتی تھی، مگر اب اس کی سمجھ میں آ گیا تھا کہ اس کی ماں کسی بھی دکھ پر شکایت کیوں نہیں کرتی تھی؟ کیوں کسی ظلم پر واویلا نہیں مچاتی تھی؟

صبر کا مفہوم بہت اچھی طرح سے اس کی سمجھ میں آ گیا تھا۔ مگر ایمان و سکون کی حفاظت کی دعا کا مفہوم اب اس کی سمجھ میں آیا تھا۔ زندگی کے ہر پل میں اسے اپنی ماں بہت یاد آتی تھی، مگر شاہد کے جھوٹے پیار میں الجھ کو وہ ان کی نصیحتوں اور دعاؤں کو بھلا بیٹھی تھی۔ پانچوں وقت کی نماز سے بے گانہ ہو کر، اللہ کی پاک ذات سے بھی دور ہو بیٹھی تھی۔ اس کے کرم کو فراموش کر بیٹھی تھی، مگر ٹھوکر لگی تو اسی اللہ نے پھر سے اس پر اپنا کرم کیا تھا۔ انسانوں کے جنگل میں، اس کی جان اور عزت کی حفاظت کرنے والی، بے شک اللہ کی ذات ہی تھی۔

دوپہر ڈھلے وہ سو کر اٹھی تو تھکن کا احساس کسی حد تک کم ہو گیا تھا۔ تاہم بھوک کا احساس ابھی تک غالب تھا اوپر سے حلیہ بھی نہایت ابتر ہو رہا تھا۔

دماغ جیسے کچھ بھی سوچنے سمجھنے سے قاصر ہو گیا تھا۔ اس کی چارپائی کے ساتھ بندھے جھولے میں پڑی بچی اب خوب زور و شور سے رونے لگی تھی۔ تب ہی وہ ایک دم سے گھبرا کر اسے اپنی بانہوں میں لیتے ہوئے چپ کرانے کی کوشش کرنے لگی۔ عین اسی پل مولوی عبد اللہ صاحب گھر میں داخل ہوئے تھے۔

"اٹھ گئیں بیٹی......؟"

"جی بابا، یہ یہ بچی مجھ سے چپ نہیں ہو رہی۔" بانہوں میں بلکتی بچی کو ان کے سپرد کرتے ہوئے اس نے گھبرا کر کہا تو وہ اس کی معصومیت پر دھیمے سے مسکرا دیئے۔

"تو، تم یہ کھانا برتن میں نکالو، تب تک میں اس کا فیڈر بنا لیتا ہوں۔" گرم گرم تندوری روٹیوں اور دال کا شاپر اس کے حوالے کرتے ہوئے انہوں نے اپنے مخصوص پر شفیق لہجے میں کہا اور پھر باہر صحن میں رکھے صاف فیڈر میں دودھ اور چینی ایک ساتھ ڈال کر، تھوڑا سا ہلانے کے بعد نپل بچی کے منہ میں ڈال دیا تو وہ فوراً خاموش ہو گئی۔

"بابا...... اس بچی کی ماں کہاں ہے......؟" وہ پوچھنا نہیں چاہتی تھی مگر پوچھ بیٹھی تھی، جواب میں مولوی صاحب اس کے سوال کو قطعی نظر انداز کرتے ہوئے بولے۔

"کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے بیٹی، زوہیب بھی آتا ہی ہوگا، تب تک تم بھی منہ ہاتھ دھو لو۔"

وہ سمجھ گئی تھی کہ مولوی صاحب فی الحال اپنے ذاتی معاملات اس سے شیئر کرنا نہیں چاہتے۔ لہٰذا خاموشی سے منہ ہاتھ دھونے کے لیے اٹھ گئی۔ بڑے سے صحن میں، غسل خانے کے قریب لگے ہینڈ پمپ سے بڑا ٹھنڈا پانی نکل رہا تھا، لہٰذا اس نے خوب مسل مسل کر چہرے

کے ساتھ ساتھ ہاتھوں اور پاؤں کو بھی دھویا تھا۔ اسی پل گھر میں زوہیب علی حسن کی آمد ہوئی تھی۔ نور العین کو نلکے کے قریب کھڑے دیکھ کر اس کے چہرے پر ناگواری کی ایک واضح لہر دکھائی دی تھی۔ لہٰذا وہ فوراً اندر کمرے میں چلی آئی تھی۔

بابا اس کے لیے صاف ستھرے برتن میں کھانا نکال چکے تھے۔ گرم گرم تندروی روٹیوں اور دال کی خوشبو نے اس کی بھوک کو مزید بڑھا دیا تھا۔

وہ کھانا کھانے بابا کے ساتھ بیٹھی، تو زوہیب بھی کمرے میں چلا آیا۔ پچھلے پچیس سالوں سے وہ دونوں باپ بیٹا ایک ساتھ کھانا کھاتے آرہے تھے۔ لہٰذا بابا نے اس وقت بھی اپنی پلیٹ اس کی طرف بڑھائی، تو وہ فوراً اسے پیچھے کھسکا کر قدرے برہمی سے بولا۔

''مجھے علیحدہ پلیٹ میں ڈال دیں، راہ چلتوں کے ساتھ کھانا میری فطرت نہیں ہے۔''

نور العین اس کے لہجے میں اپنے لیے چھپی نفرت بخوبی محسوس کرسکتی تھی۔ تب ہی نوالہ جیسے اس کے حلق میں پھنس کر رہ گیا۔

''ہونہہ رات کے اندھیرے میں، باپ کے گھر کی اونچی دیواریں پھلانگتے وقت تو ان کو کوئی تکلیف نہیں ہوتی، بعد میں مظلومیت کا لبادہ اوڑھ لیتی ہیں، میرا بس چلے تو ایسی اوباش لڑکیوں کو سرعام گولی ماردوں، جو اپنی عیاشی کے لئے، اپنے پیچھے رہ جانے والوں کی زندگی کے متعلق سوچنا بھی گوارا نہیں کرتیں۔''

مسلسل بڑبڑاتے ہوئے وہ زہر اگل رہا تھا، جب کہ وہ چپ چاپ خاموشی سے اس کی گل افشانیاں سن رہی تھی۔ بڑی بڑی غزالی آنکھیں لمحوں میں آنسوؤں سے بھر آئی تھیں۔ پیاس کی شدت سے حلق میں جیسے کانٹے اگ آئے تھے۔ تب ہی اس نے بابا عبداللہ کو کہتے ہوئے سنا تھا۔

''تم حد سے بڑھ رہے ہو زوہیب، میں تمہیں اس بچی کا دل دکھانے کی اجازت ہرگز نہیں دوں گا۔''

''میں آپ سے بدتمیزی نہیں کررہا بابا، مگر آپ کی ہر ایک سے ہمدردی کی یہ عادت بھی مجھے پسند نہیں ہے ہونہہ، ہمارے گھر میں تو پہلے ہی کچھ نہیں، اوپر سے یہ لمبا ہاتھ دکھا گئیں تو کیا کریں گے آپ؟ آپ کی یہ نیکیاں اور ہمدردیاں ہمارا پیٹ نہیں بھردیں گی۔''

''اپنے رف حلیئے کی مانند وہ خود بھی خاصا بکھرا ہوا دکھائی دے رہا تھا، تاہم نور العین کی آنکھیں اس درجہ اہانت پر سرخ ہوکر رہ گئیں۔

''اللہ سب کا واحد کفیل ہے بیٹے، ہم کون ہوتے ہیں کسی کو کچھ کھلانے والے، بے شک اللہ اپنی مخلوق کا پیٹ خود بھرتا ہے، وہی سب کا نگہبان ہے، ساری دنیا اس کا کنبہ ہے۔''

ہمیشہ کی طرح مولوی عبداللہ صاحب نے اسے سمجھانے کی کوشش کی تھی، جواب میں وہ پھر سے شدید برہم ہوکر رہ گیا۔

''اس کے باوجود بھی، زندگی بھر آپ کچھ حاصل نہیں کرسکے، لہٰذا میرے سامنے اس قسم کی باتیں مت کیا کریں آپ...... ہونہہ سوائے کھوکھلے پن کے اس ملک میں اور کچھ بھی نہیں، پتہ نہیں وہ کون سی منحوس گھڑی تھی جب پاکستان کا تصور لوگوں کے ذہنوں میں آیا تھا۔''

سر جھٹکتے ہوئے اس نے اپنے اندر کی کڑواہٹ نکالی، تو بابا عبداللہ اس سے پوچھے بغیر نہ رہ سکے۔

''کیا آج پھر کہیں بات نہیں بنی......؟''

''اس ملک میں کبھی کسی کی بات نہیں بن سکتی بابا، ایم اے کرو یا ایم بی بی ایس، کوئی نہیں پوچھتا باعزت ملازمتیں اس ملک کے نوجوانوں کا نصیب نہیں ہیں۔ اس ملک کے نوجوان غربت سے اکتا کر ہاتھ میں ہتھیار اٹھا کر، جعلی پولیس مقابلوں میں مرسکتے ہیں، یا ملک سے باہر جاکر، ذلت بھری زندگی کا طوق گلے میں پہن سکتے ہیں۔ مگر ان کی کہیں بات نہیں بن سکتی۔ پتہ نہیں کیوں بنایا گیا تھا یہ ملک......؟ قائد نے اگر حسین خواب دیکھے تھے تو ان کو تعبیر بخش کر بھی جاتے، کیوں اس ملک کے پاؤں پر کھڑے ہونے سے قبل ہی آنکھیں بند کرلیں انہوں نے؟''

وہ اب بھی بلند آواز میں دل کی بھڑاس نکال رہا تھا، مگر اب موضوع گفتگو نور العین کی ذات نہیں تھی۔

''تم خاموشی سے کھانا کھاؤ بیٹے، بعد میں اس موضوع پر بات کریں گے۔'' بابا عبداللہ نے اسے ٹھنڈا کرنا چاہا تھا، جب وہ پھر سے برہم لہجے میں بولا۔

''کیا بات کریں گے بابا؟ بات کرنے لائق اب کچھ بھی نہیں رہا ہے، روز روز کی ذلالت سے تو بہتر ہے میں بھی خودکشی ہی کرلوں، کیونکہ اس ملک کے ناخداؤں کو ایک غریب کی زندگی کی اذیت کا احساس کبھی نہیں ہوسکتا۔'' وہ محض خود سے ہی نہیں، سب سے خفا دکھائی دے رہا تھا، نور العین کی بھوک اڑ چکی تھی، لہٰذا اس نے خاموشی سے اپنا ہاتھ کھانے سے کھینچ لیا تھا۔

''تمہارا ایم اے کا رزلٹ کب آرہا ہے بیٹے؟'' بابا اس کا ذہن بٹانا چاہتے تھے، تب ہی مشفق لہجے میں پوچھا تو تو اس نے دھیرے سے سر جھٹکتے ہوئے جواب دیا۔

''مجھے اب اپنے رزلٹ سے کوئی دلچسپی نہیں رہی ہے بابا، ویسے بھی خدا چاہے کتنی ہی

ذہانت سے نواز دے ہم رات بھر جاگ کر لیمپ کی روشنی میں پڑھنے والے، حکمرانوں کی اولاد کی مانند، قیمتی ترین تعلیم حاصل کر کے عیش کرنے والوں میں کبھی شامل نہیں ہو سکتے، لیمپ کی روشنی میں پڑھنے والے ذہنوں کی قدر تو کوئی لیمپ کی روشنی میں خود پڑھنے والا ہی کر سکتا ہے، مگر افسوس، کہ اب ان کا ساتھ ہمارا نصیب نہیں ہے۔'' زوہیب علی حسن کے ایک ایک لفظ سے ٹپکتی مایوسی نے، نور العین کے دل کو خاصا دکھ پہنچایا۔ مگر فی الحال وہ اس کا دکھ بٹانے کی پوزیشن میں نہیں تھی، لہٰذا خاموش بیٹھی ان دونوں باپ بیٹے کی باتیں سنتی رہی تھی۔

وہ ہمیشہ مردوں سے شدید خائف رہی تھی، مگر زندگی میں پہلی بار، مرد ذات کا ایک منفرد روپ اس کے سامنے آیا تھا۔ کتنی عجیب بات تھی کہ اس روز وہ بہت دیر تلک زوہیب علی حسن کے متعلق سوچتی رہی تھی۔ بابا نے زوہیب کی طرف سے اس سے معذرت کر لی تھی۔ وہ معذرت نہ بھی کرتے تب بھی وہ ان کا در چھوڑ کر جانے والی نہیں تھی، کیونکہ اب اس در کے علاوہ دنیا میں اس کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔

بابا کے کہنے کے عین مطابق، ان کا محلہ بہت مختصر سا تھا، البتہ کچھ فاصلے پر اچھے اور شاندار گھر بنے ہوئے دکھائی دیتے تھے، خود بابا کا چھوٹا سا گھر، جو ایک کمرے، ایک برآمدے، ایک چھوٹے سے کچن اور غسل خانے پر مشتمل تھا۔ دیکھنے میں اتنا بڑا دکھائی نہیں دیتا تھا، بس اس پر تھوڑی سی توجہ کی ضرورت تھی، ایک عرصے سے کسی صنف نازک کی عدم موجودگی نے گھر کی حالت خاصی ابتر بنا رکھی تھی۔ کہیں بھی کوئی چیز اپنے ٹھکانے پر موجود نہیں تھی۔

لہٰذا اگلے روز صبح اس کی آنکھ کھلی تو زوہیب اور بابا کے گھر سے نکلتے ہی وہ مکمل تن دہی سے کام میں جت گئی، دل نے مان لیا تھا کہ جب یہی جائے پناہ ہے تو کیوں نہ اسے واقعی ایک صاف ستھرے گھر کی شکل دی جائے۔ دوپہر کے قریب کہیں جا کر صفائی ستھرائی سے فارغ ہوئی تو زوہیب اور بابا عبداللہ کے میلے کپڑے لے کر بیٹھ گئی، پورا گھر شیشے کی مانند چمک رہا تھا۔ ننھی یمنیٰ کو اس نے دودھ پلا کر سلا دیا تھا۔ کام کے چکر میں اس نے اپنا ناشتہ بھی گول کر دیا تھا۔ ظہر کے وقت کہیں جا کر وہ تمام کاموں سے فارغ ہوئی تو ظہر کی نماز کے لیے کھڑی ہو گئی۔ نماز سے فارغ ہوئی تو بابا عبداللہ دوپہر کا کھانا، رحمت بی کے تندور سے لے کر گھر چلے آئے مگر گھر کی دہلیز پر قدم رکھتے ہی ٹھٹک کر رک گئے۔ گھر کے بدلے ہوئے نقشے نے انہیں از حد حیران کر دیا تھا۔ نور العین کی نگاہ جوں ہی ان کی طرف اٹھی۔ اس کے لبوں پر دھیمی سی مسکان بکھر گئی۔

''آیئے نا بابا، یہ آپ ہی کا گھر ہے......''

''وہ تو ٹھیک ہے پر تم نے یہ سب کیا، کیا ہے......؟'' وہ واقعی بے حد خوش دکھائی دے رہے تھے۔

''بیٹیاں، گھروں کو سنوارتی ہیں بابا، سو میں نے بھی کچھ صفائی ستھرائی کر لی، آج سے تمام فضول اخراجات ختم، کھانا بھی گھر پکا کرے گا، کپڑے بھی یہیں دھلیں گے اور پریس بھی میں ہی کر کے دیا کروں گی، اس سے جو پیسے بچیں گے، ان پیسوں کا ہم ماہانہ راشن خرید لائیں گے، ٹھیک ہے ناں بابا؟''

اس کے لہجے میں دبی دبی خوشی چھلک رہی تھی۔ جواب میں بابا عبداللہ کا دایاں ہاتھ اس کے سر پر ٹک گیا۔

''نہیں بیٹے، جیسا نظام چل رہا ہے ویسا ہی چلنے دو، میری بیٹی کا وجود مجھ پر بھاری نہیں ہے۔''

نور محسوس کر سکتی تھی کہ ان کے لہجے میں ہلکی سی نمی کا عنصر غالب تھا۔ تب ہی شاید وہ مصنوعی خفگی سے بولی۔

''کیا آپ مجھے اپنی سگی بیٹی نہیں سمجھتے، کیا اس گھر پر میرا کوئی حق نہیں ہے بابا، کیا میں آپ لوگوں کے لیے کچھ نہیں کر سکتی؟''

''اگر مگر کچھ نہیں بابا، عورت کو اللہ تعالیٰ نے کام کرنے کے لیے پیدا کیا ہے، لہٰذا مجھے بھی اپنے گھر کے لیے کام کر کے خوشی ہو گی، جو احسان آپ نے مجھ پر کیا ہے، میں اس کا بدلہ تو نہیں دے سکتی، پر ایک اچھی بیٹی بن کر، آپ کے کچھ مسائل ضرور حل کر سکتی ہوں، خدا کے لیے مجھے اس خوشی سے محروم مت کریں بابا، پلیز۔''

بابا عبداللہ کے ہاتھ تھام کر اس نے کچھ ایسے التجا بھرے لہجے میں کہا کہ وہ چاہ کر بھی اس کا مان نہ توڑ سکے۔

''اچھا بابا، جیسی تمہاری مرضی، جو دل میں آئے کرو، میں اب کچھ نہیں کہوں گا۔''

''شکریہ بابا۔''

اس وقت اسے حقیقی معنوں میں بہت خوشی ہوئی تھی۔ تب ہی وہ ان کے ہاتھ چوم کر آنکھوں سے لگا گئی تو بابا عبداللہ کی آنکھیں بھی جیسے بھر آئیں۔

''یہ کیا بابا، آپ کی آنکھوں میں آنسو......؟'' ایک لمحے کے لیے سر اٹھا کر اس نے ان کی طرف دیکھا تھا۔ جواب میں وہ فوراً آنسو پونچھ کر دھیمے سے مسکرا دیئے۔

''نہیں بیٹے...... یہ آنسو تو کسی کی یاد بن کر ان آنکھوں سے چھلک پڑتے ہیں۔''

''کس کی یاد بابا......؟ آپ کی بیگم کی......؟''

''نہیں ...... خیر تم چھوڑو ان باتوں کو، لو یہ کھانا برتن میں نکال لو، آج تو بہت بھوک لگی ہے۔'' بابا عبد اللہ نے فوراً اپنی بات کا رخ تبدیل کر دیا تو نور نے بھی انہیں کریدنا کچھ مناسب نہیں سمجھا۔ آج دوپہر کے کھانے پر زوہیب گھر نہیں آیا تھا۔ لہٰذا وہ مولوی عبد اللہ سے اس کے متعلق پوچھ بیٹھی۔

''بابا! آج زوہیب گھر نہیں آئے، کہیں وہ میری وجہ سے تو ......''

''نہیں بیٹی، آج وہ شہر سے باہر ایک فرم میں انٹرویو دینے گیا ہے، شام تک آئے گا۔'' بابا عبداللہ نے فوراً اس کے خدشے کی نفی کی تھی۔

''بابا! آپ تو اتنے اچھے ہیں، بے حد مشفق اور مہربان، پھر زوہیب صاحب ایسے کیوں ہیں؟ میرا مطلب ہے، اس درجہ تلخ مزاج اور غصیلے......؟''

نور کے سوال پر چند لمحے وہ خاموش رہے تھے پھر ہاتھ میں پکڑا نوالہ دوبارہ چنگیر میں رکھتے ہوئے بولے۔

''وہ دل کا برا نہیں ہے بیٹی، آج سے چند سال پہلے تو زبان کا برا بھی نہیں تھا، اسکول، کالج ہر جگہ ہر دلعزیز تھا۔ پورا محلہ میرے زوہیب کی شرافت اور زندہ دلی کا گواہ ہے۔ بچپن سے ہی ماں کی گود سے محرومی بھی اس کے مزاج پر اثر انداز نہیں ہوسکی، روتوں کو ہنسا دینے والی فطرت پائی تھی میرے بیٹے نے۔ مگر زندگی نے یکلخت ہی اس کا مزاج بدل ڈالا، پے در پے لگے زخموں نے، اس کے اندر تلخیوں کو بھر دیا بیٹی۔'' اب کے بابا عبد اللہ کا لہجہ قدرے اداس تھا، نور مکمل توجہ کے ساتھ انہیں سن رہی تھی۔

''آج سے تین سال پہلے، تمہاری طرح ایک لڑکی گھر سے بھاگ کر یہاں پہنچی تھی۔ پڑھی لکھی خوب صورت بچی تھی، پر اس کے گھر والے اس کی شادی، اس کی مرضی کے خلاف کہیں کر رہے تھے، میری اس بچی کے باپ سے دور کی سلام دعا تھی، لہٰذا گھر سے بھاگ کر وہ بچی سیدھی میرے پاس ہی چلی آئی۔ میں نے ہر ممکن طریقے سے اسے سمجھانے کی کوشش کر ڈالی مگر وہ کسی طرح سے گھر واپس جانے کو رضا مند نہ ہوئی، مجبوراً مجھے اس بچی کو اس گھر میں پناہ دینی پڑی۔ زوہیب ان دنوں ابھی کالج سے فارغ ہوا ہی تھا۔ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور شادی کا فیصلہ کرلیا۔ بچی میری دیکھی بھالی ضرور تھی مگر میں اس کے والدین کو، کوئی دکھ پہنچانا نہیں چاہتا تھا، لہٰذا میں شادی کے لیے راضی نہ ہوا، بچی نے میرا انکار دیکھا تو مزید بضد ہوگئی کہ اگر زوہیب کے ساتھ اس کی شادی نہ ہوئی تو وہ خودکشی کر لے گی، یوں مجبوراً مجھے ان دونوں کی شادی کروانی پڑی، مگر شادی کے کچھ ہی عرصے کے بعد اس نے زوہیب کو تنگ کرنا شروع کر دیا، وہ اچھے گھر کی بچی تھی۔ زیادہ دیر تک غربت کو برداشت نہ

کرسکی، لہٰذا گھر میں روز جھگڑے ہونے لگے۔ میں ہر بار زوہیب کو سمجھاتا، یوں اس بچی کو مزید شہ ملتی گئی، محض اسے خوش رکھنے کے لیے زوہیب نے دن رات مزدوری کرنا شروع کر دی، بہت سے دن وہ مختلف دفتروں کی خاک چھانتا رہا مگر کسی جگہ اس کی قابلیت کو ٹھکانہ نہ مل سکا، وہ ہر بار پر امید ہوتا کامیاب انٹرویو دے کر آتا، مگر ملازمت کسی اور کی جھولی میں جا گرتی، مسلسل ناکامیوں اور گھریلو جھگڑوں نے، ذہنی طور پر اسے مفلوج کر کے رکھ دیا تھا، ان ہی دنوں ننھی یمنی کی پیدائش ہوئی تو گھریلو اخراجات مزید بڑھ گئے، ساتھ ہی بہو نے زوہیب بیٹے کو مزید تنگ کرنا شروع کر دیا، اب اسے اپنے ساتھ ساتھ بچی کے لئے بھی بہت کچھ چاہئے تھا، ادھر زوہیب کو جاب نہیں مل رہی تھی، گھر کی دال روٹی حسب معمول چل رہی تھی، مگر بہو کو یہ سب گوارا نہیں تھا۔ اس نے مجھے مشورہ دیا کہ میں امامت چھوڑ کر تعویذ گنڈوں کا کام شروع کر دوں، میں اس بچی کی نفسیات سمجھ کر بھی سمجھ نہیں پایا تھا بیٹی، لہٰذا خاموش تماشائی بنا سب دیکھتا رہا۔ کسی سے کہتا بھی تو کیا؟ میری نیکی میرے گلے آ پڑی تھی۔ مگر میں پھر بھی اللہ کی رضا پر راضی تھا، مجھے امید تھی کہ ایک دن ضرور اچھے دن آئیں گے، مگر وہ بچی اچھے دنوں کا مزید انتظار نہیں کرسکی، لہٰذا ایک روز اس نے بڑی بہادری کے ساتھ زوہیب بیٹے سے طلاق کا مطالبہ کر دیا۔ ساتھ ہی یہ دھمکی بھی دی کہ اگر زوہیب نے اسے فوراً طلاق نہیں دی تو وہ تھانے میں جا کر اس کے خلاف رپورٹ درج کروا دے گی۔ سب کو بتا دے گی کہ یہاں اسے زبردستی قید میں رکھا جا رہا ہے، اس پر بے جا ظلم کئے جا رہے ہیں، مرد آخر مرد ہوتا ہے بیٹی، زوہیب اس کی یہ باتیں مزید برداشت نہ کرسکا اور اس نے فوراً طلاق دے کر، اسے گھر سے رخصت کر دیا۔ یہ سب غلط ہوا یا صحیح، میں نہیں جانتا، پر اتنا ضرور جانتا ہوں کہ اس سانحے کے بعد میرا زوہیب سر سے پیر تک بدل گیا، مسکراہٹیں تو جیسے اس کے ہونٹوں سے روٹھ ہی چکی ہیں بیٹی۔''

طویل روداد سنانے کے بعد بابا عبد اللہ نے سرد آہ بھری تو نور العین کے وجود میں بھی حرکت ہوئی، بابا عبد اللہ کی معرفت زوہیب کی کہانی سن کر اسے خاصا افسوس ہوا تھا، مگر فی الحال وہ اس جنونی شخص سے مڈبھیڑ کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھی، سو خاموش بیٹھی جانے کیا کیا سوچتی رہی۔

شام کو وہ تھکا ہارا گھر واپس آیا تو نور روٹیاں پکا رہی تھی۔ جب کہ بابا اس کے قریب ہی چارپائی پر بیٹھے، ننھی یمنی کو کھلا رہے تھے۔ ایک مدت کے بعد اس نے کسی عورت کو اس گھر میں روٹیاں پکاتے ہوئے دیکھا تھا۔ کیونکہ اس کی اپنی بیوی نے بھی، کبھی اسے ایک وقت بھی خود سے کچھ پکا کر نہیں کھلایا تھا، کبھی ہاتھوں میں درد، کبھی کمر میں، تو کبھی سر میں، روز ایک نیا

بہانہ وہ تیار رکھتی تھی، مجبوراً زوہیب کو کھانا باہر سے لانا پڑتا۔ البتہ اس کے جانے کے بعد کھانا لانے کی ذمے داری بابا عبداللہ نے سنبھال لی تھی، تاہم اس وقت آنکھوں نے جو نظارہ دیکھا تھا، وہ اسے حیران کردینے کو کافی تھا۔

''بابا! یہ سب کیا ہو رہا ہے......؟ یہ...... یہ لڑکی اسی طرح چالاکی سے ہمارے پورے گھر پر قبضہ کرلے گی۔'' جانے کس سوچ کے تحت وہ فوراً لپک کر آگے بڑھا تھا۔ جواب میں بابا عبداللہ نے قدرے چونک کر مسکراتے ہوئے اس کی طرف دیکھا تھا۔

''ہمارے گھر میں سوائے ہم دونوں کے اور ہے ہی کیا بیٹے، جو یہ بچی لے جائے گی، نظر اٹھا کر دیکھو، کیا تمہیں نہیں لگتا کہ ایک مدت کے بعد ہمارا گھر، واقعی ایک گھر کی صورت میں واپس آیا ہے۔''

بابا عبداللہ کی بات سے انکار ممکن نہیں تھا، لہٰذا وہ خاموشی سے سر جھٹکتے ہوئے وہیں بیٹھ گیا۔

''سناؤ بیٹے، آج کا انٹرویو کیسا ہوا......؟'' ننھی یمنیٰ ان کی گود میں کھیل رہی تھی، جب انہوں نے زوہیب کے تھکے تھکے سے چہرے پر ایک نظر ڈالتے ہوئے پوچھا جواب میں وہ برہمی سے رخ پھیر کر قدرے تلخ لہجے میں بولا۔

''انٹرویو تو سب ہی اچھے ہوتے ہیں بابا، بس یہ نصیب ہے جو اچھا نہیں ہو رہا...... پتہ نہیں کیا بنے گا اس ملک کا، آپ یہ دیکھیں بابا کہ انٹرویو کا ٹائم صبح گیارہ بجے کا تھا، مگر اسٹارٹنگ دوپہر ایک بجے کے قریب ہوئی، میرے علاوہ وہاں کوئی پچاس لڑکے تھے، جو نہ جانے کیسے کیسے خواب آنکھوں میں بسائے وہاں خوار ہو رہے تھے۔ ہر کوئی اپنی اپنی مجبوریوں کی زنجیر میں بندھا ہوا تھا، کسی کی جوان بہنیں دہلیز پر بیٹھی ہیں تو کسی کا باپ سر پر نہیں رہا، کوئی گھر کا واحد کفیل ہے تو کسی کی ماں بیماری سے ہار کر مر رہی ہے، سچ کہتا ہوں بابا، اپنے ملک کی یہ بدحالی دیکھ دیکھ کر میرا دل اچاٹ ہو گیا ہے۔ مخملی بستروں میں چین کی نیند سونے والے کبھی فٹ پاتھوں پر سوئے لوگوں کا درد نہیں جان سکتے، ہر حکومت بڑے بڑے دعوے کرتی ہے مگر ہوتا کیا ہے بابا؟ جب بھی اس کا تختہ الٹتا ہے، اس کی لوٹ کھسوٹ کی کہانی زبان زد عام ہو جاتی ہے، اگر یہی سب کچھ ہونا تھا تو کیا فائدہ علیحدہ مملکت بنانے کا؟ اس سے تو بہتر تھا پاکستان کبھی وجود میں آتا ہی نہیں، کم از کم یہ حالات تو نہ دیکھنے پڑتے آج......''

تلخی کے ساتھ اس کے لہجے میں گہری آزردگی تھی۔ تب ہی نورالعین نے بابا کو تڑپ کر کہتے ہوئے سنا تھا۔

''نہ بیٹے، آئندہ ایسی بات کبھی منہ سے مت نکالنا، ماں چاہے جیسی بھی ہو، اپنے بچوں

کی محافظ ہوتی ہے۔ بدقسمتی سے ہمیں کبھی صالح قیادت نصیب نہیں ہو سکی تو کیا ہوا، ہماری اپنی علیحدہ پہچان تو ہے، ہم اپنی مرضی سے، اپنے ملک میں سانس تو لے سکتے ہیں، تم نے وہ حالات نہیں دیکھے، مگر میری آنکھیں وہ دن کبھی فراموش نہیں کرسکیں گی، جو خون میں ڈوب کر طلوع ہوتے تھے۔'' آپ ہی آپ ان کا لہجہ قدرے مدھم ہو گیا تھا۔ جب وہ قدرے اکتا کر بولا۔

''مجھے آپ کی ان کہانیوں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے بابا، بس میں آئندہ کبھی کسی جگہ انٹرویو دینے نہیں جاؤں گا، پہلے بھی مزدوری کرتا تھا، اب بھی مزدوری ہی کروں گا۔'' یہ کہنے کے ساتھ ہی وہ اٹھ کر [illegible] کے لیے چلا گیا تو بابا عبداللہ کی آنکھیں کچھ یاد کرکے، ایک لمحے میں بھیگ گئیں۔

☆......☆......☆

''عبداللہ! کل بابا محمد علی جناح کے جلسے میں گئے تھے، بتا رہے تھے کہ مسلمانوں نے اپنے علیحدہ وطن کا نام بھی منتخب کرلیا ہے، ''پاکستان'' کتنا پیارا نام ہے ناں......؟ سچ عبداللہ، میری آنکھوں نے تو پاکستان کے حوالے سے بہت سارے خواب دیکھ ڈالے ہیں۔ کتنا اچھا لگے گا ناں، جب ساری دنیا ہمیں پاکستانی کہہ کر پکارے گی، کتنا مزا آئے گا اس سرزمین پر جہاں کوئی ہمیں ہمارے اللہ، اور اس کے پیارے رسول محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا نام لینے سے روکنے والا نہیں ہوگا، جہاں ہم اپنی مرضی سے اپنے تہوار خوشی خوشی منا سکیں گے جہاں مسجدوں کے اسپیکر، مکمل آزادی کے ساتھ، پانچ وقت بلند آواز میں اذان کے لیے گونجا کریں گے، جہاں ہمارے بچے، ہر طرح کے خوف اور دباؤ سے آزاد، صرف اور صرف اسلامی تعلیم حاصل کریں گے، جس کی ایک ایک چیز ہماری ہوگی۔''

پاکستان کے بارے میں بات کرتے کرتے وہ اکثر اس قدر جذباتی ہو جاتی تھی کہ اس کی آنکھیں پانیوں سے لبالب بھر آتیں۔ اس وقت بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ خوب صورت آنکھیں بھر آنے سے اور بھی حسین دکھائی دینے لگی تھیں۔

''عبداللہ...... کہیں ہمارا خواب ٹوٹ تو نہیں جائے گا۔ انگریز اور ہندو کہیں ہماری خواہشات کو کچل تو نہیں ڈالیں گے، بابا بتا رہے تھے کہ کچھ مسلمان رہنما بھی کانگریس کے ساتھ مل کر پاکستان کی مخالفت کرنے لگے ہیں۔ مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے عبداللہ، کہیں محمد علی جناح کے حوصلے کمزور تو نہیں پڑ جائیں گے۔ کہیں مسلمانوں کی آواز، دب تو نہیں جائے گی۔'' کپکپاتے لہجے میں خوف سے کہتی وہ اس کا مضبوط کندھا جھنجھوڑ گئی تھی۔ جب اس نے مضبوط لہجے میں کہا۔

''ایسا نہیں ہوگا مریم، مسلمانوں کے حوصلے بہت بلند ہیں، اس بار وہ کسی قربانی سے دریغ نہیں کریں گے۔ تم دیکھنا، خون کا انقلاب آئے گا، اور ایک نئی صبح کا سورج طلوع ہو کر رہے گا مریم، ہمیں ہمارا حق حاصل کرنے سے اب کوئی نہیں روک سکتا۔''

''بابا..... کہاں کھو گئے آپ.....؟ روٹی ٹھنڈی ہو رہی ہے.....''

یادوں کے گرداب میں جانے وہ ابھی کتنی دیر تک الجھے رہتے کہ اچانک نور العین کی پکار نے، انہیں حال میں واپس کھینچ لیا، زوہیب منہ ہاتھ دھونے کے بعد ان کے پاس ہی چارپائی پر آ بیٹھا تھا۔

''آئی ایم سوری بابا، میں نے آپ کو رلا دیا لیکن میں کیا کروں...... مجھ سے یہ سب کچھ برداشت نہیں ہوتا، یہاں پسینہ کوئی بہاتا ہے اور عیش کسی کو ملتا ہے، آخر کیوں نہیں، کوئی اس ملک کے بارے میں سوچتا کیوں سب اس کا تشخص مٹانے پر تلے ہوئے ہیں؟ جب یہ دیس اپنا ہے، یہ گھر اپنا ہے، تو ہم پرائے کیوں ہوگئے ہیں بابا، آخر ہم کس سے بدلہ لے رہے ہیں، کس کا نقصان کر رہے ہیں بابا.....؟''

اس کے دل کی بھڑاس ابھی مکمل طور پر باہر نہیں نکلی تھی، سو نور العین اور بابا عبداللہ، خاموشی سے اس کی بڑبڑاہٹ سنتے رہے بے شک وہ جو کچھ کہہ رہا تھا سو فیصد درست تھا۔

زندگی نور العین کے لئے ایک دم سے بے حد مہربان ہو کر رہ گئی تھی۔ دن بھر وہ خود کو گھر کے چھوٹے موٹے کاموں میں مصروف رکھتی، پھر کچھ وقت ننھی یمنیٰ کے ساتھ گزارتی، دوپہر کے قریب اسے نہلا کر سلا دیتی اور خود کھانا بنانے لگ جاتی، تب تک ظہر کی نماز کا وقت ہو جاتا، وہ نماز سے فارغ ہوتی تو زوہیب اور بابا گھر چلے آتے، تینوں مل کر دوپہر کا کھانا کھاتے، کھانا کھانے کے بعد بابا پھر مسجد چلے جاتے، جب کہ زوہیب بھی گھر سے نکل جاتا، تب وہ ننھی گڑیا کو ساتھ لٹا کر خود بھی سو جاتی۔

اس روز بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ زوہیب کسی وجہ سے دوپہر کے کھانے کے لیے نہیں آ سکا تھا۔ لہٰذا اس نے اور بابا نے اکٹھے کھانا کھایا، پھر بابا مسجد چلے گئے تو وہ گڑیا کو ساتھ لے کر لیٹ گئی۔ چونکہ دن بھر کی تھکن تھی، لہٰذا لیٹتے ہی نیند آ گئی۔ بابا جاتے ہوئے دروازہ باہر سے ہی بند کر جاتے تھے، تب ہی زوہیب کام سے واپس آیا، تو خود ہی دروازہ کھول کر اندر چلا آیا۔ مگر کمرے کی دہلیز پر قدم رکھتے ہی ٹھٹک کر رہ گیا۔ سامنے ہی چارپائی پر نور العین دوپٹے سے بے نیاز بیٹھی نیند میں ڈوبی سو رہی تھی۔ اس کے لمبے بالوں کی چٹیا، سینے سے ہوتے ہوئے چارپائی سے نیچے لٹک رہی تھی جب کہ اس کی بیٹی، اس سے یوں لپٹ کر سو رہی تھی گویا وہی اس کی حقیقی ماں ہو، پچھلے پندرہ دنوں سے اسے اپنی بیٹی کا کوئی ہوش ہی نہیں

تھا۔ وہ کب دودھ پیتی ہے، کب سوتی ہے، کون اسے سنبھالتا ہے، کون نہلا کر کپڑے بدلواتا ہے، اسے جیسے پرواہ ہی نہیں رہی تھی۔ آج اپنی بیٹی کو نور العین سے لپٹ کر سوتے دیکھا تو اسے یاد آیا تھا کہ اس کی ایک بیٹی بھی ہے، جسے بدقسمتی سے کبھی سگی ماں نے بھی سینے سے لگا کر سلانے کی زحمت گوارا نہیں کی تھی۔ جانے کتنی دیر تک بے خودی کے عالم میں، وہ اسے سوتے ہوئے دیکھتا رہا، پھر ان ہی قدموں واپس پلٹ کر، کھانا کھائے بغیر، گھر سے باہر نکل گیا۔

پھر شام ڈھلے وہ گھر واپس لوٹا، تو اس کے ہاتھ میں چند لیڈیز سوٹ والا شاپر تھا، نور العین، حسب معمول آٹا گوندھ کر روٹی پکانے کی تیاری کر رہی تھی، جب وہ تھکے تھکے سے قدم اٹھاتا، دھلے ہوئے صحن میں، پڑی چارپائی پر آ بیٹھا۔

''آج آپ دوپہر میں نہیں آئے، خیریت تو تھی ناں.....؟'' پہلی بار وہ اس سے براہِ راست مخاطب ہوئی تھی۔ لہٰذا زوہیب علی حسن کا چونک جانا لازم تھا۔

''بابا، آپ کے لیے فکر مند ہو رہے تھے۔ اس لیے پوچھ رہی ہوں۔'' اس کی غلافی نگاہیں خود پر مرکوز پا کر اس نے فوراً وضاحت پیش کی تھی، جواب میں وہ ذرا سا رخ پھیرتے ہوئے قدرے بے نیازی سے بولا۔

''ہاں کچھ کام زیادہ تھا۔ اس لیے دیر ہوگئی، آج کیا پکایا ہے تم نے.....؟''

''گوشت پالک، بابا بتا رہے تھے کہ آپ کو بہت پسند ہے، اس لیے میں نے خوب دل لگا کر پکایا ہے، آج آپ میرے ہاتھ کا بنا کھانا کھائیں گے تو ساری عمر یاد رکھیں گے۔''

پہلی بار اس نے اس سے نرمی سے بات کی تھی، لہٰذا مارے خوشی کے اس کا حال دیکھنے کے لائق ہوگیا تھا۔ تاہم اگلے ہی پل یہ خوشی فوراً کافور ہوگئی، جب اس نے کھردرے لہجے میں پوچھا۔

''تم یہاں سے رخصت کب ہو رہی ہو.....؟''

نور العین نے اس کے سوال کا کوئی جواب نہیں دیا تھا کچھ دیر پہلے دمکتے چہرے پر پھر سے یاسیت چھا گئی تھی۔ لہٰذا وہ رخ پھیر کر روٹی بیلنے لگی تو زوہیب نے بھی اپنا سوال دوبارہ دہرانا مناسب نہیں سمجھا۔

''یہ کچھ سوٹ لایا ہوں تمہارے لیے، اٹھا کر رکھ دو انہیں۔''

کچھ ہی لمحوں کے بعد اپنی بیٹی کے ساتھ کھیلتے ہوئے اس نے کہا تو نور العین پھر سے چونک اٹھی۔ عین اسی پل بابا نے گھر کی دہلیز پر قدم رکھا تھا۔ آج خلاف معمول وہ کچھ افسردہ اور چپ چپ سے تھے۔

"کیا بات ہے بابا، آپ کچھ پریشان دکھائی دے رہے ہیں......؟" اس سے پہلے کہ زوہیب ان کی اداسی کی وجہ دریافت کرتا، نورالعین نے ان سے پوچھ لیا، جواب میں وہ نہایت رنجور لہجے میں بولے۔

"کیا بتاؤں بیٹی، پتہ نہیں اس ملک کو کس کی نظر بد لگ گئی ہے کہ کہیں، کچھ بھی ٹھیک نہیں ہو رہا ہے۔"

"پھر بھی کچھ پتہ تو چلے، بتائیے ناں کیا ہوا ہے......؟" اب کے زوہیب نے اصرار کیا تھا، لہٰذا وہ سرد آہ بھرتے ہوئے آزردگی سے بولے۔

"جو کچھ ہو گیا ہے، دل اس پر یقین نہیں کر رہا ہے بیٹے، یہ ملک جو اللہ اور اس کے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے نام پر حاصل کیا گیا ہے، اسی اسلامی مملکت میں، پیارے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش مبارک کے مقدس دن، پر خون ریزی کا ایک نہایت المناک سانحہ برپا ہو گیا ہے بیٹے، آہستہ آہستہ اس ملک سے دین ختم کیا جا رہا ہے، اللہ اور اس کے پیارے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے نام لیوا، یا تو کثرت سے شہید ہو رہے ہیں یا انہیں زندان غیر کے سپرد کیا جا رہا ہے۔ میرا دل کٹ رہا ہے بیٹے، جانے کیوں آج مجھے وہ کروڑوں قربانیاں رائیگاں جاتی ہوئی محسوس ہو رہی ہیں جو قیام پاکستان کے لیے دی گئی تھیں۔"

ان کی آنکھوں کے ساتھ ساتھ ان کا لہجہ بھی قدرے بھرا گیا تو زوہیب پھر سے جذباتی ہو اٹھا۔

"دیکھا...... دیکھا، آپ نے...... یہ اسلامی مملکت ہے، مگر اسلام کو ماننے والے ہی یہاں محفوظ نہیں ہیں، اس ملک کے ناخداؤں نے کیا چوڑیاں پہن رکھی ہیں، جو آئے روز، ایسے المناک سانحات ہوتے رہتے ہیں۔ یہ تماشے آخر کب تک چلیں گے بابا، آخر کب تک بے گناہ عوام کی آنکھوں میں دھول جھونک کر، ان کا خون بہایا جاتا رہے گا؟"

بابا عبداللہ کے پاس اس کے سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔ لہٰذا وہ سر جھکا کے خاموش بیٹھے رہے، آج ایک مرتبہ پھر انہیں مریم یاد آئی تھی۔ سبک روی سے بہتی نہر کے کنارے بیٹھے، وہ دونوں پاکستان کے حوالے سے ڈھیروں خواب بن رہے تھے۔

"عبداللہ...... تمہیں پتہ ہے صوبہ پنجاب، سندھ، سرحد اور بلوچستان کے عوام نے پاکستان کے حق میں فیصلہ دے دیا ہے، ریاست جونا گڑھ، حیدرآباد دکن، اور آسام کی ریاستوں نے بھی پاکستان میں شامل ہونے کا فیصلہ کر لیا ہے، اب تو پاکستان بن کر ہی رہے گا۔"

ہمیشہ کی طرح اس کے لہجے میں دبی دبی خوشی بہت واضح تھی، تب ہی اس نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔

"ہاں ان شاء اللہ، اب ہماری منزل زیادہ دور نہیں ہے۔ ویسے تمہاری تو بہت ساری سہیلیاں یہاں رہتی ہیں مریم، تمہارا تو گھر بھی بہت خوب صورت اور بھرا پرا ہے، اور وہ املی اور عشق پیچاں کی بیل کے پودے، جنہیں روز بڑھتے ہوئے دیکھ کر، تم زندگی کا احساس پاتی ہو، کیا پاکستان کے لیے تم یہ سب چیزیں چھوڑ دو گی......؟ اور فرض کرو، اگر اس کشمکش میں، ہم ایک دوسرے سے بچھڑ گئے تو تم کیا کرو گی مریم...... کیا مجھے کھو کر اکیلی پاکستان چلی جاؤ گی۔"

اس کے سوال پر مریم کی خوب صورت آنکھیں فوراً آنسوؤں سے بھر آئی تھیں۔ کس قدر تڑپ کر اس نے عبداللہ کے چہرے کی طرف دیکھا تھا، جہاں سوائے شرارت کے اور کوئی رنگ نہیں تھا۔

"پاکستان میرا خواب ہے عبداللہ، میں اس کے لیے اپنا تن، من دھن سب خوشی قربان کر سکتی ہوں۔ میں جانتی ہوں یہ سب کرنا بہت مشکل ہے، پر میں یہ سب کچھ کروں گی عبداللہ، اپنی الگ پہچان کے لیے، چاہے مجھے اپنی جان ہی کیوں نہ قربان کرنی پڑے، میں کروں گی، لیکن...... تم سے بچھڑ کر نہیں عبداللہ، تم تو میرا حوصلہ ہو میری محبت ہو، تمہیں کھو کر، میں اکیلی کہیں نہیں جا سکتی۔"

عبداللہ کے مضبوط ہاتھ پر سر ٹکا کر وہ رو پڑی تھی، جب وہ آہستہ سے ہنس دیا۔

"چل پگلی، میں تو تیرے دل کی بات کر رہا تھا اور تو رو پڑی، بس اتنی ہی بہادری ہے تیری؟" اسے مزید چڑانے کو وہ بولا تو مریم نے فوراً اپنے آنسو پونچھ لئے۔

"عبداللہ...... یہ انگریز اور ہندو، ہمیں اتنی آسانی سے تو علیحدہ نہیں ہونے دیں گے، تو تو جانتا ہے ان کی ذہنیت کو، ان کے ظلموں کو، پتہ نہیں یہ ہمارے ساتھ کیا کریں گے، ماں بتا رہی تھی، کل چاچا افضل کے بچے اسکول گئے تو وہاں سینئر کلاس کے ہندو بچوں نے ان کے ساتھ ساتھ تمام مسلمان بچوں کے چہروں پر کالک لگا دی، ان کے بیگ چھین کر کتابیں پھاڑ ڈالیں، اور سارے اسکول میں ان کا مذاق اڑایا کہ یہ پاکستان بنائیں گے، الگ ملک میں جائیں گے۔ کسی نے ان بچوں کو نہیں ڈانٹا، سارے ہندو استاد کھڑے تماشا دیکھتے رہے، اور مسکراتے رہے۔ یہ لوگ کبھی ہمارے مخلص نہیں ہو سکتے عبداللہ۔"

"تم ٹھیک کہہ رہی ہو مریم...... پاکستان کے لیے ہجرت کا وقت آئے گا، تو یہ لوگ خاموش نہیں بیٹھیں گے، یہ ہمارے اڑوس پڑوس میں جتنے بھی ہندو خیر خواہ ہیں، اس وقت یہ

اپنا رنگ بدلتے دیر نہیں لگائیں گے الٹا یہ ہماری منزل کی راہ میں ہر ممکن طریقے سے روڑے اٹکائیں گے، ہمیں وقت سے قبل ہی کڑے حالات اور ان کی پیدا کردہ مشکلات کے لیے تیار رہنا ہوگا مریم۔''

''عبداللہ! جب ہم پاکستان چلے جائیں گے تو مجھے یہ بوڑھا برگد کا درخت جو ہماری پاکیزہ محبت کا گواہ ہے، بہت یاد آئے گا۔ ہم اپنے بچوں کو جب بھی پاکستان کی کہانی سنائیں گے تو اس برگد کے درخت کا تذکرہ ضرور کریں گے، ٹھیک ہے ناں؟'' اب کے مریم کی آواز میں جوش تھا، جواب میں عبداللہ نے مسکراتے ہوئے آہستہ سے اثبات میں سر ہلا دیا، مریم اس وقت سرخ شلوار سوٹ میں ملبوس تھی۔ جانے کس سوچ کے تحت اس نے اپنا آنچل پھاڑا، پھر دو علیحدہ علیحدہ کترنیں پھاڑ کر عبداللہ کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔

''یہ لو عبداللہ...... ان کترنوں کو اونچا کر کے اس درخت کی کسی شاخ پر باندھ دو، یہ کترنیں ہماری محبت کی علامت بن کر ہمیشہ اس درخت کے ساتھ بندھی رہیں گی۔''

جتنی عجیب وہ خود تھی، اتنی عجیب ہی اس کی محبت تھی، بہر حال عبداللہ نے اس کے حکم کی تعمیل میں قطعی دیر نہیں لگائی تھی۔ کتنی خوش تھی وہ اس روز، جانتی ہی نہیں تھی کہ ایک خواب کی تعبیر پانے کے بدلے، وہ اپنے بقیہ تمام خواب بکھیر بیٹھے گی، ایک مرتبہ پھر بابا عبداللہ کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر آئی تھیں۔

''آپ...... پھر رو رہے ہیں بابا۔''

نورالعین کی آواز نے ایک مرتبہ پھر انہیں یادوں کے جنگل سے نکال لیا تھا۔ شام کے دھندلکے اب رات کی تاریکی میں ڈھل رہے تھے۔ اس روز ان تینوں نے ہی رات کا کھانا نہیں کھایا تھا۔ اگلے روز خوب بارش ہوئی تھی۔ صبح سے لے کر رات گئے تک بارش کا سلسلہ جاری رہا تھا۔ بابا اور وہ تو، رات کمرے میں سو گئے تھے۔ مگر زوہیب ساری رات باہر صحن میں بارش میں بھیگتا رہا، نتیجتاً صبح بابا نے اسے کام پر جانے کے لیے اٹھایا تو اس کا پورا وجود تیز بخار میں جل رہا تھا۔

''نور...... نور بیٹی، دیکھ تو زیب کو کتنا تیز بخار چڑھ آیا ہے۔'' وہ ایسے ہی تھے ذرا سی تکلیف پر ازحد پریشان ہو جانے والے، تاہم نورالعین اپنے بستر سے نکل کر باہر صحن میں اس کی طرف آئی تو وہ واقعی بے سدھ پڑا تھا، پھر بھی وہ بابا کا حوصلہ بندھاتے ہوئے بولی۔

''آپ فکر مت کریں بابا، شاید رات بارش میں بھیگنے کی وجہ سے بخار چڑھ آیا ہے، کسی کی مانتے بھی تو نہیں ہیں یہ، بہر حال آپ سکون سے نماز پڑھ کر اس کے لیے دعا کریں، تب تک میں کسی بچے کو بھیج کر یہ نکڑ والے ڈاکٹر صاحب کا پتہ کروا لیتی ہوں۔''

اس کے تسلی دینے پر بابا کا حال کچھ بہتر ہوا تھا۔ وہ گھر سے نماز کے لیے نکلے تو نورالعین نے زوہیب کو زبردستی باہر صحن سے کھڑا کر کے اندر کمرے میں بابا کے بستر پر لٹا دیا۔ وہ نماز سے فارغ ہوئی پھر محلے کے کسی بچے کو بھیج کر گلی کی نکڑ والے ڈاکٹر کو ان کے گھر سے بلوا لیا۔ ڈاکٹر نے آ کر ضروری چیک اپ کے بعد کچھ دوائیوں کے نام لکھ دیئے اور اپنی فیس بٹور کر چلتے بنے۔ تب نورالعین نے گھریلو اشیا کی خریداری کے لیے رکھے پیسوں سے زوہیب کے لیے دوائیاں منگوائیں، اور گرم گرم چائے بنا کر، کیک بسکٹ وغیرہ کے ساتھ زوہیب کے پاس چلی آئی۔ جو آنکھوں پر بازو رکھے، چت لیٹا، نہ جانے کن سوچوں میں گم تھا۔

''زیب...... یہ ناشتہ کر لیں پلیز، پھر میں آپ کو دوا کھلا دیتی ہوں۔'' ڈرتے ڈرتے اس نے کہا تھا، جواب میں وہ اسی پوزیشن میں لیٹا تلخ لہجے میں بولا۔

''مجھے تمہاری تیمارداریوں کی ضرورت نہیں ہے۔ جاؤ تم یہاں سے۔''

''میرے ساتھ ایسے مت کرو زیب، پلیز۔'' وہ خود بھی نہیں جانتی تھی کہ اس وقت اس کی آنکھیں کیوں بھر آئی تھیں، تاہم اس کی ریکویسٹ پر زوہیب علی حسن نے آنکھوں سے بازو ہٹا کر، سرخ سرخ غلافی نگاہوں سے ایک نظر ضرور اسے دیکھا تھا۔

''آپ کو بہت تیز بخار ہے، یہ ناشتہ کر لیں پلیز۔'' اس کی سرخ نگاہیں خود پر مرکوز پا کر، کپکپاتے لہجے میں اس نے پھر التجا کی تھی، تب ہی وہ نگاہیں پھیر کر بولا۔

''او کے رکھ دو یہ سب یہاں۔''

''ابھی چائے پی لو، پھر ٹھنڈی ہو جائے گی۔''

''اف...... ایک تو یہ مصیبت مفت میں گلے پڑ گئی ہے، پتہ نہیں کب جان چھوٹے گی اس سے؟'' اب کے وہ سخت جھنجھلاتے ہوئے بستر پر اٹھ بیٹھا، تو نورالعین اسے چائے کا کپ تھما کر، یوں ہی مسکراتے ہوئے کمرے سے باہر نکل آئی۔

اس روز زیب نے دن بھر اسے کولہو کے بیل کی طرح کام کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ بظاہر وہ بابا کے ساتھ، باتوں میں مشغول ہوتا مگر اس کی نظریں، برابر نورالعین کے پھرتی سے چلتے ہاتھ پیروں پر تھیں۔ صبح کا ناشتہ بنانا، بچی کے لیے الگ سے دودھ گرم کر کے فیڈر بنانا، اس کی نیپیاں چینج کرنا، پورے گھر کی صفائی کے بعد پونچھا لگانا، برتن اور کپڑے دھونا، وہ تو بس شیدائیوں کی طرح اسے دیکھتا ہی رہ گیا تھا۔

''اب آپ کا بخار کیسا ہے زیب......؟'' دوپہر کے قریب کہیں جا کر اسے فرصت ملی تو وہ زیب علی حسن کے پاس آئی تھی۔ جواب میں وہ دھیرے سے پلکیں موندتے ہوئے بولا۔

''اب ٹھیک ہے۔''

''کیا خاک ٹھیک ہے، صبح سے ایک بار بھی آپ نے مجھ پر کوئی چوٹ نہیں کی، کوئی ایک دل دکھانے والا فقرہ بھی نہیں کہا، پھر سب ٹھیک کیسے ہوا؟''

اس کے مختصر جواب پر وہ فوراً بولی تھی، جواب میں زوہیب نے قدرے چونک کر حیرانی سے اس کی طرف دیکھا۔

''اب ایسے گھور گھور کر میری طرف کیا دیکھ رہے ہیں، ٹھیک ہی تو کہہ رہی ہوں۔''

کس قدر بااعتماد لہجہ تھا اس کا، وہ حیران نہ ہوتا تو اور کیا کرتا۔

''کتنا منع کیا تھا رات آپ کو باہر صحن میں نہ سوئیں، پر نہیں جی، آپ پر تو برا بننے کا بھوت سوار ہے۔ اب دیکھ لیا ناں نتیجہ، کتنا تیز بخار چڑھ آیا ہے آپ کو......''

''شٹ اپ،، میرے ساتھ زیادہ فری ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔'' اس کے پٹر پٹر بولنے پر شدید خائف ہوتے ہوئے اس نے ڈانٹا تھا۔ جب وہ مسکرا کر بولی۔

''اب ان خوش فہمیوں کے گرداب سے باہر نکل آئیں زوہیب صاحب، لڑکیاں کوئی ڈال پر پکا آم نہیں ہوتیں جو خود بخود ٹوٹ کر آپ کی جھولی میں گرتی رہیں۔ ویسے بھی، آپ میں ایسا کچھ نہیں ہے۔ کہ آپ کے ساتھ خوامخواہ فری ہوا جائے، اوکے۔''

زوہیب نے آج تک ایسی بااعتماد عجیب لڑکی نہیں دیکھی تھی، تب ہی رخ پھیر کر پہلو بدل گیا تو وہ پھر بول اٹھی۔

''دوپہر میں آپ کے لئے دال چاول بنائے ہیں میں نے، وہ کھالیں، پھر دوا لے لیجئے گا۔''

اس بار اس کا لہجہ قدرے سنجیدہ تھا۔ عین اسی پل اس کی چارپائی کے ساتھ بندھے جھولے میں پڑی اس کی چھوٹی سی بیٹی جاگ گئی اور اس نے جاگتے ہی زور زور سے رونا شروع کر دیا تو نور لپک کر اس کی طرف بڑھی۔

''تم رہنے دو، اپنی بیٹی کو میں خود سنبھال سکتا ہوں، میں اسے تمہارا عادی بنانا نہیں چاہتا۔''

اس بار نورالعین کے دل پر سچ مچ چوٹ لگی تھی۔ مگر وہ کسی بھی قسم کا گلہ کئے بغیر خاموشی سے کچن میں پلٹ آئی۔ اب زوہیب علی حسن کے لیے، اپنی بیٹی کو چپ کروانا امتحان ہو گیا۔ ہر ہر طریقہ کر دیکھا، مگر وہ جیسے چپ ہونے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔ تب نہایت بے بس ہو کر اسے نورالعین کو آواز دینی پڑی تھی۔

''نور...... پلیز اس مصیبت کو سنبھالو، مجھ سے چپ نہیں ہو رہی ہے۔''

وہ جو کچن میں اس کے لیے دال چاول نکال رہی تھی، مسکراتی ہوئی کمرے میں آئی اور زوہیب کے ہاتھوں سے بچی کو لے لیا۔ کتنی عجیب بات تھی کہ بچی اس کے پاس آتے ہی فوراً چپ ہو گئی تھی۔

''دنیا میں محبت سب سے زیادہ طاقت ور ہتھیار ہے زیب صاحب، یہ ہتھیار ہے جو بد سے بدترین دشمن کو بھی زیر کر دے، مگر افسوس آپ اس ہتھیار سے خالی ہیں۔''

آج پہلی بار وہ لڑکی پرت در پرت اس پر کھل رہی تھی۔ اور وہ مبہوت سا اسے دیکھے جا رہا تھا۔ دن جیسے تیسے کر کے ڈھل گیا تھا۔ رات میں اس کے بخار کی شدت بھی کم ہو گئی تھی۔ مگر پھر بھی وہ رات بھر وقفے وقفے سے اٹھ کر اپنا سرد ہاتھ اس کی پیشانی پر رکھتے ہوئے اس کے بخار کی حرارت چیک کرتی رہی تھی۔ رات ساڑھے بارہ بجے کے قریب کسی مہربان مسیحا کی طرح اس نے پوری ذمے داری کے ساتھ اسے دوا کھلائی تھی، پھر کمبل اچھی طرح اس کے گرد لپیٹ کر، واپس پلٹ گئی تھی۔

عورت کا یہ مہربان روپ زوہیب علی حسن نے پہلی بار دیکھا تھا، تب ہی وہ ساری رات جاگ کر اس کے متعلق سوچتا رہا۔

اگلی صبح کا سورج چڑھا تو اس کی طبیعت کافی بہتر تھی، تب ہی وہ بابا کے مسجد جانے کے بعد، خود بھی کام پر جانے کے لیے بستر سے نکل آیا، باہر صحن میں ہی وہ جائے نماز پر بیٹھی انہماک کے ساتھ خدا سے دعا کر رہی تھی۔

''اے اللہ! تو اپنے بندوں پر نہایت مہربان ہے، تجھے تیرے پیارے حبیب محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی پاک ذات کا واسطہ، ہم سب کو اپنی پناہ و امان میں رکھ، اس گھر کے سب مکینوں کے دلوں میں اپنی محبت رکھ، اس گھر کے سب مکینوں کے دلوں میں اپنی محبت ڈال دے مولا، ہمیں سیدھے راستے پر گامزن فرما، ہم پر اپنا رحم کر، میری بہن کی عزت و جان کی حفاظت فرمانا، اے اللہ اپنے رحم کے صدقے، زوہیب کو صحت دے دے، اسے بہتر روزگار عطا فرما، اس ملک پر اپنا رحم فرما، ہم سب کو ہدایت بخش دے مولا، ہمارے ایمان و مکان کی حفاظت فرما۔''

اس کی لرزتی پلکیں بند تھیں اور آنسو تواتر سے گالوں پر بہہ رہے تھے۔ کمرے کی دہلیز پر کھڑا زوہیب علی حسن، ایک ٹرانس کی کیفیت میں اس پیاری سی لڑکی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ جو اس کی کچھ نہ ہوتے ہوئے بھی سب کچھ محسوس ہو رہی تھی۔ دمکتی گوری رنگت پر کھڑی ستواں ناک، گلاب کی پنکھڑیوں سے مشابہ ترشے ہوئے لب، موٹی موٹی غلافی آنکھیں، دمکتی ہوئی پیشانی، وہ واقعی اس قابل تھی کہ اس سے ٹوٹ کر پیار کیا جاتا۔

''ارے آپ، آپ اتنی صبح کو کہاں جا رہے ہیں۔''

وہ گم صم کھڑا تھا جب نور العین جائے نماز سمیٹ کر سیدھی اس کی طرف چلی آئی، جواب میں وہ جیسے اس کی ذات کے سحر سے باہر نکلتے ہوئے نظریں جھکا کر بولا۔

''کام پر جا رہا ہوں، پہلے ہی دو دن کا حرج ہو گیا ہے۔''

''لیکن...... آپ کی طبیعت ابھی مکمل طور پر ٹھیک نہیں ہوئی ہے۔''

''تو کیا ہوا، بہت سخت جان ہے میری۔ اتنی جلدی مرنے والا نہیں ہوں میں، ویسے بھی یہ امیروں کے چونچلے ہیں، غریب کو تو ہر حال میں بس کام چاہئے۔'' قدرے سرد لہجے میں کہنے کے ساتھ ہی وہ دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ تو نور العین افسوس سے اس کی طرف دیکھتی رہ گئی۔

اس روز عصر کے بعد وہ بابا کے سر میں تیل ڈال کر ہلکی ہلکی مالش کر رہی تھی جب اچانک انہوں نے پوچھا۔

''بیٹی، تم نے آج تک اپنے گھر والوں کے بارے میں تفصیل سے کچھ نہیں بتایا۔ کون کون ہے تمہارے گھر میں......؟'' یوں ہی بات چیت کے لئے انہوں نے پوچھ لیا تھا۔

جواب میں درد کی ایک شدید لہر جیسے نور العین کے پورے وجود میں سرائیت کر گئی، جانے کس ضبط کے عالم میں اس نے انہیں اپنی زندگی کی مکمل روداد سنائی تھی۔ جسے سن کر بابا عبداللہ کی آنکھیں بھی لمحہ بھر کے لئے آنسوؤں سے بھر آئی تھیں۔

''بابا...... اب آپ محسوس نہ کریں تو میں آپ سے کچھ پوچھوں؟'' اپنی آنکھیں رگڑ کر اس نے بابا عبداللہ سے سوال کیا تھا، جواب میں انہوں نے آہستہ سے اپنا سر اثبات میں ہلا دیا۔

''بابا...... مجھے اپنی حقیقی بیٹی سمجھتے ہوئے، سب کچھ سچ سچ بتائیے گا، کیوں کہ میں آپ کی آنکھوں میں دم توڑتی اُداسی دیکھتے دیکھتے تھک گئی ہوں۔ پلیز بتائیے ناں بابا، کون تھی وہ...... جس کی محبت آج تک یاد کی صورت آنسو بن کر آپ کی آنکھوں سے چھلک رہی ہے؟''

نور العین کے غیر متوقع سوال نے ایک لمحے کے لئے انہیں شاکڈ کر ڈالا تھا، تاہم اگلے ہی پل وہ جیسے درد بھری یادوں کے بہاؤ میں بہتے ہی چلے گئے۔

''اس کا نام مریم تھا بیٹی، میرے ہی گاؤں میں رہتی تھی۔ ہم دونوں کے گھر بھی پاس پاس تھے۔ میں ان دنوں بارہویں جماعت میں نیا نیا داخل ہوا تھا۔ جب ایک روز کالج سے سائیکل پر گھر واپس آتے ہوئے اس پر میری نگاہ پڑی تھی، اس زمانے میں لڑکیاں برقع

اوڑھ کر کسی بھی کام کی غرض سے گھر سے باہر نکلا کرتی تھیں۔ میں اپنی دُنیا میں مدہوش رہنے والا نوجوان تھا۔ یار دوستوں کی محفل اور پڑھائی سے ہی فرصت نہیں ملتی تھی کہ ارد گرد توجہ دیتا، یا کسی لڑکی کے بارے میں سوچتا، میرے دوست کئی بار مجھ سے کہہ چکے تھے کہ محلے کی فلاں لڑکی مجھ پر مرتی ہے، مگر میں ان کی بات کو سنجیدگی سے نہ لیتا، نتیجتاً اس روز وہ خود کھل کر میرے سامنے آ گئی۔ ریشمی برقعے میں ملبوس، تانگے کی پچھلی سیٹ پر اکیلی بیٹھی، وہ مجھے اپنے پیچھے سائیکل پر آتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ اچانک میری نگاہ بھی اس کی طرف اُٹھی تو جانے کیا سوچ کر اس نے اپنے چہرے سے نقاب ہٹا دیا۔ سچ کہتا ہوں بیٹی، میں نے اپنی پوری زندگی میں اتنا مکمل حسن کبھی نہیں دیکھا تھا۔ تب ہی میری آنکھیں جیسے اس کے چہرے پر جم کر رہ گئی تھیں۔ مگر میری محویت دیکھ کر اس حسن مجسم نے آہستہ سے مسکراتے ہوئے فوراً نقاب گرا دیا۔ اس دن کے بعد میرا ایک ایک پل جیسے کانٹوں پر بسر ہونے لگا۔ بھوک، پیاس، نیند، آرام سب ختم ہو کر رہ گیا تھا میرے لئے۔ صحت بھی متاثر ہو گئی تھی۔ یار دوست الگ بے رُخی کا گلہ کرنے لگے تھے مگر فی الحال کسی کو اپنی کیفیت بتا کر اپنا مذاق بنانا نہیں چاہتا تھا۔ سو خاموشی سے اندر ہی اندر خود جلتا رہا۔ نتیجتاً اگلے کچھ ہی روز میں مجھے تیز بخار چڑھ آیا۔ تب وہ ہمارے گھر آئی تھی۔ ماں سے اس کی بڑی دوستی تھی لہٰذا کچھ دیر تک ان سے باتیں کرنے کے بعد وہ اندر کمرے میں میرے پاس چلی آئی، میں اس وقت اسی کے تصور میں گم دونوں آنکھوں پر بازو رکھے چت لیٹا ہوا تھا، جب اس کے قدموں کی آہٹ پر فوراً چونک کر آنکھوں سے بازو ہٹاتے ہوئے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

''تم...... تم یہاں......؟'' اسے اپنے گھر میں اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھ کر مجھے اپنی بصارتوں پر یقین نہیں آ رہا تھا جب وہ کھلکھلاتے ہوئے بولی۔

''ہاں میں، یہاں تمہارے گھر کے ساتھ ہی تو رہتی ہوں، پر تمہیں خود سے ہٹ کر کسی اور کی طرف دیکھنے کا ہوش ہو تب ناں......؟ لیکن ایک بات ہے، دیکھو لو میرے ایک ہی جلوے نے تمہیں چاروں شانے چت کر دیا۔''

وہ عام سی لڑکی نہیں تھی بیٹی، بہت عجیب لڑکی تھی وہ، پل میں تولہ، پل میں ماشہ، نہایت حسین، نہایت سمجھ دار، ذہین و فطین اور نہایت چالاک...... مجھے فقط چند ہی روز میں اس نے اتنی چالاکی سے قابو کیا تھا کہ میں اپنے طور پر پھڑ پھڑا بھی نہیں سکا۔

ہمارا گاؤں بھارت کے صوبے راجستھان میں واقع تھا۔ امرت نگر، نہایت خوب صورت اور سرسبز، اس زمانے کی محبتیں بھی کیا محبتیں ہوا کرتی تھیں بیٹی۔ محض ایک معمولی سے جملے پر لڑکیاں شرم سے کٹ کر سرخ ہو جایا کرتی تھیں۔ مجھے بھی مریم سے محبت ہوئی تو زندگی

جیسے گل وگلزار ہو کر رہ گئی۔ اپنے اپنے گھر کی چھت پر بیٹھ کر ہم دونوں روزانہ نہ جانے کون سے دیس نکل جایا کرتے تھے۔ گاؤں کے پاس ہی ایک چھوٹی سی نہر بہتی تھی، جس کے کنارے لگے شیشم اور برگد کے درخت ہماری محبت کی علامت تھے۔ ہم دونوں اپنے اپنے گھر والوں سے چھپ کر گھنٹوں وہاں بیٹھے اور اپنے پیار کی ڈھیروں باتیں کرتے۔

میری طرح وہ بھی تعلیم یافتہ تھی، لہٰذا اپنی ذات کے ساتھ ساتھ ہماری نظر ملک کے سیاسی حالات پر بھی بہت گہری تھی، ان دنوں ملک میں ایک علیحدہ مملکت کے وجود کا شور اُٹھا ہوا تھا۔ یوں تو ہم دونوں ہی خوشحال گھرانوں سے تعلق رکھتے تھے، مگر 1857ء کے بعد ہندوستان میں جو سلوک مسلمانوں کے ساتھ کیا جا رہا تھا، اسے دیکھ کر ہر مسلمان کی صرف ایک ہی خواہش تھی کہ ان کا اپنا بھی ایک علیحدہ ملک ہو جہاں وہ مکمل آزادی کے ساتھ اپنی مرضی کی زندگی بسر کر سکے۔

پاکستان کے قیام کے لئے مریم کی خوشی اور اس کا جوش دیکھنے کے لائق تھا۔ خواتین کے ہر جلسے میں اس کی شرکت لازمی تھی۔ ڈھیروں خواب دیکھے تھے ہم دونوں نے پاکستان کے حوالے سے، پتہ نہیں کون کون سی خواہشیں تھیں ہماری......''

بابا عبداللہ کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر آئی تھیں جب وہ کچھ دیر کے لئے سانس لینے کو رکے پھر دوبارہ سے یادوں کے گرداب میں اُلجھتے ہوئے بولے۔

''ان دنوں قائداعظم اور دیگر رہنماؤں کی کوششوں سے قرارداد پاکستان منظور ہوگئی تھی۔ پورے ہندوستان میں مسلمانوں کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ ہندوؤں کو مسلمانوں کی یہ فتح برداشت نہیں ہو رہی تھی۔ وہ ان پر حکمرانی کے خواب دیکھ رہے تھے لہٰذا انگریزوں کی شہہ پر اپنی ہار کا غم بھلانے کے لئے اُنہوں نے بے گناہ مسلمانوں پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑ دیئے۔ ابا اور چاچا ہر روز کسی نہ کسی کا گھر جلنے کی باتیں کرتے۔ کتنے ہی بے گناہ مسلمان نوجوان محض ہندوؤں کی سازشوں سے بے قصور جیلوں میں قید کئے جاتے رہے، مسلمانوں کی نوجوان بیٹیاں آئے روز اغوا ہونے لگیں، مسلمان ابھی ان حالات سے سنبھلے بھی نہ تھے کہ 14 راگست 1947ء کا روشن سورج پوری آب و تاب کے ساتھ طلوع ہوگیا۔ تب بے حال حلیے میں برستی آنکھوں کے ساتھ صبح ہی صبح وہ ہمارے گھر آئی تھی۔

''عبداللہ! پاکستان ہجرت کرنے کا وقت آ گیا ہے، ہم لوگ اپنا گھر بار چھوڑ کر پاکستان جا رہے ہیں، کیا تم پاکستان نہیں چلو گے......؟''

میرا دل اس وقت کٹ رہا تھا، میں کسی صورت اپنا گھر، اپنا گاؤں چھوڑنے کو تیار نہیں تھا، میرے گھر والے بھی ایسا کوئی ارادہ نہیں رکھتے تھے، مگر مریم کی آنکھوں سے ٹپکتے

آنسوؤں نے میرا دل جیسے کاٹ کر رکھ دیا تھا۔ تب ہی میں نے اس کا سرد ہاتھ اپنے مضبوط ہاتھوں میں دبا کر اسے تسلی دی تھی۔

''گھبراؤ نہیں مریم، بے شک ہم پر کڑا وقت آن پڑا ہے، لیکن ہم بالکل نہیں گھبرائیں گے۔ میں اپنے گھر والوں سے بات کرتا ہوں، ہم اکٹھے ہی پاکستان کے لئے روانہ ہوں گے۔''

اس روز ہم ایک دوسرے کے گلے لگ کر بہت دیر تک روتے رہے تھے۔ وقت رخصت مریم نے میرے ہاتھ پر یہ نیلون کا ٹکا باندھتے ہوئے کہا تھا۔

''میری محبت کی اس نشانی کو جیتے جی کبھی خود سے الگ مت کرنا عبداللہ، جس دن تم نے یہ ٹکڑا اپنی کلائی سے اُتار دیا، اس دن مریم تمہارے لئے مر جائے گی۔''

کوئی جاننا چاہے بھی تو نہیں جان سکتا بیٹی کہ پاکستان کے قیام کے لئے کروڑوں اُجڑے ہوئے دلوں نے کتنا درد سہا تھا۔ پاکستان کی کہانی محض خون سے رقم نہیں ہوئی، بلکہ لاکھوں دلوں کے درد سے تحریر ہوئی ہے۔ کروڑوں دلوں میں چھپی محبتیں، جو چپ چاپ دم توڑ گئیں، اُجڑ گئیں، بچھڑ گئیں، ان کے متعلق تو کوئی سوچتا ہی نہیں۔

میں اپنے گھر والوں کو پاکستان ہجرت پر قائل کر رہا تھا، جب ایک گروہ کی شکل میں بہت سے ہندو ہاتھوں میں نیزے، تلواریں، لاٹھیاں اور خنجر لئے ہمارے گاؤں میں گھس آئے۔ میں بدحواس ہو کر گھر والوں کے ساتھ باہر نکلا تو میری آنکھوں کے سامنے میری مریم کا گھر جل رہا تھا اور اندر خواتین کی چیخ و پکار جاری تھی۔ میں بھاگ کر اپنی مریم اور اس کے گھر والوں کو بچانا چاہتا تھا مگر میرے بڑے بھیا اور دوستوں نے مجھے اس طرف جانے سے روک دیا۔ ہر طرف چیخ و پکار مچی تھی۔ کسی کو کسی عزیز رشتہ دار کی خبر نہیں تھی، سب اپنی اپنی جان بچانے کو بھاگ رہے تھے، جو نہیں بھاگ سکتے تھے، ان کی لاشیں زمین پر بکھری پڑی تھیں، گاؤں کے گلی کوچوں میں خون پانی کی طرح بہہ نکلا تھا، اس وقت میری آنکھوں نے جو مناظر دیکھے تھے، مجھ میں ہمت نہیں کہ میں انہیں بیان کر سکوں، کئی شناسا چہرے، عزیز دوست، محلے دار لاشوں کی صورت راہوں میں رل رہے تھے اور ہم اپنا سب کچھ چھوڑ کر، ان کی لاشوں کے اوپر سے پھلانگتے ہوئے بے سمت بھاگ رہے تھے۔ میں اپنا دل، دماغ اور احساسات کھو چکا تھا۔ میرے دوست اور گھر والے زبردستی مجھے اپنے ساتھ گھسیٹ رہے تھے۔ بھاگتے بھاگتے ہم لوگ جنگل میں جمع ہوگئے تھے۔ وہاں ایک سکھ، اپنی بڑی سی گاڑی کے ساتھ پہنچ گیا، مسلمان خواتین اس سکھ کو دیکھ کر پھر رونا شروع ہوگئیں تو اس نے ہمیں کہا کہ ہم اس سے بدگمان نہ ہوں، وہ ہمیں جان سے مارنے کا ارادہ نہیں رکھتا، اس کے ہمدرد

سلوک پر، اسی کی گاڑی میں سوار ہو کر ہماری مسلم خواتین اور کچھ مرد اس کے ساتھ محفوظ مقام کی طرف روانہ ہو گئے۔ میرے بڑے بھیا اور کچھ دوست پیچھے رہ گئے تھے۔ ہمارے عزیز و اقارب کو لانے کے لئے، مجھے اُنہوں نے زبردستی ماں اور دو بہنوں کا خیال رکھنے کے لئے ان کے ساتھ روانہ کر دیا تھا۔

تقریباً پون گھنٹے سفر کے بعد وہ سکھ ہمیں ایک جیل میں لے گیا۔ اس نے ہم سے وعدہ کیا کہ جیسے ہی پاکستان جانے والی گاڑی امرت نگر سے روانہ ہوئی، وہ خود ہمیں بحفاظت اس گاڑی میں سوار کرا دے گا۔ اس نے وہاں اپنے ماتحتوں کو بھی نصیحت کر دی تھی کہ ہمیں تنگ نہ کیا جائے اور ہمارا پورا پورا خیال رکھا جائے، مگر سکھ صاحب کے وہاں سے جانے کے بعد اس کے ماتحت ہندوؤں کی مسلم دشمنی پھر سے غالب آ گئی اور انہوں نے گندم میں کانچ پیس کر ہمیں کھلانا شروع کر دیا۔ تقریباً ایک ہفتے یہ سلسلہ جاری رہا۔ بہت سی خواتین اور مرد کانچ کھانے سے مر گئے، تب وہ سکھ دوبارہ آیا تو سب نے ہندوؤں کے خلاف اس سے شکایت کی، نتیجتاً اس نے اپنے ماتحت ہندو ملازمین کو ملازمت سے برخاست کرتے ہوئے ہمیں پاکستان جانے والی ٹرین میں بٹھا دیا۔ وہ سفر موت کے سفر سے زیادہ اذیت ناک تھا بیٹی، سب کچھ پیچھے رہ گیا تھا، میرا گھر، میرا گاؤں، میری محبت، میرا بھائی، میرے دوست، عزیز رشتہ دار، سب کچھ...... پھر ابھی ٹرین اگلے اسٹیشن پر رکی ہی تھی کہ ظالم ہندوؤں اور سکھوں کا ایک گروہ، ہماری ٹرین میں چڑھ آیا اور اُنہوں نے نہایت بے دردی کے ساتھ تھکے ماندے نڈھال مسلمانوں کو مولی گاجر کی مانند کاٹنا شروع کر دیا۔ سب کچھ ختم ہو گیا تھا بیٹی، میری ماں، بہنیں، چھوٹا بھائی، سب موت کی بھینٹ چڑھ گئے۔ پاکستان کی سرزمین دیکھنے کی خواہش مند کتنی ہی آنکھیں، اس پاک دھرتی کو دیکھنے سے قبل ہی موت کی گہری نیند سو گئیں۔ پتہ نہیں مجھے قدرت نے کیوں بچا لیا۔ کئی دن بے ہوش رہنے کے بعد میں ہوش میں آیا تو اس پاک وطن کی گود میں تھا۔ جگہ جگہ کیمپ لگے تھے۔ لٹے پٹے بے حال مسلمان پاگلوں کی طرح، اپنے اپنے پیاروں کو ڈھونڈ رہے تھے۔ جسموں کی مانند ہر دل پر درد کے زخم لگے تھے۔ ایسے حالات میں پیکر ہمت و شجاعت قائداعظم خود ایک ایک کیمپ، ایک ایک علاقے میں جا کر مسلمانوں کی ہمت بندھا رہے تھے، ان آنکھوں نے کیا کیا نہیں دیکھا بیٹے، کس کس قیامت کے نظارے نہیں کئے......؟'' بابا عبداللہ جیسے تھک کر خاموش ہو گئے تھے، تب سن بیٹھی نورالعین کی نگاہوں میں اپنی ماں کا مردہ وجود گھوم کر رہ گیا تھا۔

''یہ...... یہ وہی ٹکڑا ہے جو مریم نے آپ کی کلائی پر باندھا تھا؟''

نم پلکیں اٹھا کر کپکپاتے لہجے میں اس نے بابا عبداللہ سے پوچھا تھا، جب انہوں نے

خاموشی سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''آہ...... میں بھی کہوں وہ اتنی صابر کیوں تھیں......؟ بڑے سے بڑے درد کو چپ چاپ کیوں پی جاتی تھیں وہ...... اتنا صبر کیسے تھا ان کے اندر۔''

اس بار وہ اپنے آنسوؤں پر بند نہیں باندھ سکی تھی۔ تب ہی بابا عبداللہ کی حیران نگاہوں کو خود پر مرکوز پا کر بلکتے ہوئے بولی۔

''میرے چہرے کی طرف غور سے دیکھئے بابا، میں ہی اس بدنصیب مریم کی بیٹی ہوں، جو آپ سے بچھڑ کر کبھی سکون سے زندہ نہیں رہ سکی، زندگی بھر، پھر جس نے کبھی خوشی کا منہ نہیں دیکھا، یہ ٹکڑا، میں نے ان کی کلائی پر بندھا دیکھا تھا بابا، زندگی کی آخری سانس تک وہ آپ کی محبت کے سحر میں گرفتار رہی تھیں۔''

اب کے وہ زور زور سے رو رہی تھی۔ جب کہ بابا عبداللہ، جیسے ساکت بیٹھے، اس کے چہرے کی طرف دیکھ رہے تھے۔

''تت...... تم میری مریم کی بیٹی ہو۔''

''ہاں۔'' سرخ ہوئی آنکھیں، بے حساب آنسو لٹا رہی تھیں۔ تبھی جیسے وہ تھک کر بکھر گئے۔

''تو وہ مجھ سے پہلے مر گئی، دیکھ لو بیٹی سرحدوں کی یہ کہانی، کتنے دل کتنے عہد اجاڑ گئی، مگر کچھ بھی حاصل نہ ہو سکا۔ پہلے جو عتاب ہندوؤں اور انگریزوں کے ہاتھوں ہم پر ٹوٹ رہے تھے، آج اپنے اس آزاد وطن میں، اپنے ہی مسلمان بھائیوں کے ہاتھوں ہم پر ہو رہے ہیں، کوئی اس وطن کے لیے دی گئی قربانیوں کا سوچتا ہی نہیں، ہم سب اتنے بے حس کیوں ہو گئے ہیں......؟''

بابا عبداللہ کا لہجہ خاصا ٹوٹ رہا تھا۔ اگلے چند روز بہت خاموشی سے بسر ہوئے تھے۔ ایک عجیب سی چپ ان کے ہونٹوں سے چپک کر رہ گئی تھی، زوہیب بھی کئی روز سے اس بات کو محسوس کر رہا تھا، مگر خود سے نورالعین کو مخاطب کر کے کچھ پوچھنا، اسے اپنی توہین محسوس ہوتی تھی۔ سو وہ بھی خاموش رہا۔

بابا کو اب ہلکا ہلکا بخار رہنے لگا تھا، لہٰذا ان کا زیادہ وقت اب گھر پر ہی بسر ہوتا تھا۔ اس روز بھی موسم کے تیور کچھ خاص ٹھیک نہیں تھے۔ لہٰذا بابا کو کھانا کھلانے کے بعد دوا دے کر، وہ صحن میں تار پر دھو کر پھیلائے کپڑے سمیٹنے کے لیے چلی آئی۔ شام کے سائے اب رات میں ڈھل رہے تھے۔ مگر زوہیب ابھی تک گھر واپس نہیں لوٹا تھا۔ نورالعین کو اس کی فکر ہو رہی تھی، کسی بھی وقت بارش ہو سکتی تھی۔

ابھی وہ ان ہی تفکرات میں گھری ہوئی تھی کہ وہ گھر لوٹ آیا، نور کپڑوں کو تہ لگا رہی تھی، جب اچانک اس کی نگاہ گھر میں داخل ہوتے زوہیب علی حسن سے ہوتی ہوئی اس کے ہاتھوں پر ٹھہر گئی، گو اس نے اپنے ہاتھوں پر رومال لپیٹا ہوا تھا، مگر پھر بھی خون رک نہیں رہا تھا، نور کے ہاتھوں سے کپڑے چھوٹ کر چارپائی پر بکھر گئے تھے۔ قطعی بدحواسی کے عالم میں لپک کر وہ اس کی طرف بڑھی تھی۔

''یہ...... یہ کیا ہوگیا......؟ کسی کے ساتھ جھگڑا ہوا ہے کیا......؟'' از حد پریشانی کے عالم میں اس کے ہاتھ اس نے اپنے ہاتھوں میں تھام کر اس کے رستے ہوئے زخموں کا جائزہ لیا تھا۔

''بہت زیادہ خون بہہ رہا ہے، کسی ڈاکٹر کے پاس کیوں نہیں گئے آپ......؟''

زوہیب نہایت حیرانی سے اپنے زخمی ہاتھوں کو بھول کر اس کے لرزتے ہوئے سرد ہاتھوں کو دیکھ رہا تھا۔ آج سے پہلے بھلا کب کس نے اس کی اتنی پروا کی تھی۔

''چھوڑو مجھے، زیادہ گہرے زخم نہیں ہیں۔ ابھی خون رک جائے گا۔'' اپنے ہاتھ فوراً اس کی کمزور گرفت سے چھڑا کر وہ ہینڈ پمپ کی طرف بڑھ گیا تھا۔

''پلیز بتا تو دیں آخر ہوا کیا ہے۔ کسی سے جھگڑا تو نہیں ہوگیا۔'' وہ بھی متوحش سی اس کے پیچھے ہی لپک گئی تھی۔ تب ہی وہ قدرے تلخی سے بولا۔

''اتنا برا نہیں ہوں میں جتنا تم نے فرض کرلیا ہے، کسی سے کوئی جھگڑا نہیں ہوا میرا، یوں ہی کام کے دوران ذرا سی بے احتیاطی سے یہ زخم لگ گئے۔'' ہاتھ اچھی طرح ٹھنڈے پانی سے دھو کر وہ صحن میں پڑی چارپائی پر آ بیٹھا تھا۔

''کیا پکایا ہے آج...... بہت بھوک لگی ہے۔ دوپہر میں بھی کچھ نہیں کھایا تھا۔''

قمیص کے پلو سے ہاتھ پونچھتے ہوئے اس نے ایک نظر نور العین کے پریشان چہرے پر ڈالی، پھر نیم دراز ہوکر لیٹ گیا۔ نور العین کھانا لانے کے لیے خاموشی سے کچن کی طرف گئی، اور کچھ ہی لمحوں میں کھانے کی ٹرے کے ساتھ برنال لے کر چپ چاپ اس کے قدموں میں نیچے زمین پر آ بیٹھی۔ پھر آہستگی سے اس کا دایاں ہاتھ تھام کر اس پر برنال لگانے لگی۔

''یہ کیا کر رہی ہو تم......؟ میں زخموں کی زیادہ پروا نہیں کیا کرتا۔'' قطعی روڈ لہجے میں کہنے کے ساتھ ہی اس نے اپنا ہاتھ نور العین کی گرفت سے چھڑانے کی کوشش کی تھی، مگر اس نے مضبوطی سے اس کا ہاتھ تھامے رکھا۔

''زخموں سے لاپروائی برتیں تو یہ ناسور بن کر سارے بدن میں پھیل جایا کرتے ہیں زیب۔''

''پروا نہیں۔''

''تمہیں پروا ہے کس کی؟ یہ جس طرح کی زندگی تم جی رہے ہو، میں اس طرح کی زندگی کو زندگی نہیں مانتی۔'' آپ جناب کے تکلف کی دیوار بھی اس نے گرادی تھی۔ مگر زوہیب حسن نے اس بار اس کی طرف نہیں دیکھا، تب ہی وہ اس کے بائیں ہاتھ کو تھام کر برنال لگاتے ہوئے بولی۔

''بہت دنوں سے میں آپ سے کچھ کہنا چاہ رہی تھی مگر پھر سوچا شاید آپ میری بات کو کوئی اہمیت نہ دیں۔''

زوہیب نے اب بھی اس سے کچھ نہیں کہا تھا، بس خاموشی سے اس کی طرف دیکھتا رہا تھا۔

''زیب، محلے والوں کو روز مرہ استعمال کی گھریلو اشیا خریدنے کے سلسلے میں بڑی دشواریوں کا سامنا ہے؟ میں سوچ رہی تھی، آپ ان کی یہ مشکلات حل کردیں۔''

نگاہیں اس کے زخمی ہاتھوں پر جمائے اس نے بالآخر وہ بات کہہ دی تھی، جو پچھلے کئی دنوں سے اسے بے قرار کر رہی تھی۔

''تو کیا کروں میں، سب کے دروازے کھٹکھٹا کر ان سے تھیلے لوں اور روزانہ سب کو ضرورت کی اشیاء لاکر دے دیا کروں۔'' صرف ایک لمحے کے لیے وہ پھر سے تلخ ہوا تھا، تب ہی وہ آہستہ سے مسکراتے ہوئے بولی۔

''میرا یہ مطلب نہیں تھا، اصل میں، میں سوچ رہی تھی کہ اگر آپ یہاں چوک پر ایک چھوٹا سا یوٹیلیٹی اسٹور کھول لیں تو سارے محلے والوں کو سکون آجائے گا۔ انہیں اتنی دور بازار جاکر ساری چیزیں لانے کی ضرورت نہیں رہے گی۔''

''محترمہ یوٹیلیٹی اسٹور خالی خوابوں سے نہیں کھلتے، اس کے لیے پیسوں کی ضرورت ہوتی ہے اور اتنے پیسے فی الحال میرے پاس نہیں ہیں۔'' وہ پھر سے تلخ ہونا نہیں چاہتا تھا مگر ہوگیا تھا، تاہم نور العین اس کے غصے سے خائف نہیں ہوئی، وہ اب بھی اس کے ہاتھ، اپنے ہاتھ میں لئے کپکپاتی نظریں جھکائے ہوئے کہہ رہی تھی۔

''پیسوں کی فکر آپ نہ کریں، میرے پاس دو تین ہزار روپے ہیں، پھر میری یہ سونے کی بالیاں ہیں ناں، یہ کم سے کم دس بارہ ہزار سے کم ہرگز نہیں ہوں گی، اتنے پیسوں سے آپ کا کام چل جائے گا زیب۔''

''بھاڑ میں گیا میرا کام...... میں ایرے غیروں کے احسانوں پر نہیں جیتا، اور یہ دو تین ہزار کہاں سے آئے تمہارے پاس؟'' اس کی توقع کے خلاف وہ شدید مشتعل ہوتے ہوئے

تفتیش پر اتر آیا تھا۔ جب اس نے گلوگیر لہجے میں کہا۔

''میں ایری غیری ضرور ہوں، پر آپ پر کوئی احسان نہیں کر رہی ہوں زیب، میرا یقین کریں، مجھے آپ کی ذات سے کسی قسم کی کوئی غرض نہیں، بس میں آپ کو خوش دیکھنا چاہتی ہوں، آپ کا اپنا کاروبار ہوگا، تو ملازمت کی ذلت نہیں اٹھانا پڑے گی، پھر میں آپ کو قرض دے رہی ہوں، جب آپ کا کاروبار اچھا چل جائے تو آپ مجھے میرے پیسے واپس لوٹا دیجئے گا اور یہ تین ہزار روپے میں نے گھریلو خرچے سے تھوڑا تھوڑا کر کے بچائے ہیں، کچھ محلے والوں کے کپڑے سلائی کرتی ہوں۔'' بولتے بولتے وہ ایک دم سے رو پڑی تھی پھر فوراً ہی اپنی آنکھیں رگڑ کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

''میں نے کبھی آپ سے کچھ نہیں کہا، کوئی فرمائش نہیں کی، بس یہ پہلی اور آخری خواہش ہے میری، پلیز اسے پوری کر دیں، میں آپ کا یہ احسان زندگی بھر یاد رکھوں گی۔''

زوہیب علی حسن کا دماغ اس وقت گھوم رہا تھا۔ ایک وہ عورت تھی جس نے اسے انسان سے حیوان بنا دیا تھا اور ایک یہ عورت تھی جو قدم قدم پر اپنی تحقیر کے باوجود، اسے حیوان سے انسان بنانے پر تلی ہوئی تھی۔ اس رات وہ بہت دیر تلک جاگ کر اس کے بارے میں سوچتا رہا تھا۔ ہر ہر پہلو، ہر ہر زاویے سے وہ بے حد اچھی ثابت ہوئی تھی، مگر اس کے باوجود اس کے آگے گھٹنے ٹیک کر اس دھان پان سی کمزور لڑکی سے ہارنا نہیں چاہتا تھا، پر ہار گیا تھا۔

اگلے بہت سے روز اس نے غور و فکر میں بسر کرنے کے بعد بالآخر اس کے سامنے ہتھیار ڈال دیے۔ کیونکہ اب وہ خود بھی مزدوری کرتے کرتے خاصا اکتا گیا تھا۔ نور العین کی توقع کے عین مطابق ابتدا سے ہی اس کا اسٹور شاندار طریقے سے چل پڑا۔ چونکہ یہ علاقہ مقامی آبادی سے تھوڑا ہٹ کر تھا، لہٰذا یہاں کے لوگوں کو عام روزمرہ کی اشیاء خریدنے کے لیے بہت دور جانا پڑتا تھا، اب جو زوہیب نے وہاں اپنا اسٹور کھولا، تو سب اسی سے اشیاء خریدنے لگے یوں دیکھتے ہی دیکھتے اس کا یہ کاروبار خاصا ترقی کر گیا۔ پچھلے کئی دنوں سے نور العین کا مقام اس کے دل میں بہت بڑھ گیا تھا۔ نہ صرف اس نے حسن سلوک سے اس کی ذمے داریاں بانٹ لی تھیں بلکہ اس کا خیال بھی پہلے سے زیادہ رکھنے لگی تھی۔ اس کی چھوٹی سی بیٹی جو اب پاؤں پاؤں چلنے لگی تھی، اب اس کے وجود کی اتنی عادی ہوگئی تھی کہ اگر ایک پل کے لیے بھی نورا سے دکھائی نہ دیتی تو وہ چلا چلا کر رونا شروع کر دیتی۔ بابا بھی ہر لمحہ اسے دعائیں دیتے ہوئے اپنے ماضی کی بھولی بسری یادیں اور باتیں اسی کے ساتھ شیئر کیا کرتے تھے۔ ایک طرح سے وہ اس گھر کے لیے لازم و ملزوم ہو کر رہ گئی تھی۔

زوہیب کو اسٹور کے لیے پیسے دیتے وقت جب اس نے اپنے کانوں سے بالیاں بھی اتاریں تو اس کی آنکھیں لمحہ بھر کے لیے آنسوؤں سے بھر آئی تھیں کیونکہ یہ بالیاں اس کی ماں کی آخری نشانی تھیں، یہ بالیاں اس کی ماں نے خود اپنے ہاتھوں سے اس کے کانوں میں ڈالی تھیں، اس نے اکثر اپنی ماں کو بتاتے ہوئے سنا تھا کہ تقسیم ہند کے وقت جب ان کے تمام گھر والے آگ کی نذر ہوگئے تو وہ بمشکل اپنے کچھ رشتہ داروں کے ساتھ پاکستان پہنچی تھیں مگر یہ بالیاں انہوں نے کسی بھی صورت میں اپنے کانوں سے الگ نہیں ہونے دیں۔ یہاں تک کہ اپنی شادی پر بھی، وہ یہی بالیاں کانوں میں پہنے، اس کے باپ کے گھر آئی تھیں جو رشتے میں ان کے چچازاد تھے۔

نور العین کو یہ بالیاں بہت عزیز تھیں، مگر اس نے زوہیب کے اچھے مستقبل کے لیے انہیں دان کر دیا۔ زوہیب اب زیادہ کام کی وجہ سے اکثر رات کو دیر سے ہی گھر آتا تھا، اور تب تک وہ جاگ کر اس کا انتظار کرتی، اس روز بھی وہ خاصی دیر سے گھر واپس آیا تو نور العین جاگ کر اس کا راستہ دیکھ رہی تھی۔

''کتنی بار کہا ہے تم سے، رات کو اتنی دیر تک جاگ کر میرا راستہ نہ دیکھا کرو، پھر کیوں نہیں سمجھتی ہو تم۔'' ہر روز کی طرح وہ آج پھر سے اسے تابعدار پا کر جھنجلا گیا تھا۔ جب وہ ڈھٹائی سے مسکراتے ہوئے بولی۔

''تم سے بھی کتنی بار کہا ہے میں نے کہ تمہارا خیال رکھنا مجھے اچھا لگتا ہے، پھر خوامخواہ غصہ کرنے سے فائدہ؟''

''میں اس وقت بحث کرنے کے موڈ میں نہیں ہوں نور......''

''تو نہ کرو...... میں کون سی تمہاری منت کر رہی ہوں، لو آج میرے ہاتھ کی بنی کڑھی کھاؤ، کیا یاد کرو گے تم بھی۔'' یہ خالص زوہیب کا انداز تھا مگر پچھلے کچھ عرصے سے نور العین اسی کے انداز میں اس سے بات کر رہی تھی۔

''زیب...... اک سوال پوچھوں، سچ سچ جواب دو گے۔'' اچانک اس نے دھیمے لہجے میں پوچھا تو پانی کی کلی کرتا زوہیب علی حسن فوراً چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔

''وہ جو تمہاری بیگم تھی...... یمنی کی ماں، کیا سچ مچ تم اس سے بہت پیار کرتے تھے؟''

زوہیب کو اس سے اس سوال کی توقع نہیں تھی۔ تب ہی وہ کچھ پل خاموش رہنے کے بعد سرد آہ بھر کر لقمہ توڑتے ہوئے بولا۔

''نہیں...... مجھے صرف اچھی لگی تھی وہ...... مگر دل میں اپنا یہ مقام بھی اس نے نہیں رہنے دیا۔'' وہ دیکھ سکتا تھا کہ اس کے جواب پر ایک عجیب سا اطمینان نور العین کے چہرے

کو روشن کر گیا تھا۔

''اچھا سنو، تم ماشا اللہ سے صحت مند جوان ہو، پھر نماز کیوں نہیں پڑھتے۔''

''ٹائم نہیں ہے میرے پاس۔''

نور العین اس کے چہرے پر بکھرنے والی بے زاری واضح دیکھ سکتی تھی۔ تب ہی دہل کر بولی۔

''توبہ استغفار..... کیسی بات کر رہے ہیں آپ؟ یہ سب کچھ جو آپ کو حاصل ہے، یہ سب اللہ کا دیا ہوا ہے زیب، ذرا سوچیے خدانخواستہ آج آپ کا ایکسیڈنٹ ہو جائے اور اس میں آپ کی کوئی آنکھ، ناک، کان، بازو و ٹانگ ضائع ہو جائے تو کون ہے جو آپ پر ترس کھا کر یہ سب چیزیں آپ کو دے دے گا۔ اس ملک میں ہزاروں لوگ ایسے ہیں زیب، جو فاقوں سے مر رہے ہیں، جنہیں آرام کے لیے گھر کی چھت بھی میسر نہیں، تو کیا وہ سب آپ کی طرح اللہ کے وجود سے غافل ہو جائیں؟ وہ پیاری ہستی کہ جن کے لیے یہ پوری کائنات بنائی گئی، کیا آپ کو پتہ ہے کہ وہ کئی کئی دن فاقے میں گزارتے اور پیٹ پر پتھر باندھے رکھتے تھے، تاکہ لوگوں کو ان کی بھوک کا علم تک نہ ہو، ہم تو ان کی امت سے ہیں زیب، ہم تو ان کے قدموں کی دھول کے برابر بھی نہیں، پھر یہ شکوے شکایتیں، یہ غصہ کیا ہمیں زیب دیتا ہے؟ اتنے ہی خوددار ہیں آپ تو کیوں کھاتے ہیں اس اللہ کا دیا، جس کا شکر ادا کرنے کا آپ کے پاس ٹائم ہی نہیں ہے، کیوں جی رہے ہیں آپ اس کی دی ہوئی زندگی، اگر آپ اس کی رحمتوں سے آشنا ہی نہیں۔ دنیا کا ہر رشتہ جھوٹا ہے زیب، ہماری محبوب سے محبوب ترین ہستی ہمیں عذاب قبر سے نجات نہیں دلا سکتی، پل صراط کے امتحان سے نہیں گزار سکتی۔ جان کنی کی تکلیف سے نہیں بچا سکتی، اگر ان عذابوں سے کوئی ذات چھٹکارا دلا سکتی ہے تو وہ ذات صرف اللہ کی پاک ذات ہے، اگر روز محشر کسی کی محبت، ہمارے کام آ سکتی ہے تو وہ محبت صرف اللہ کے پیارے رسول محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہے، آپ کچھ سمجھتے کیوں نہیں زیب۔''

''زبردست..... تقریر بہت اچھی کر لیتی ہو تم، تمہیں تو کسی اسکول کالج میں ڈیبیٹر ہونا چاہیے تھا۔''

کھانا کھا کر برتن سمیٹتے ہوئے اس نے نور العین کی باتوں کو ہوا میں اڑایا، تو وہ دکھ سے کٹ کر رہ گئی۔

''مجھے بے حد افسوس ہے کہ میری باتیں آپ کے دل پر اثر نہیں کر سکیں، بے شک اللہ جسے چاہے ہدایت سے نوازتا ہے، اور جس دل پر چاہے گمراہی کی مہر لگا دیتا ہے۔ اگر

آپ خود ہی اپنا بھلا نہیں چاہتے تو کوئی اور آپ کے لیے کیا کر سکتا ہے۔ پھر بھی ہو سکتا ہے زندگی میں آپ کسی چیز کی طلب کریں اور وہ چیز سوائے خدا کی پاک ذات کے اور کوئی آپ کو نہ دے سکتا ہو، تب آپ کو اس پاک ذات کے حضور ضرور گڑگڑانا پڑے گا۔ دیکھ لینا آپ.....''

''چلو دیکھ لیں گے، فی الحال تو تم یہ برتن لے جاؤ، مجھے بہت سخت نیند آ رہی ہے۔''

کہنے کے ساتھ ہی وہ چارپائی پر لیٹ گیا تو نور العین بجھے دل کے ساتھ برتن اٹھا کر کچن کی طرف چلی آئی۔

اس روز وہ کچھ گھریلو اشیا کی خریداری کے سلسلے میں زوہیب کے ساتھ بازار آئی تھی، ارادہ بابا اور زوہیب کے ساتھ ننھی منی کے لیے بھی کچھ سوٹ خریدنے کا تھا لہٰذا پورے دو گھنٹے مختلف دکانوں کی خاک چھاننے کے بعد وہ شدید تھک کر روڈ تک آئے تو نور العین کا پسینے سے برا حال تھا۔ وہ خریداری اتنے سلیقے اور بچت کے ساتھ کرتی تھی کہ زوہیب آج اس کی اس خوبی پر بھی دنگ رہ گیا تھا۔ مگر اتنا سارا ٹائم ویسٹ ہونے پر اس سے قدرے ناراض بھی تھا۔ تب ہی منہ پھلائے ادھر ادھر رکشے کی تلاش میں نگاہیں دوڑانے لگا کہ عین اسی ٹائم گردن سے پسینہ پونچھتی نور العین کی بے ساختہ نگاہ کچھ ہی فاصلے پر جیولر شاپ سے نکلتے دو مردوں پر پڑی اور وہ جیسے وہیں ساکت ہو کر ٹھہر گئی۔ ہاتھ میں پکڑے بیگ اس سے چھوٹ گئے تھے زوہیب نے معاً گردن گھما کر اس کی طرف دیکھا تو وہ خوف سے پیلی پڑ رہی تھی، تاہم اس سے پہلے کہ وہ اس سے کچھ پوچھ کچھ کرتا، وہ اپنا تیزی سے چکراتا سر تھام کر وہیں زمین پر ڈھیر ہوتی چلی گئی۔

زوہیب کے لیے اس وقت اسے سنبھال کر قریبی اسپتال تک لے جانا خاصا دشوار تھا مگر پھر بھی وہ اسے قریبی اسپتال تک لے آیا تھا، جہاں پورے چھ گھنٹے بے ہوش رہنے کے بعد بالآخر وہ ہوش میں واپس آئی تھی۔ زوہیب نہایت پریشانی کے عالم میں اس کی پلکوں کو لرزتے ہوئے دیکھ کر تیزی سے اس کے قریب آیا تھا۔

''کیا ہوا نور..... تم ٹھیک تو ہو.....؟'' اس کے یخ ٹھنڈے ہاتھ اپنے مضبوط ہاتھوں میں دبا کر اس نے پوچھا تھا، جب وہ سہمی سہمی نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے اچانک زوہیب کے کشادہ سینے میں منہ چھپا کر بلک اٹھی۔

''زیب..... زیب وہ لوگ مجھے مار دیں گے، ان..... انہوں نے روزینہ کو بھی مار دیا تھا۔ وہ..... وہ مجھے بھی مار دیں گے، مم..... میں ان کے ساتھ نہیں جاؤں گی، میں کہیں نہیں جاؤں گی۔''

زوہیب حسن کے دل میں اس وقت ایک عجیب سی آگ لگ گئی تھی۔ نورالعین کے وجود کا سلگتا لمس، اس کی دھڑکنیں بے ترتیب کر گیا تھا۔ الجھتی بکھرتی سانسوں کو بمشکل رواں کر کے اس نے اسے خود سے الگ کرنا چاہا تھا۔ جب وہ اور مضبوطی سے اس کی شرٹ کو تھام کر، اپنی گرفت اس کے سینے پر مضبوط کرتے ہوئے بولی۔

''وہ...... وہ لوگ مجھے ڈھونڈتے ہوئے یہاں تک آ پہنچے ہیں۔ وہ مجھے آپ سے، بابا اور یمنی سے سب سے دور کر دیں گے۔ قتل کر دیں گے میرا، اللہ کے لیے مجھے کہیں چھپا لو زیب، پلیز۔''

زوہیب نے اسے اتنا خوف زدہ کبھی نہیں دیکھا تھا۔ تب ہی شاید جیسے ضبط کے تمام بند توڑتے ہوئے اس نے اپنے مضبوط بازو اس کے نازک سے وجود کے گرد حائل کر دیئے تھے۔

''ڈونٹ وری نور، تمہیں کچھ نہیں ہوگا۔ ہم لوگ ہیں ناں، ہم تمہیں کہیں نہیں جانے دیں گے'' کہنے کو اس نے کہہ دیا تھا مگر اندر سے اس کا اپنا دل بھی مطمئن نہیں رہا تھا۔

اس رات اگر وہ پل پل اٹھ کر روتی رہی تو نیند زوہیب حسن کی آنکھوں سے بھی کوسوں دور ہوگئی تھی۔ نورالعین کے گداز وجود کا لمس اس کے پورے وجود میں جیسے ایک عجیب سی آگ دہکا گیا تھا۔ اس کے کپکپاتے گلابی ہونٹ، اس کے اندر کی پیاس کو مزید بڑھا رہے تھے۔ قطعی بے قراری کے عالم میں وہ اپنی چارپائی پر پڑا پہلو بدل رہا تھا جب وہ پھر خوف زدہ ہوتے ہوئے اٹھ بیٹھی۔

حالانکہ بابا نے تمام ماجرا سن کر اسے ڈھیروں تسلی دی تھی۔ بہت پیار کیا تھا، مگر اس کے باوجود اس کے اندر کا خوف نکل نہیں سکا تھا۔ وہ جو گھر کے ساتھ ساتھ تمام اہل محلہ اور بچوں کے دلوں میں بھی اپنا بہت اعلا مقام بنا چکی تھی۔ اس وقت محض معمولی سے کھٹکے کے باعث اپنی چارپائی پر بیٹھی کسی سہمی ہوئی چڑیا کی مانند کپکپا رہی تھی۔ تب وہ قطعی بے بسی کے ساتھ شدید مضطرب ہو کر اس کی طرف بڑھی تھی۔

''مم...... مجھے نیند نہیں آ رہی ہے، وہ...... وہ لوگ کسی بھی وقت یہاں آ جائیں گے۔ مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔'' دونوں بازو گھٹنوں کے گرد لپیٹے بھرائی ہوئی آنکھوں کے ساتھ وہ مدھم لہجے میں بولی، تو زوہیب نے اپنے مضبوط ہاتھ اس کے دونوں شانوں پر دھر دیئے۔

''کیوں لگ رہا ہے ڈر...... میں نے کہا ناں، تم کہیں نہیں جاؤ گی، چلو شاباش...... سو جاؤ اب، میں ہوں نا یہاں۔'' اس کی تسلی پر آنسو پونچھتے ہوئے نورالعین نے اس کی آنکھوں میں دیکھا، پھر سمٹ کر لیٹ گئی۔

''آپ سچ کہہ رہے ہیں ناں۔''

''ہاں۔'' قطعی گمبھیر لہجے میں کہنے لگا۔ اور ساتھ ہی بے ساختگی کے ساتھ اسے سینے سے لگا لیا تھا۔

صبح وہ خاصی دیر سے بے دار ہوا تو آنکھیں جیسے سلگ رہی تھیں۔ اندر کچن میں نورالعین غالباً اسی کے لیے ناشتہ تیار کر رہی تھی۔ تب اچھی طرح منہ ہاتھ دھونے کے بعد وہ وہیں کچن کے قریب چلا آیا، پھر دروازے کو دونوں ہاتھوں سے تھام کر نگاہیں چراتے ہوئے بھاری لہجے میں بولا۔

''میں اپنی رات والی بے خودی کے لیے معذرت خواہ ہوں نور، زندگی میں پہلی بار میرے دل پر میرا اختیار نہیں رہا تھا، ہو سکے تو میری اس خطا کو معاف کر دینا۔''

نورالعین چاہ کر بھی اس کی طرف نہیں دیکھ پا رہی تھی۔ دل تو اس کا بھی چاہ رہا تھا کہ وہ اس سے اپنی بے لوث محبت کا اظہار کر دے، اسے بتا دے کہ کل رات اس کا پور پور چاندنی میں نہا گیا تھا، مگر شرم کے مارے زبان سے ایک حرف تک نہ نکل سکا۔ نتیجتاً وہ کچھ پل اس کے بولنے کا انتظار کر کے پھر تیزی سے واپس پلٹتے ہوئے گھر سے باہر نکل گیا۔

☆......☆......☆

محبت پورے استحقاق کے ساتھ زوہیب علی حسن کے دل میں انگڑائی لے کر بے دار ہو چکی تھی، مگر وہ اس سے دامن بچانے کی کوشش میں آنکھیں چرا رہا تھا۔ پچھلے ایک ہفتے سے اس نے نورالعین کو بے دردی سے نظر انداز کرنا شروع کر دیا تھا۔ رات کو دیر تک گھر سے باہر رہنا اس کا معمول بن گیا تھا۔ اپنے لباس اور خوراک کی طرف سے بھی وہ خاصا لاپروا ہو گیا تھا۔

بابا اور نورالعین چپ چاپ اس کی یہ حرکتیں دیکھ رہے تھے، ۱۴ اگست کی آمد آمد تھی، لہٰذا بابا عبداللہ اپنے چھوٹے سے گھر کو سجانے کے لیے بڑے شوق سے جھنڈیاں خرید کر لائے تھے۔ پھر ان جھنڈیوں کو انہوں نے بڑی لگن سے نورالعین کے ساتھ مل کر گھر کے در و دیوار پر سجایا تھا۔ مگر رات میں زوہیب گھر واپس لوٹا تو اس نے بیرونی دروازے پر لگی تمام جھنڈیاں نوچ ڈالیں۔

''زیب...... یہ کیا کیا آپ نے......؟ ان جھنڈیوں کو نوچ ڈالا......''

نورالعین کو پھر اس کے عمل سے بہت تکلیف پہنچی تھی، مگر زوہیب کو جیسے اب اس کی مطلق کوئی پروا نہیں رہی تھی۔ تب ایک اجنبی نگاہ اس کے سادہ سے چہرے پر ڈال کر تقریباً روڈ لہجے میں بولا۔

''یہ بچوں والے کھیل تماشے مجھے پسند نہیں ہیں۔ ویسے بھی جو ملک ہمیں کچھ نہ دے سکے، اس کی آزادی کا جشن منانے سے کیا حاصل؟''

''واہ...... کیا عمدہ خیالات ہیں آپ کے...... کس قدر ناشکرے ہیں آپ، محض ایک دولت نہیں ملی تو یہ پاک سرزمین آپ کے لیے بے کار ہوگئی؟ کاش کبھی آپ ان غیر ملک مقیم پاکستانیوں کا حال دیکھ سکتے ہیں زیب جو دھن و دولت میں کھیل کر بھی، اپنے وطن کی محض ایک ٹھنڈی لہر کو ترستے ہیں، دیارِ غیر میں وطن کی یاد جنہیں چین سے سونے نہیں دیتی۔ آج اگر ہم مفلس ہیں، تباہی کے دہانے پر کھڑے ہیں تو اس میں اس دھرتی کا کیا قصور زیب......؟ یہ تو کبھی اناج اگانا نہیں بھولی، اس پاک سرزمین پر بہاریں لٹاتے موسم کبھی ہمارا در کھٹکھٹانا نہیں بھولے، آج تک جو غلط ہوا ہے وہ ہم سے ہوا ہے زیب، سارے قصور ہم نے کئے ہیں، ہم نے......'' وہ چلانا نہیں چاہتی تھی، مگر چلا اٹھی تھی، تب ہی بابا کی آنکھ بھی کھل گئی، زوہیب اسے اتنا محبِ وطن دیکھ کر حیران رہ گیا تھا جو اب زمین پر بیٹھی آنسو بہاتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

''کروڑوں قربانیوں سے وجود میں آئے اس پاک وطن نے ہمیں غلامی سے نجات دی، الگ پہچان دی، زندگی کو اپنے ڈھب سے گزرنے کا اختیار دیا۔ مگر جواب میں ہم نے اسے کیا دیا......؟ بدنامی، رسوائی، غربت، بدحالی، ہم نے اس کا حسن تباہ کردیا زیب، ہم نے اس کی جڑیں کھوکھلی کرڈالیں، ہم نے اعتبار مجروح کیا ہے اس کا، سارا قصور ہمارا ہے زیب...... ہم بھٹکے ہیں صراطِ مستقیم سے۔ ہم اس کے اہل ہی نہیں تھے، ہم اس قابل ہی نہیں تھے کہ ہمیں یہ پیارا وطن نصیب ہوتا۔''

بھرائے ہوئے لہجے میں کہتے ہوئے اب کے وہ بلک اٹھی تھی، جب بابا نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر اسے چپ کروایا۔

''بابا...... بابا انہیں بتائیے ناں آپ، کہ ماں چاہے کتنی بھی بدصورت ہو، اپنے بچوں کو کبھی بری نہیں لگتی، لوگ خواہ کچھ کہتے رہیں، پر اپنے بچوں کے لیے وہ گھنی چھاؤں کی مانند ہوتی ہے، آپ سمجھائیے ناں بابا، آپ نے تو قیامِ پاکستان کے مناظر اپنی آنکھوں سے دیکھے ہیں، وہ منظر انہیں سنائیے ناں، بتائیے ناں، انہیں کہ پاکستان کیسے حاصل ہوا......؟ کیسے کروڑوں جانوں کے ساتھ ساتھ، ہزار ہا آنکھوں کے دیپ بجھے کیسے لاکھوں دل برباد ہوئے، انمول محبتوں کی کہانیاں کیسے دلوں میں دفن ہوکر ہمیشہ کے لیے یادگار رہ گئیں، انہیں بتائیے ناں پلیز۔''

زوہیب کو واقعی اب اپنے عمل پر پشیمانی ہورہی تھی۔ نورالعین کی آنکھوں سے بکھرتے

آنسو اسے تکلیف دے رہے تھے۔ تب ہی وہ منظر سے ہٹنے کے لیے واپس پلٹا تو آنسو پونچھتی نورالعین نے سرعت سے اس کی کلائی تھام لی۔

''بہت خوددار بنتے ہیں ناں آپ، تو کیوں نہیں اپنے بل بوتے پر کچھ کرتے، یہ ملک آپ کا اپنا ہے، کیا آپ کا فرض نہیں بنتا کہ اپنے طور پر اس کی بہتری کے لیے سوچیں، دوچار ہی سہی، مگر ایسے کام کریں کہ وطن سے آپ کی محبت کا حق ادا ہوجائے، یہ تنکا تنکا بکھرے پاکستانی، سٹ کر ایک ہوجائیں، تو کیا نہیں ہوسکتا زیب...... اور کچھ نہیں کرسکتے تو کم ازکم اس پاک دھرتی کے سبز ہلالی پرچم کا احترام ہی کرلیں، یہ سوچ کر کہ اس پرچم کی تکمیل میں ہمارے عظیم رہنماؤں کے ساتھ ساتھ خود ہمارے بزرگوں کا خون پانی کی طرح بہا ہے۔ ہمارے لاکھوں شہیدوں نے اپنی جان کی بازی لگا کر اس سبز ہلالی پرچم کا وقار ہمیشہ بلند رکھا ہے۔''

شدتِ کرب سے اس کا گلا رندھ گیا تھا۔ جب زوہیب علی حسن نے آہستہ سے اپنی کلائی اس کی گرفت سے آزاد کرائی پھر زمین پر پڑی جھنڈیاں اٹھا کر چومتے ہوئے آنکھوں سے لگالیں۔

''سوری...... آئندہ خیال رکھوں گا۔''

شرمندہ لہجے میں آہستہ سے کہنے کے بعد وہ اپنے بستر کی طرف بڑھ گیا تو نورالعین سرشاری سے مسکراتے ہوئے بابا سے لپٹ گئی۔

اگلے روز عصر کے وقت جب وہ یمنی کو نہلا کر کپڑے بدلوارہی تھی۔ دروازے پر ہونے والی اجنبی دستک نے ایک لمحے میں اس کے اوسان خطا کر ڈالے۔ پہلو میں دھڑکتا دل بہت زور سے مچلا تھا۔ وہ بھاگ کر کہیں چھپ جانا چاہتی تھی جب اس کا باپ اور بھائی بابا عبداللہ کے ساتھ بلند آواز میں بولتے ہوئے گھر میں داخل ہوگئے۔

''نوری...... بتا انہیں کہ ہم تیرے کون ہیں......؟''

اس کے باپ کی نظر جوں ہی اس پر پڑی وہ حسبِ عادت چلا اٹھے۔ جواب میں شاکڈ کھڑی نورالعین کا سر آپ ہی آپ جھکتا چلا گیا۔

''جیسی ماں ویسی بیٹیاں، تو کیا سمجھتی تھی، ہم کبھی تیرا سراغ نہیں پاسکیں گے۔ ارے تو زمین کی سات تہوں میں بھی چھپ جاتی، تب بھی ہم تجھے باہر نکال لاتے، چپ چاپ شرافت سے ہمارے ساتھ چل، نہیں تو ابھی پولیس آکر ان لوگوں کے ساتھ دو دو ہاتھ کرلے گی۔''

وہ کبھی وہاں سے نہ جاتی، جو اگر اسے ان کی بھلائی مقصود نہ ہوتی، ان کی عزت اور

سلامتی کی پروا نہ ہوتی، محض اپنی جان اور خوشی کے لیے وہ ان لوگوں کو ذلیل کرنا نہیں چاہتی تھی، لہٰذا خاموشی سے سر جھکا کر چلنے کو تیار ہوگئی۔

"مجھے معاف کر دیجئے گا بابا...... میرے نصیب میں شاید، آپ کا اتنا ہی پیار لکھا تھا۔ میں خود غرض نہیں ہوں بابا، میں اس عمر میں اپنی خوشیوں کے لیے آپ کی عزت داؤ پر لگتے ہوئے نہیں دیکھ سکتی۔"

ٹپ ٹپ آنسو ٹوٹ کر اس کے گالوں پر بکھر رہے تھے اور وہ سسکتے ہوئے ان کے ہاتھ چوم رہی تھی کہ جن میں اس لمحے کچھ بھی کہنے کی سکت نہیں رہی تھی۔ اتنے میں محلے کا کوئی بچہ بھاگ کر زوہیب کو بلا لایا تھا۔ وہ جو اس کے گھر کی دہلیز پار کر رہی تھی زخم زخم احساسات کے ساتھ ٹھٹک کر رک گئی۔

نگاہوں سے کچھ ہی فاصلے پر کھڑے زوہیب علی حسن کی آنکھیں شدت ضبط سے سرخ ہو رہی تھیں۔

"تم یہاں سے کہیں نہیں جا سکتیں، سنا تم نے۔" عجیب وحشیانہ انداز میں اس کی کلائی تھام کر اس نے کہا تو نور اپنے غصیلے بھائی کے آگے بڑھنے سے قبل ہی بول اٹھی۔

"یہ گھر میری منزل نہیں تھا زوہیب، میرے وجود سے تمہیں وحشت ہوتی تھی ناں، لو، آج میں تمہارے گھر سے جا رہی ہوں، خود اپنی مرضی سے، اب خوش رہنا تم، اب کوئی تم پر روک ٹوک کرنے والا نہیں ہوگا۔ اور ہاں...... دیکھ لو، میں تمہارے گھر سے خالی ہاتھ جا رہی ہوں، یہاں سے کچھ بھی چرا کر لے جانے کی بجائے میں نے اپنا آپ بھی یہیں چھوڑ دیا ہے۔ بابا اور یمنی کا خیال رکھنا...... پلیز۔"

دکھ کے موسم میں ساتھ نبھانے والی، آج سکھ کے موسم میں اس کا ساتھ چھوڑ کر جا رہی تھی۔ اس سے قبل کہ وہ اس سے مزید کچھ کہتا، اندر دھڑم سے کسی کے گرنے کی آواز آئی اور اس کے ساتھ ہی وہ چلا اٹھی۔

"بابا......"

زوہیب تیزی سے اندر بھاگا تھا جب کہ نور العین کو اس کا باپ اور بھائی زبردستی گھسیٹتے ہوئے اپنی گاڑی تک لے آئے۔ پورے راستے وہ روتی بلکتی رہی تھی مگر کسی پر اس کے آنسوؤں کا اثر نہ ہوا۔ سنگ مرمر سے تعمیر اس کے کشادہ گھر کا دروازہ آیا تو جانے کیوں تمام آنسو جیسے آنکھوں میں ہی جم کر رہ گئے اس کے بھائی نے بڑی بے دردی کے ساتھ اس کا بازو نوچتے ہوئے اسے اپنی ماں کے سامنے لا کر پھینکا تھا۔

"شکر الحمد للہ۔ میں تو پریشان ہو رہی تھی کہ خدا جانے یہ منحوس ملے کہ نہیں، اب اس

حائفہ کی بچی نے تو موت کو گلے لگا کر ہماری عزت کا جنازہ نکال دیا، کم از کم اسے تو بھائی الیاس کے حوالے کر کے کچھ سرخرو ہو جائیں ہم۔"

زہر خند لہجے میں بولتے ہوئے اس کی سوتیلی ماں نے اس کے بال نوچ ڈالے تھے۔ مگر اسے اتنی تکلیف اپنے بالوں کے نچنے سے نہیں ہوئی تھی کہ جتنا درد وہ اپنی بڑی بہن حائفہ کی موت کی خبر سن کر جھیل رہی تھی۔

زندگی موت سے بدتر کیسے ہوتی ہے یہ کوئی نور العین کے دل سے پوچھتا۔ الیاس بھائی جسے اس کی سوتیلی ماں نے نہایت چالاکی اور مکاری سے حائفہ کے بعد اس کے لیے شوہر کی حیثیت سے منتخب کیا تھا۔ اسے ایک نظر دیکھنے پر ہی ابکائی آ گئی تھی۔ مگر وہ کیا کرتی، پنجرے میں قید پنچھی کی مانند پھڑپھڑا سکتی تھی، اور وہ پھڑپھڑا رہی تھی۔

مگر وہاں سب کچھ اتنی جلدی ہوگیا تھا کہ اسے کچھ سوچنے سمجھنے کا موقع بھی نہ مل سکا۔ اس کی سوتیلی ماں کا بھانجا شاہد جو اسے اپنی فریبی محبت کا جھانسہ دے کر گھر سے بھگا لے گیا تھا، اب آتے جاتے خباثت سے مسکراتے ہوئے اسے دیکھ رہا تھا، لمحہ بہ لمحہ موت کی طرف بڑھتی زندگی کی اذیت کیا ہوتی ہے، وہ بخوبی محسوس کر سکتی تھی، اپنی مایوں سے لے کر نکاح تک ایک ایک لمحے میں کوئی ہزار ہزار مرتبہ اس نے خدا سے معجزے کی التجا کی تھی۔ ہر ہر لمحے اس کے دل کو زوہیب علی حسن کی آہٹ کا انتظار رہا تھا، بابا کی شفقت اور یمنی کی محبت رلاتی رہی تھی۔ مگر...... زوہیب علی حسن کا راستہ دیکھتی آنکھیں پتھر کی ہوگئیں، پر وہ نہیں آیا۔

تب اس کے اندر کی نور العین جیسے ٹوٹ کر اندر ہی کہیں بکھر گئی۔ بیٹیاں ماں کا نصیب لے کر پیدا ہوئی ہیں، اس کی ماں بھی محبت کی منزل کو نہیں پا سکی تھیں اور اب یہی درد اس کے دل کو چاٹ رہا تھا۔ جامد خاموشی لبوں پر طاری کئے زندہ لاش کی مانند وہ ساکت بیٹھی تھی، جب اس کا باپ اور بھائی نکاح کا رجسٹر اٹھائے مولوی صاحب کے ساتھ اندر کمرے میں داخل ہوئے تھے نور العین کو وہ اپنی موت کے فرشتے دکھائی دیئے تھے۔ تب ہی قلم ہاتھ میں تھام کر نکاح پیپرز پر اپنا نام لکھنے سے قبل اسے آخری بار اپنے اندر کی نور العین آخری سانس لیتے ہوئے محسوس ہوئی تھی۔ کسی کی سرخ ڈوروں والی سیاہ روشن آنکھوں کا طواف زندگی کا آخری احساس بن کر آنسوؤں کی صورت اس کی آنکھوں سے چھلکا تھا۔

ڈبڈبائی آنکھوں کے آنسو پیتے ہوئے کپکپاتے ہاتھوں میں قلم اور مضبوطی سے تھام کر وہ نکاح پیپرز پر جھکی تھی، جب باہر صحن میں عجیب سا شور بلند ہوگیا۔ یکلخت نور العین کا دل بہت زور سے دھڑکا تھا۔ اس کا باپ اور بھائی بھی تیزی سے لپک کر باہر صحن کی طرف دوڑے تھے، جہاں شلوار کرتا میں ملبوس، زوہیب علی حسن کھڑا باہر ان کے رشتہ داروں سے

جھگڑ رہا تھا۔ ساتھ میں ایک پولیس اہلکار بھی کھڑا تھا۔ نور العین کے باپ اور سوتیلی ماں کے حواس پولیس اہلکار کو دیکھ کر معطل ہوگئے تھے پھر بھی وہ خاصے جارحانہ انداز میں زوہیب کی طرف بڑھے تھے۔

''تم......تمہاری جرأت کیسے ہوئی یہاں قدم رکھنے کی۔

ان کی دھاڑ پر زوہیب علی حسن نے خاصی خفگی سے ان کی طرف دیکھا تھا، پھر قدرے تحمل سے بولا۔

''یہاں آنا میری مجبوری تھی مسٹر، کیونکہ میری وائف اس وقت آپ کے قبضے میں ہے۔''

''بکواس بند کرو اپنی، نور العین میری بیٹی ہے۔''

''ہوگی، مجھے اس سے انکار نہیں ہے، مگر اب وہ میری بیوی ہے، ہم دونوں کی آپس میں ناچاقی سے فائدہ اٹھا کر آپ اس کا دوسرا نکاح نہیں کر سکتے، پھر اگر آپ کو ہمارے رشتے پر شک ہے تو یہ لیجئے یہ نکاح نامہ دیکھ لیں۔''

کرتے کی جیب سے نکاح نامے کی کاپی نکال کر اس نے ان کے حوالے کی تو ان کے ساتھ ساتھ وہاں موجود سب ہی لوگوں کے چہروں کے رنگ فق ہوگئے۔ خاص طور پر نور العین کی سوتیلی ماں کا حال تو دیکھنے والا تھا۔ بری طرح سینہ کوبی کرتے ہوئے وہ نور العین اور اس کی ماں کو کوس رہی تھیں۔ جب کہ اس کا باپ اور بھائی جیسے برف میں لگ کر رہ گئے تھے۔ تب انسپکٹر رؤف نے گرج کر کہا۔

''اس بار میں آپ کو چھوڑ رہا ہوں، لیکن آئندہ اگر آپ نے انہیں پریشان کرنے کی کوشش کی تو تینوں باپ بیٹوں کو اندر کر دوں گا، سمجھے۔''

دروازے کی چوکھٹ میں کھڑی نور العین عروسی لباس میں ملبوس پھٹی پھٹی نگاہوں کے ساتھ صحن میں کھڑے زوہیب حسن اور اس کے ساتھ کھڑے پولیس انسپکٹر کو دیکھ رہی تھی۔ تب ہی وہ اس کے باپ اور دیگر لوگوں پر ایک سرسری سی نگاہ ڈالنے کے بعد نور العین کی طرف بڑھ آیا۔

''چلو نور...... میں تمہیں لینے آیا ہوں۔''

تھکی تھکی سرخ آنکھیں، ہلکی ہلکی بڑھی ہوئی شیو، اور نڈھال سراپا، اس کے رتجگوں کی کہانی بخوبی سنا رہا تھا۔ تب ہی وہ سسک کر اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے زور زور سے رو پڑی۔

''تم نے خود کو مجھ سے الگ کیسے سمجھ لیا، بولو......''

اپنے ہاتھ میں مقید اس کا ہاتھ مضبوطی سے دباتے ہوئے وہ اسے اپنے ساتھ لے کر

اس کے باپ کے سامنے آرکا۔

''میں آپ کو نصیحت کرنے کا حق تو نہیں رکھتا، مگر پھر بھی اتنا ضرور کہوں گا کہ عورت، خواہ کسی روپ میں بھی ہو قابل محبت ہے، بیٹیاں پیدا کرنے سے اس کا وقار گر نہیں جاتا، مگر آپ نے اس نازک پہلو پر کبھی غور نہیں کیا، آپ زندگی بھر نہ کبھی اپنی وفا شعار بیوی کی قدر کر سکے، اور نہ بیٹیوں کی، نتیجتاً آج ایسے کسی رشتے کے دل میں آپ کا کوئی احترام نہیں ہے، سچ پوچھیں تو مجھے آپ پر ترس آرہا ہے، کیونکہ روز قیامت جب آپ اللہ کی عدالت میں کھڑے ہوں گے اور اللہ آپ سے پوچھے گا کہ میں نے تین بیٹیوں کی صورت، تم پر اپنی رحمت نازل کی تمہارے لیے بخشش کا وسیلہ پیدا کیا، تو جواب میں تم نے کیا کیا......؟ میری رحمت سے منہ موڑا، ناشکری کی، اب بتا، تجھے تیرے کس اعمال کے سبب بخشش عطا کروں؟ تب کیا کہیں گے آپ......؟ سوچئے گا ضرور۔'' کہنے کے ساتھ ہی وہ نور العین کو لے کر فوراً وہاں سے نکل آیا۔

نور العین نے اپنے اللہ سے معجزے کی دعا کی تھی اور اس کے اللہ نے اس کی دعا سن لی۔ اس نے اپنے قدرت کے طفیل عین موقع پر زوہیب حسن کو بھیج کر اس کی زندگی کی ناؤ کو ڈوبنے سے بچا لیا پھر سے وہ اپنے من پسند گھر میں واپس لوٹی تو خوشی سے بے حال ہوگئی۔ کتنی ہی بار بابا عبداللہ کے سینے میں منہ چھپا کر رونے کے بعد وہ ننھی یمنی کو بے تابی سے پیار کرتی رہی تھی۔ اگلے ہی روز بابا عبداللہ نے خود چار گواہوں کی موجودگی میں اس کی مکمل رضامندی کے بعد اپنے بیٹے زوہیب علی حسن کے ساتھ اس کا نکاح پڑھا دیا تھا تو پورے محلے میں جیسے جشن کا سماں برپا ہوگیا۔

رات گئے حجلہ عروسی میں زوہیب اس کے پاس آیا تو مارے شرم اور خوشی کے اس سے نگاہیں اٹھانا محال ہو رہا تھا۔ تب ہی وہ بیڈ پر اس کے عین مقابل بیٹھتے ہوئے اس کا حنائی ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام کر گمبھیر لہجے میں بولا۔

''پوچھو گی نہیں کہ یہ سب کیسے ہوگیا......؟''

جواب میں نور العین نے خاموشی سے پلکیں اٹھا کر محض اس کی طرف دیکھا تھا۔

''میں بالکل نہیں جانتا کہ کب کیسے اور کیوں؟ میں تمہارے وجود کا عادی ہوگیا، میں جو بے حس ہو کر ہر لطیف جذبے سے مبرا ہو چکا تھا۔ جانے کیوں ہر پل تمہاری اچھائیوں کے بارے میں سوچنے لگا، اپنے مضبوط خول سے نکل کر تم پر مہربان ہوگیا، میرا یقین کرو نور، اس رات کے بعد میں ایک لمحے کے لیے بھی تمہارے تصور سے پیچھا نہیں چھڑا سکا، جس وقت مجھے یہ پتہ چلا کہ تمہارے گھر والے تمہیں ڈھونڈتے ہوئے بالآخر یہاں تک آ پہنچے ہیں، اس روز

زمین میرے پاؤں تلے سے کھسک گئی تھی۔ کھلی دکان چھوڑ کر معطل حواس کے ساتھ بھاگتے ہوئے میں گھر تک آیا تھا، مگر پھر بھی تمہیں نہ روک سکا، اس روز بابا کو فرسٹ اٹیک ہوا تھا۔ اللہ کے کرم سے ان کی زندگی تو بچ گئی، مگر بے ہوشی کے دوران بھی وہ بار بار محض تمہیں ہی پکارتے رہے تھے، ادھر یمنیٰ نے رو رو کر پورا گھر سر پر اٹھا لیا تھا، میرا اپنا دل جیسے لحہ بہ لحہ کٹ رہا تھا، کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں اور کیسے تمہیں واپس لاؤں...... تب میرے ایک دوست نے میرا حال دیکھ کر اپنی بھرپور مدد کی یقین دہانی کرائی اور مجھ سے تمہارے والد صاحب کی گاڑی کا نمبر پوچھ کر چھان بین کرتے ہوئے بالآخر تمہارے گھر تک پہنچ گیا، مگر وہاں پہنچنے پر پتہ چلا کہ تمہاری شادی ہو رہی ہے، تب مجبوراً دو دلوں کو ملانے کے لیے اس نے اپنے بڑے بھائی کو جو پولیس انسپکٹر ہیں، اس معاملے میں گھسیٹا، پھر انہوں نے نازک حالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے محض تمہارے باپ بھائیوں کو دبانے کے لیے جعلی نکاح نامہ بنوایا اور یوں تم میری دسترس میں آ گئیں۔''

نورالعین اب بھی خاموشی سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی، جبکہ وہ گھونٹ گھونٹ اسے اپنے اندر اتارتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

''تم سچ کہتی تھیں، ایک انسان کے لیے جب دنیا میں سارے در بند ہو جائیں تو اسے اپنا اللہ یاد آتا ہے، میں بھی گمراہ ہو گیا تھا نورالعین، محض چند دنیاوی چیزوں کے نہ حاصل ہونے پر اپنے اللہ کی ذات سے غافل ہو بیٹھا تھا میں لیکن تمہارے کہنے کے عین مطابق جب مجھے بابا کی زندگی اور تمہارا ساتھ درکار تھا تو میں نے نہایت پشیمان ہو کر، اس باری تعالیٰ کے حضور اپنا سر جھکایا تھا۔ گڑگڑا کر اس سے اپنے گناہوں کی معافی مانگنے کے بعد بابا کی زندگی اور تمہارا ساتھ مانگا تھا، اور دیکھ لو اللہ کی پاک ذات نے مجھے مایوس نہیں کیا، آج میرے پاس اس کا دیا سب کچھ ہے......''

خوشی اس کے ایک ایک لفظ سے چھلک رہی تھی۔ تب ہی وہ بے خود ہو کر روتے ہوئے اس کے کشادہ سینے سے لپٹ گئی۔

''میں تم سے بچھڑ کر مر جاتی زیب، میری لاش نکلتی وہاں سے۔''

''اچھا......؟ تب ہی خوشی خوشی سج سنور کر بیٹھ گئی تھیں، وہ تو میں عین وقت پر پہنچ گیا ورنہ تم تو گئی تھیں ہاتھ سے۔''

اب وہ اسے تنگ کر رہا تھا، تب ہی نورالعین نے نم پلکوں سے گھور کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے ہلکا سا مکا اس کے مضبوط شانے پر رسید کر دیا۔ ''گھر سے بھاگنے والی ہر لڑکی کو بابا، عبداللہ اور زوہیب نہیں ملتے اور پھر...... پھر محبت میں بہت طاقت ہوتی ہے زیب، یہ

محبت خواہ کسی انسان سے ہو، وطن سے ہو، یا اللہ کی پاک ذات سے، جنون بن جائے تو کچھ ناممکن نہیں رہتا، کوئی خوف، کوئی ڈر انسان کو اس کے مقصد سے پیچھے نہیں ہٹا سکتا، محبت سے پتھر پگھلائے جا سکتے ہیں زیب، یہ محبت ہی ہے جو ہر ناممکن کو ممکن بنا سکتی ہے، سب کچھ سنوار سکتی ہے، بس ضرورت صرف اس بات کو سمجھنے کی ہے......''

زوہیب کے مضبوط ہاتھوں میں دبے اپنے ہاتھوں کو دیکھتے ہوئے اس نے خاصی سنجیدگی کے ساتھ کہا تھا، جواب میں زوہیب نے اس سے مکمل اتفاق کرتے ہوئے آہستہ سے گردن اثبات میں ہلا کر اپنا سر اس کی گود میں رکھ دیا۔

خوابوں اور خوشبوؤں سے بھری یہ رات اپنے ہزار نقش چھوڑ کر دھیرے دھیرے اختتام کی طرف بڑھ رہی تھی۔ جب نورالعین کے پہلو میں لیٹے زوہیب حسن نے اسے بتایا۔

''پتہ ہے نور کل ۱۴ اگست کا روشن اور مبارک دن ہے، اس بار اللہ ہم اس دن کو خوب جوش و خروش کے ساتھ منائیں گے، پورے گھر کو جھنڈیوں سے سجائیں گے۔ صرف یہی نہیں بلکہ اب ہم اپنی مدد آپ کے تحت چھوٹی سطح پر اپنے سے کمزور لوگوں کے چھوٹے چھوٹے مسائل بھی حل کریں گے فارغ وقت میں، میں بچوں کو مفت تعلیم دیا کروں گا اور تم محلے کی بچیوں کو سلائی کڑھائی اور کھانا پکانا سکھاؤ گی، تم دیکھنا تھوڑے ہی عرصے میں غربت یہاں سے منہ چھپا کر بھاگ جائے گی۔ دیر سے ہی سہی مگر یہ بات میری سمجھ میں آ چکی ہے نور کہ تعلیم حاصل کرنے کا مقصد محض کرسی پر بیٹھ کر اندھی دولت کے خواب دیکھنا نہیں ہے بلکہ ایک تعلیم یافتہ شخص حقیقت میں وہی ہے جس کی ذات سے دوسروں کو فائدہ پہنچے۔ جو اپنی بجائے دوسروں کی بھلائی کے لیے کام کرے۔ تاکہ مر جانے کے بعد بھی وہ مدتوں لوگوں کے دلوں میں حسین یاد بن کر زندہ رہے، جیسے ہمارے قائد...... قائداعظم محمد علی جناح، ہے ناں۔''

''ہاں...... صبح ہونے والی ہے، آؤ ہم دونوں باوضو ہو کر اس پاک سرزمین کی سربلندی اور خوشحالی کے لیے اپنے پاک اللہ کے حضور شکرانے کے نوافل ادا کرتے ہوئے اس کا لاکھ لاکھ شکر ادا کریں۔''

نورالعین ایک بدلے ہوئے زوہیب کو اپنا ہم سفر پا کر اللہ کی پاک ذات کا شکر ادا کرتے نہ تھک رہی تھی۔ منہ دکھائی میں زوہیب نے اسے سونے کی پائلوں کے ساتھ وہی بالیاں واپس کی تھیں جو اس نے اب تک گروی رکھوائی ہوئی تھیں اور جنہیں نورالعین کی ماں مریم بیگم نے خود اپنے ہاتھوں سے اس کے کانوں میں ڈالا تھا۔

صبح کا نیا سورج طلوع ہوتے ہی وہ دونوں بڑے مسرور انداز میں نماز فجر کی ادائیگی کے بعد خوشی خوشی بابا عبداللہ کی طرف آئے تھے تاکہ انہیں ۱۴ اگست کی مبارکباد دے سکیں، مگر

پاکستان کی کہانی کا ایک اور باب ہمیشہ کے لیے بند ہوگیا تھا، رات کے نہ جانے کس پہر وہ خود اپنے آپ سے تھک کر، چپ چاپ سفرآخرت پر روانہ ہوگئے تھے نورالعین اور زوہیب دونوں شاکڈ نگاہوں سے ان کی ہمیشہ کے لیے بند آنکھوں کی طرف دیکھ رہے تھے۔ پرنور چہرے پر حد درجہ سکون بکھرا صاف دکھائی دے رہا تھا۔ تب نورالعین کی نگاہ اچانک ان کے دائیں ہاتھ کی بند مٹھی پر پڑی تھی، کپکپاتے، لرزتے ہاتھوں سے بمشکل اپنی سسکیاں روکتے ہوئے اس نے بابا عبداللہ کی بند مٹھی کو کھولا تو ہمیشہ ان کی کلائی پر بندھا رہنے والا کپڑا اچھل کر زمین پر گر پڑا، ان کی مریم نے کہا تھا۔

''عبداللہ، میری محبت کی اس نشانی کو جیتے جی کبھی خود سے الگ مت کرنا، جس دن تم نے یہ ٹکڑا اپنی کلائی سے اتار دیا، اسی دن مریم تمہارے لیے مرجائے گی۔''

لٰہذا مریم کے مرجانے کے بعد بھی انہوں نے اس کے احساس کو مرنے نہیں دیا تھا۔
نورالعین نے آنسوؤں سے لبالب بھری نگاہیں اٹھا کر ایک نظر بابا عبداللہ کے پرنور چہرے کی طرف ڈالی، پھر زمین پر پڑا نائیلون کا وہ ٹکڑا اٹھا کر سینے سے لگاتے ہوئے پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔ بے شک آج بابا عبداللہ نے اپنی محبت سے کیا عہد نبھا دیا تھا۔